

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222974

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۳۳۸/۸-۱۰۰۰ Accession No. ۱۴۹۸۵

Author . گوشتی جان درونی

Title . روحان درونی

This book should be returned on or before the date
last marked below.

نوجوان رخصت کی استان غم

جس میں مشہور من نفسی شاعر اور حکیم حیات ۱۹۳۳ء

جان و ولف کانگ گوئے

نے

شباب کی رومانی کیفیات کی نفسی تصویر پیش کی ہے

مترجمہ ریاض الحسن ایم۔ اے

لٹریچر کی سنڈیکیٹ (نمبر ایلی روڈ) الہ آباد

۱۹۳۳ء

قیمت ۵۰

کتاب
پرنٹنگ

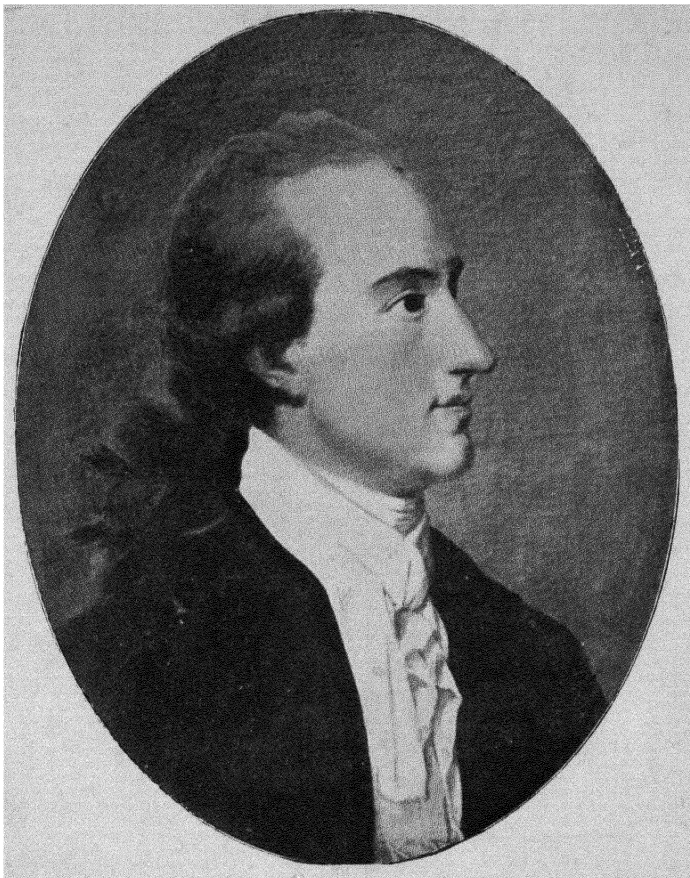
1491A

133 //

U J

جامعہ الہ آباد میں اپنی اول دو سال (۱۹۲۸ء) کی طالب علمانہ زندگی
 کی یاد میں، یہ ترجمہ میں اپنے مہربان و محترم اُستاد پنڈت امر ناتھ جھا
 ایم۔ اے صدر شعبہ انگریزی، یونیورسٹی الہ آباد کے نام سے منسوب
 کرتا ہوں جنکے عالمانہ اور تخیل کو چھیڑنے والے لکچروں نے
 میرے شوق ادب کی کافی نشوونما کی۔

ریاض الحسن



گوئٽے

اہلي عمر کي انتہوسویں منزل میں

ابتدائیہ

جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر گوٹے دینا سے ادب کی ان چند ممتاز مہستیوں میں سے گزرا ہے جنہوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور زمانہ کے بہتے ہوئے تیز و حار سے تمدن انسانی کے بلغ کو پیچھا کر سبز و شاداب کیلہ ہر زمانہ میں یہ کام جتنا عظیم الشان رہا ہے اتنا ہی مشکل، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کو محض اسی کام کی خاطر نمونہ بنائے۔ گوٹے نے یہ نمونہ اپنی زندگی کی شکل میں پیش کیا اور یہی اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس میں عقل و دل کی تمام خصوصیتیں مناسب انداز میں جمع ہو کر ایک ایسا مجنوں مرکب تیار کرتی ہیں جو ”مکمل“ انسانیت کا طرہ امتیاز ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم کو دنیا کی بڑی بڑی ہنسیاں کئی گروہوں میں منقسم نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ گروہ ہے جس نے گیان کی خاطر تن من دھن سب تیاگ دیا اور دیرالزوں میں بیٹھ کر صرف گیان کی تلاش میں مصروف رہا۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو دنیا کی سماجی زندگی میں شریک تو ہوئے مگر انھوں نے دنیا کو محض قاعدہ قانون کا ایک خشک نظام سمجھا اور ہر چیز کو عقل کے پیمانہ سے ناپنے کی کوشش کی گویا دنیا کی تمام چیزیں ایک ہی عالمگیر قانون کے ماتحت ہیں ان کے مذہب میں سونے چاندی اور عشق و محبت کے لئے بس ایک ہی ترازو ہے۔ پہلا گروہ اہل دل کا ہے اور دوسرا اہل عقل کا اور ان دونوں میں جو پیکار جاری ہے وہ دونوں کی کوٹاہ بیٹی کا مبین ثبوت ہے عقل و دل حیات انسانی کے دو مختلف جوہر ہیں مگر متخالف و متضاد نہیں۔ ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے انسانی مشکلات کو حل کرنا ان عظیم الشان مہستیوں کا کام رہا ہے جو غیرانہ حیثیت سے حیات انسانی کے منتشر شیرازہ کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً نمودار ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے گوٹے اپنے عہد کا پیغمبر تھا اور اس کا شمار بھی اسی موخر الذکر گروہ میں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی جو مثال اُس نے خود اپنی زندگی سے دی اُس سے قرون وسطیٰ سے لیکر موجودہ دور تک کی تاریخ بالکل خالی ہے۔ اُس میں تخیل کی رنگینی کے ساتھ عقل، جوش و خروش کے ساتھ سکون، اور عشق کی بیقراری اور دار فکری کے ساتھ بے پروائی اور ریمیدگی کا توازن اس مناسبت کے ساتھ تھا کہ اُس کی روحانی زندگی ہمیشہ خارجی دنیا سے ہم آہنگ رہی۔ اس کا دل عجائبات عالم کے ہرزہ کار زار واربنے کا آرزو مند تھا وہ دنیا سے اعتبار و حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ فلک الافلاک کی سیر کا بھی متمنی تھا۔ نظرت نے اُس کی ہمہ گیر طبیعت میں وہ شوق پیدا کیا تھا کہ وہ ہر اُس چیز سے دلچسپی لیتا جس سے

انسان کا دل متاثر ہو سکتا ہے گو زیادہ سارے نظام فطرت کو سمیٹ کر اپنے دل کی گہرائی میں چھپا لینے کا خواہشمند تھا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانیت کی تمام کمزوریوں کے باوجود انسان کے لئے ایک خود مختار پلین تو اسے دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں پکارا تھا کہ ”یہ شک یہ ایک انسان ہے، اس جسم جنگلی کی ایک وہ بھی تھی۔ یعنی اُس کے سینہ میں دو دروہیں تھیں“ ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شورش انگیز، ہنگامہ خیز روح اور دوسرے حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکون طلب، نظم فرس روح۔“ اسی کو وہ ایک جگہ ٹاؤنٹ کی زبان سے ادا کرتا ہے:۔

”میرے سینہ میں دو دروہیں ہیں اور ان دونوں میں بڑی کشمکش ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور ایک دوسرے کے پنجہ سے آزاد ہونے کی جنگ میں مصروف ہیں۔ ایک نے حسانی لذتوں کے شوق میں دنیاوی کثافتوں پر اپنا بد صورت جال پھیلارکھا ہے اور دوسری اپنی جلی طاقت کے زور سے اڑ کر آسمانوں کی طرف جانا چاہتی ہے جو اسکا پیدائشی اور آباؤی مسکن ہے۔“

ان دو دروہوں کی کشمکش سے جو توازن پیدا ہو گیا تھا وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی انسانیت کا وہ اعلیٰ جوہر ہے جو گھٹے کو دوسری نامور ہستیوں کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز کرتا ہے۔

جان وولف گانگ گوٹے ۷۸ رگست ۱۸۷۹ء کو بوقت دوپہر دریائے ماہن کے کنارے دئے شہر فرینگکوٹ میں

پیدا ہوا۔ اس کا باپ جان کا سپر گوٹے وکیل تھا۔ اطالیہ اور فرانس کے سفر نے اس میں ادب اور فنون لطیفہ کا اچھا خاصہ مذاق پیدا کر دیا تھا۔ سفر کے دو تین سال بعد شاہ چارلس ہفتم نے اُس کو شاہی مشیر کے عہدہ پر مقرر کیا جس سے اس کی عزت لوگوں کی نظروں میں بہت بڑھ گئی اور اُس کا شمار شہر کے بڑے لوگوں میں ہونے لگا۔ فقوے دنوں کے بعد اُس نے حیف مجسٹریٹ کی اور کی سے شادی کی اور تقریباً ایک سال کے بعد جان وولف گانگ گوٹے

پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے باپ سے غور و فکر، سکون و خاموشی، نظام و ترتیب جیسے مردی، حقیقت کو شی کا مادہ ورثہ میں پایا لیکن ماں کی طرف سے اُس کو جو چیز ملی اُس نے اُس کی شاعرانہ زندگی میں چارچاند لگا دی یعنی تخیل و جذبات کی فراوانی، رومانی جوش و خروش کے ساتھ زندگی کے عمدہ اور خوش آئند مناظر کو دیکھنے کی سہشت، ہم اُس کی زندگی کو تین دور میں تقسیم کریں گے اور علیحدہ علیحدہ سب کا حال بیان کریں گے ہم نے پہلا دور اُس کی پیدائش سے لے کر دائمر کی روانگی تک قائم کیا ہے کیونکہ دائمر کے قیام سے اس کے خیالات میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔

گوٹے کی ابتدائی تربیت میں زیادہ حصہ اُس کی ماں کا رہا جو اطالوی زبان کے علاوہ موسیقی اور فن

کافی طور پر واقف تھی۔ گوٹے جب کچھ بڑا ہوا تو باپ نے پڑھنے لکھنے کے لئے بجائے کسی مدرسہ میں بھیجے کہ خود گھر پر کتب کا انتظام کیا اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ یورپ کی قدیم و جدید زبانوں کے ساتھ ساتھ چھ کو سائنس و مذہب، تاریخ و جغرافیہ، فنون لطیفہ، شہسواری و سپہسگاری کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ گوٹے نے لاطینی، یونانی، فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی پڑھی بعد کو عبرانی کا بھی اضافہ ہوا۔ خود جرمن زبان کی مشق مضمون لکھتے لکھتے بڑھی۔ جرمن زبان کی تحصیل اس زمانہ میں باقاعدہ نہیں ہوتی تھی۔ عوام میں جو گیت رائج تھے ان کو اُس نے دلچسپی سے پڑھا۔ مذہبی تعلیم کا دار و مدار زیادہ تر انجیل پڑھنے پڑھانے پر تھا۔ گوٹے نے انجیل پڑھ کر اپنی روحانی زندگی کو اونچی سے اونچی بلندی پر اُچھلانے کی داغ بیل ڈالی، مگر اُس کی تعلیم کا جو اہم جزو عقائد خود اس کا گھر تھا۔ اس کے باپ نے اٹالیہ کے سفر میں بہت سے پرانے پرانے مشہور مصوروں کی تصویروں دیکھی تھیں اور بہت سے عجائبات اور تصویروں کا ایک کثیر ذخیرہ اپنے ساتھ بھی لایا تھا۔ اُن قدیم رومی تمدن کا اثر اتنا تھا کہ اُس نے اپنے مکان کے بڑے کمرہ میں دیواروں پر روما کے مختلف محلوں، مکانوں اور طرحوں کا نقشہ بنوایا تھا اور بہت سی تصویروں بھی ٹانگ رکھی تھیں۔ بچپن میں گوٹے ان تصویروں کو دیکھتا اور ان سے لطف اُٹھاتا۔ ساتھ ہی اُس کے باپ کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا جس میں تاریخ و فلسفہ کے علاوہ لاطینی، اطالوی اور لہائی شعرا کے کلام موجود تھے۔ گوٹے کبھی کبھی ان المایلو کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور ان کتابوں کو پڑھتا جس سے اُس کے دماغ پر شروع ہی سے کلاسیکی اثر جزیر پڑنا لگتا تھا۔ انہیں اثرات میں گوٹے کا بچپن نہایت پر لطف طریقہ سے گذرا۔ فلاس و غربت کے اس ناگوار اور خوار و آبرے سے جس سے بڑے بڑے لوگوں کو بیشتر گزرنا پڑا ہے گوٹے کو مطلق سابقہ نہیں پڑا۔ گویا زندگی کا یہ میدان کیلئے کودنے عیش و آرام کی حالت میں کھل گیا۔ لیکن اُس زمانہ میں اُس کو اکثر شکوک کا سامنا کرنا پڑا۔ شہسواروں پر نکال کے ہولناک زلزلہ سے اس کے ذوق جستجو نے اُس کے دل میں یہ شک پیدا کیا کہ اگر خدا باپ کی طرح شفیع ہے تو اپنے نیک بندوں کو کیوں اس طرح تباہ کرتا ہے؟ اس قسم کے شکوک اُس کو ہمیشہ پریشان کرتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے آگے چل کر خدا اور مذہب کے متعلق اپنی باطنی تسکین کے لئے ایک نئی راہ نکال لی۔

اسی کے تھوڑے دنوں بعد وہ واقعہ پیش آیا جس سے گوٹے کے طالب علمانہ شوق پر کافی اثر پڑا یعنی ہفت سالہ جنگ چھڑنے کے بعد ۱۸۵۱ء میں فرانسیسیوں نے فرینکفرٹ پر قبضہ کر لیا اور کم و بیش تین سال تک اس پر قابض رہے۔ فرانسیسی فوج کا افسر کاؤنٹ تھوریٹک گوٹے کے گھر ممان رہا

کا سپر گونے نے مجبوراً اُس کے لئے اپنے مکان کا ایک حصہ خالی کر دیا اور ظاہر بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ اپنے یہاں اتارا۔ کاؤنٹ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اور اُس نے جب سنا کہ اُس مکان میں ایک تصویر خانہ بھی ہے تو اُس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور ساتھ ہی اُن اصحاب فن سے ملنے کی بھی خواہش کی جو مصوری میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ اُن سے ملکر اُس نے تصویریں بنوانی شروع کیں۔ گوشت ان تصویروں کو دیکھتا اور کاؤنٹ سے اُن کے متعلق پوچھتا۔ کاؤنٹ بھی لڑکے کی ذہانت سے متاثر ہو کر اُس سے محبت کرنے لگا اور فنون لطیفہ کے نکات سمجھاتا جس سے گوشت کو اس فن کا ایسا شوق ہوا کہ تمام مرگ نہ گیا۔

فرانسیسی آئے تو اپنی تہذیب کا ایک بڑا بازو یعنی ایک تھیٹر بھی ساتھ لائے۔ گوشت نے اپنے نانا سے ایک مستقل پاس چال کر لیا اور اپنے باپ کی مرضی کے خلاف تھیٹر دیکھنے جاتا۔ یہاں وہ عمدہ سے عمدہ فرانسیسی ڈرامے دیکھتا اول اول تو اُس کے سمجھ میں بہت کم تا مگر رفتہ رفتہ اُس نے تھیٹر کے ایکٹروں پر ہر داروں اور سپاہیوں سے بات چیت کر کے اتنی استعدادِ بڑھ چالی کہ بعد کو وہ سب کچھ سمجھتا۔ اُس کو زبان سیکھنے کا خاصا ملکہ قدرت نے عطا کیا تھا مگر کتاب و قواعد سے زیادہ وہ بولنے والوں سے زبان سیکھتا ڈرامہ دیکھنے کا شوق اس حد تک بڑھا کہ اُس نے بعد کو فرانس کے مشہور ڈراما نگاروں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ تھیٹر دیکھتے دیکھتے اُس کے دل میں ایک ڈرامہ لکھنے کا شوق ہوا اور لکھ بھی ڈالا اور اپنے ایک ہم عمر دوست کو دکھایا بھی مگر اُس نے ناپسند کیا۔ اس سے گوشت کے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ اب اُس کو ڈراما کے اصول کی فکر ہوئی اور اس غرض سے اُس نے فرانس کے ڈرامہ نگاروں کا بحیثیت صاحبان فن کے مطالعہ کیا اور اُن کے نظریہ وحدت کو خوب دیکھا بھالا۔

۱۷۹۳ء میں شاہ جوسف ولیم کی بحقیقت شہنشاہ جرمنی رسم تخت نشینی فرینکفورٹ میں منائی گئی

جرمنی کے مختلف شہروں سے شاہزادے امیرزادے تماشہ ہیں۔ ماری، دوکاندار غرض رنگ رنگ کے لوگ جلوس دیکھنے آئے۔ دو ہفتہ تک فرینکفورٹ جلوس کی خوشیاں مناتا رہا۔ چیف مجسٹریٹ کا نواسا ہونے کی وجہ سے گوشت کو ہر طرح کی رنگ رلیاں دیکھنے کا موقع ملا اور اس تماشہ میں جیسا کہ اکثر تماشوں کا قاعدہ ہے کہ بہت سے اجنبی دوست بجاتے ہیں گوشت کی بہت سے اجنبیوں سے ملاقات ہوئی اور اُن سے دوستی ہو گئی۔ اس جلوس کا حال اور دوستوں کی لطف کی ملاقاتوں کا ذکر اُس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بہت مزے لے لیکر لکھا ہے۔ انہیں دوستوں میں اسکا ایک ہم سن مسی پائیلیڈس تھا

اسے اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی وقت ایک ہی جگہ کے واقعات اس طرح دکھائے جائیں کہ زمان و مکان و کردار کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ یونانی عموماً اپنے ڈراموں میں ۲۴ گھنٹے کے واقعات دکھاتے تھے۔

ایک لڑکی کو پائیلڈس کے کسی دوست کے مکان پر احباب کا مجمع تھا جس میں گوٹے بھی شریک تھا وہاں ایک صحنہ لڑکی گریٹشن کو دیکھ کر اہل اول گوٹے کے دل میں عشق کا ایسا شعلہ بھڑکا جس کی گرمی تازیت قائم رہی مگر ٹیشن گوٹے سے عمر میں بڑی تھی مگر پہلی ہی ملاقات میں وہ گریٹشن کو دل دے بیٹھا اور اُس کے عشق نے یہاں تک بول بکھار کر گریٹشن کے بغیر اُس کا کہیں جی نہ لگتا۔ اُس کے ساتھ وہ شہر کے باہر باغوں کی سیر کرتا، چاندنی راتوں میں فلکشت کرتا گوٹے کا دل محبت کی آگ سے جل رہا تھا اور جو کچھ بکھل کر نکلتا اُس کو وہ صفحہ کا غر پر بچھا دیتا۔ گریٹشن اسکی عقلیت پسندی اور یوں جوان شاعری تحسین و آفسر میں کرتی وہ گوٹے سے ہر قسم کی آمادی کا تاناکا کرتی مگر گوٹے کو آزادی نہ دیتی۔ غرض تخت نشینی کے میلوں ٹھیلوں کے درمیان یہ راز و نیاز کی مجلسیں اسی طرح گرم رہیں کہ یکایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے گوٹے کو سخت روحانی اذیت ہوئی اور جس کے بعد پھر گریٹشن سے ملاقات کی دوبارہ نوبت نہیں آئی۔

گریٹشن نے اپنے ایک دوست کے لئے گوٹے سے کہا کہ وہ اپنے ناما سے کسی ملازمت کے لئے اسکی سفارش کر دے۔ گوٹے کی سفارش پر وہ شخص نوکر ہو گیا مگر یہ شخص بڑا عیار دار اور چالاک تھا۔ نوکر ہوتے ہی اُس نے جعلی دستاویزات اور سرکاری نوٹ بنا کر شروع کئے اور بہت سے وصیت ناموں میں رد و بدل کیا جب حکام کو اس معاملہ کی خبر ہوئی تو اُس کی باقاعدہ تحقیقات شروع ہوئی۔ تخت نشینی کی رسم ختم ہونے کے دوسرے روز صبح گوٹے کی ماں اُس کے کمرہ میں دوڑی آئی اور کہنے لگی ”گوٹے یہ تم نے کیا کیا۔ تم نے جس کی سفارش کی تھی اُس پر مقدمہ چل رہا ہے اور اس کا رد وائی میں تم بھی شامل ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف تم خراب لوگوں کی صحبت میں پڑ گئے تھے۔ تمہارے ابا جان بہت برہم ہیں۔ یہ سن کر گوٹے کے ہوش اڑ گئے اور پھر گریٹشن پر بھی شبہ جاتا تھا اس لئے کہ اُس کا اور گوٹے کا اس معاملہ میں گہرا تعلق تھا۔ بہر حال تحقیقات ہوئی اور گریٹشن اور پائیلڈس معمولی تنبیہ کے بعد بری کر دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں گریٹشن نے جو بیان دیا اس سے گوٹے کے حساس دل کو سخت صدمہ پہونچا۔ گریٹشن نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں گوٹے کو محض ایک بچہ سمجھتی تھی اور اُس کی ساری حرکتوں کو بچپن کی شرارتوں میں شمار کرتی تھی گوٹے نے جب اپنے متعلق یہ بیان گریٹشن کی زبانی سنا تو اُس کا سارا جوش سر دہو گیا اور گریٹشن کے فراق میں اُسکی ساری آہ و زاری بند ہو گئی۔ ہاں گریٹشن کے عشق کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ گوٹے کو زیست کا مزہ ملنے لگا اس واقعہ سے گوٹے کی طبیعت گونا مل بہ سکون ہو گئی تھی مگر وہ کہہ نہ سکی کہ کبھی ایک دفعہ ضرور اٹھتا۔ اس کے دغیبہ کے لئے اُس نے ایک ترکیب سوچی یعنی ذہن کو عملی طور پر کسی دوسری طرف لگا یا جائے۔ اسی

عرصہ میں اُس کے ایک پڑوسی نے جو جینا کی یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ فلسفہ کی طرف اُس کی توجہ دلائی شروع کی۔ گوئے کو فلسفہ سے دلچسپی ہو گئی اور اُس نے فلسفیوں کی چند تصنیفات کا مطالعہ بھی کیا۔ ارسطو اور افلاطون تو اُس کو بالکل پسند نہ آئے البتہ رواقیہ میں سے دلچسپی ہو گئی مگر فلسفہ پڑھ کر اُس کو خشک فلسفیانہ نظریات سے تکلیف سی ہونے لگی اور اس باب میں وہ اپنے دوست سبب بختین کرتا اور اختلاف کرتا مگر بحث مباحثہ سے اُس کی روحانی تسکین نہ ہوتی۔ وہ فلسفہ کو شاعری اور مذہب سے علاحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتا بلکہ ان تینوں کو ایک ہی کل کا جزو سمجھتا اس لئے اُس کو وہی کتابیں اچھی معلوم ہوتیں جس میں یہ تینوں چیزیں شامل ہوتیں۔ فلسفہ کے الجھاؤ میں پڑ کر اس کی طبیعت غور و فکر کی عادی ضرور ہو گئی اور وہ کبھی تنہا اور کبھی اپنے دوست کے ہمراہ پاس کے جنگلوں میں چلا جاتا اور وہاں بیٹھ کر مناظر قدرت کی دلفریبیوں کو دیکھتا اور اُن پر غور کرتا اور اکثر اُن کی تصویر اُتارنے کی کوشش کرتا۔ گو تصویر عمدہ نہ ہوتی مگر اُس سے اتنا تو ہوا کہ اُس کے مشاہدہ میں ترقی ہو گئی اور وہ ہر چیز کو اس کے اثر اور کل کی حیثیت سے دیکھتا۔ گریٹشن کی جدائی کا غم غلط کرنے کا یہی بہترین طریقہ تھا جس پر آئسٹن علی کید اس طرح سولہ سترہ برس کی عمر میں گوئے نے بہت وسیع پیمانہ کی تعلیم حاصل کر لی۔ وہ یورپ کی بہت سی قدیم و جدید زبانیں جاننے کے علاوہ اُن کے ملکوں کی تاریخ سے بھی واقف ہو گیا۔ اور جرمنی کی سیاسی اور قانونی تاریخ کے تو ذرا ذرا سے جزیرہ پر اسکی نظر تھی۔ سائنس میں گو اُس کی تعلیم معمولی تھی اور باقاعدہ نہ تھی مگر خود اپنی وقت نظر کی وجہ سے اس شعبہ علم میں بھی اُس کو کافی دلچسپی ہو گئی اور اس سلسلہ میں وہ بہت سے تجربات کرتا رہا۔ ان علوم کے علاوہ موسیقی میں اُس نے وہ کمال حاصل کیا کہ اُس زمانہ کے ایک صاحب فن نے اُس کے باپ سے کہا کہ مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے لڑکے کی اتنی خداداد اہلیت کے باوجود اس کو موسیقی کے پیشہ میں بھیجنے کا ارادہ نہیں رکھتے بہر حال گوئے کو ہر نئی چیز سیکھنے کا شوق تھا اور اس شوق کی کیفیت جب تک قائم رہتی وہ کام بھی جاری رہتا۔ اُس کے بعد پھر اُس کا خیال بھی نہ رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تصانیف میں بہت سی چیزیں ادھوری ہیں لیکن علوم کے ساتھ ساتھ وہ کتاب زندگی کے اوراق بھی الٹا راہ جو اسے خشک اور نظری علوم کے مقابلہ میں زیادہ دل پسند اور حقیقت آشنا معلوم ہوتے تھے اتنی کم عمری میں وہ عشق کی ناہموار اور دشوار گزار گھاٹیوں سے بھی کسی حد تک واقف ہو گیا اور اسکی بدولت مختلف قسم کے آدمیوں سے ملنے ملانے اور انکی طبیعتوں کا اندازہ کرنے کا بھی گرا تھ اگیا غرض کہ مختلف نقطہ نظر سے زندگی کا مطالعہ اُسکی سیرت کی تشکیل میں بہت

مساوی ہوا اور اُس کی سمجھ بوجھ میں اس کم عمری ہی میں خاصا اضافہ ہوا۔

باپ کا خیال تھا کہ قابل لڑکے کو دکیل بنائے اور وکالت کی تعلیم کے لئے لائپرگ، وینزرائٹس بون اور وینٹنا بھیجے۔ گوئٹے باپ کے ارادوں اور اپنے تعلیمی سفر کے شہروں کا نام سننا اور خاموش ہو رہا کیونکہ اسکی طبیعت کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ وہ شاعر کا گرازدل لے کر آیا تھا جس میں قضا و قدر کے راز در بننے کی آرزو تھی۔ وہ اس جلوہ گاہ نظر فریب کو شاعری کی عینک سے دیکھتا اور اس میدان کا مردیکر پیٹنگ لایپرگ سے سوتے ہوؤں کو جگانے کی خواہش رکھتا۔ بچپن ہی سے اُس کو شاعری کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اول اول اُس نے آٹھ سال کی عمر میں شعر کہا تھا۔ پھر اُس کی طبیعت میں اس بلا کی روانی تھی کہ اُس کے احباب فرمائش کرتے اور وہ فوراً شعر لکھ دیتا۔ اپنی طبیعت کی افتاد کے متعلق ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے:-

”میری طبیعت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مجھ میں جوش و خروش بہت ہے۔ تم ایک تند مزاج

آدمی کی کیفیت سے واقف ہی ہو گے مگر ایک بات اور بھی ہے یعنی میں اپنی بے عزتی کو جس طرح پی جاتا ہوں کم لوگ ایسا کرتے ہوں گے۔ مجھ میں قاعدہ قانون بنانے کی بھی عادت ہے لیکن جب میں کچھ نہیں کر سکتا تو میں خاموش رہتا ہوں۔ میرے خط کی ابتدا سے تم میری تیسری کمزوری بھی سمجھ گئے ہو گے یعنی میں تم کو اس بے تکلفی سے خط لکھ رہا ہوں جیسے تم میرے پرانے لنگوٹیا یا ربوہ پھر تم مجھ میں سیما بوشی کی کیفیت دیکھتے ہو گے اور یہ بھی دیکھتے ہو گے کہ میں شک سے کتنا بھاگتا ہوں، اس کم عمری میں اُس نے اپنی جو نفسی تصویر کھینچی ہے اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پودا کسی دن بڑھکر پورانا درخت ہو گا۔ سنہ ۱۷۷۱ء میں جب اُس کی عمر چودہ برس کی تھی اُس نے اپنے باپ کے سامنے اپنا کلام بڑی قطعیت کے ۵ صفحات پر لکھ کر پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس طرح کا غیر معمولی دل و دماغ لے کر آیا ہو اُس کا قانون میں کیا جی لگے گا لیکن شاعر بکر رونی کما تا ذرا مشکل تھا اسلئے اُس نے کسی یونیورسٹی میں پروفیسر حاصل کرنے کا خیال دل میں باندھا کیونکہ اُس ملازمت سے انسان اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تعلیم میں بھی مدد دے سکتا ہے۔ اس خیال کو لیکر وہ تاریخ، انطباقات اور قدیم زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا اور گوتنگن کی یونیورسٹی میں جہاں بیٹے اور انٹیکلس ایسے نامور پروفیسران تھے داخلہ کی امیدیں کرنے لگا مگر باپ کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی جو برابر لائپرگ بھیجے پراٹھا رہا۔ بالآخر پادرسٹ دیگے دست بدست دیگے آسکو لائپرگ کا عزم کرنا پڑا اور ستمبر ۱۷۷۵ء میں وہ لائپرگ روانہ ہو گیا گوئٹے لائپرگ میں داخل ہوا تو وہی اپنے شہر کا لباس پہنے ہوئے تھا اور وہیں کی زبان بولتا تھا لائپرگ

کے مقابلہ میں فرینکفورٹ زبان اور وضع قطع کے لحاظ سے دیہات سمجھا جاتا تھا حالانکہ آبادی اور تجارت کے لحاظ سے فرینکفورٹ کمین بڑا تھا۔ لائپزگ کے بائگے ترچھے نو جوانوں نے گوسٹے پلاؤمانے کسے شروع کئے کوئی اُس کے لباس کا مذاق اڑاتا کوئی اُس کی بولی پر بولیاں بولتا مگر اُس نے ان چیزوں کی سطق پر وا نہیں کی۔ بہر حال جب اُس کی طبعیت نے خود کہا تو اپنے چند خواتین دوستوں کے اشارہ سے اُس نے یکبارگی اپنی ساری پوشاک بدل ڈالی اور لائپزگ کا فیشن پرست نو جوان بن گیا اس سرعت انگیز تئیر پر اس کے بعض دوستوں کو بڑی حیرت بھی ہوئی۔

یونیورسٹی میں داخل ہو کر وہ پہلے پروفیسر ہو فرٹا بوسچے سے ملاجو تاریخ اور قانون کے پروفیسر تھے۔ اُن سے ایک روز باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ میرا ارادہ قانون کے بجائے ادب پڑھنے کا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس خیال کی سخت مخالفت کی لیکن آخر کار اُن کی بیوی کے سمجھانے سے وہ قانون کے لکچروں میں شامل ہونے لگا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ فلسفہ و ادب کے بھی لکچروں میں بھی شرکت کرتا۔ گو وہ یونیورسٹی کا باقاعدہ طالب علم ہو گیا تھا مگر اُس کی دل کی لگی کچھ اور ہی کہہ رہی تھی ساؤل اول تو اُسکو اپنے قانون و فلسفہ کے لکچروں میں بڑی دلچسپی رہی مگر بعد کو اُس کی طبعیت اکتا گئی اور منطقیانہ بحثوں سے اسکو تکلیف ہونے لگی۔ منطق کا اصول یہ ہے کہ ہر کل کو جزو میں تقسیم کر کے تب اُس پر بحث کیجاتی ہے اور گوٹے کی طبعیت ہر جزو کو کل کی مناسبت سے دیکھنے کی خوگر ہو چکی تھی اس لئے کائنات و خالق کا نات کے متعلق جو عقیدہ لے کر آیا تھا اُس میں کچھ ترمیم نہ ہو سکی بلکہ اُس کے دل میں یہی خیال آتا کہ میں یہاں کے معلموں کی بہ نسبت زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔

لائپزگ میں کچھ دنوں رہنے کے بعد بہت سے خاندانوں میں اس کی رسائی ہو گئی تھی۔ گوٹے وہاں جاتا اور اسکا وقت کافی لطف کے ساتھ لگتا۔ خرچ کے لئے گھر سے کافی روپیہ آتا اور وہ اعلیٰ تلے خرچ کرتا۔ ایک خط میں لکھتا ہے کہ ”سو ساٹھی میں، رقصوں میں، تھیٹروں میں، دعوئوں اور تقریریں کاہوں میں وقت ہوا کی طرح اڑا چلا جاتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے وقت گزرتا ہے گو خرچ بھی کافی ہوتا ہے خدا ہی جانتا ہے کہ میری جیب کیسے برداشت کرتی ہے۔ بھلی کلوئس خرچ ہوا پھر دوسرا اور تیسرا۔ آنے کا حساب بالکل پائیوں کا ہے۔ بہر حال دوستوں کی بے فکری کی صحبت دل میں اُمگ کا زور اور لطف اٹھانے کی خواہش نے اُس کو گلشن حسن میں گلیں بنا کر پہنچا دیا۔ شباب کی سرمستیوں نے ہاتھ پکڑا اور ذوق نظر نے راستہ دکھایا۔ غرض لائپزگ کی ابتدائی زندگی بڑے ہی لطف سے گزری مگر بھی زیادہ

زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ اس کی حساس طبیعت مغموم رہنے لگی۔ ”یاروں“ کے طعنے برداشت کرتے کرتے وہ کچھ بد دل سا ہو گیا تھا اور تنہائی کی تلاش کرتے لگا تھا اور اکثر اکیلا بیٹھ کر غمگین خیالات میں غرق ہو جاتا۔ اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے کہ ”موتوں سے میں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ میں یہاں بالکل تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس تنہائی نے میرے دل میں چند غمگین خیالات پیدا کر دیے ہیں“ پھر اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے۔

”میری لغز مغز بس یہی ہے۔

کہ میں دنیا سے دور رہوں

اور چشمہ کے کنارے لیٹ کر

اپنے دوستوں اور محبوبوں کا خیال کر دوں“

اس طرح لائپنگ میں اُس کے دن گزرتے رہے۔ جب دوسرا ٹرم شروع ہوا تو واقعات نے اوراق اُٹے اور گوشتے کی طبیعت کا رخ بھی بدلنے لگا۔ جامع شلو سر اُس کا ایک ہموطن دیکھ گیا مگر وہ وکالت ترک کر کے ایک شاہزادہ کا پرائیویٹ سکریٹری ہو گیا تھا اور اسی دوران میں لائپنگ آکر ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا۔ گوشتے برابر اُس سے ملنے جاتا۔ ہوٹل کے مالک شوٹن کوپ کے ایک لڑکی مسمیٰ اینا کی تھیں عرف کیٹشن تھی جس کو گوشتے اینے کے نام سے پکارتا ہے۔ گوشتے شلو سر سے ملنے جاتا تو وہیں کھانا بھی کھاتا اور شوٹن کوپ اور اُس کی بیوی سے باتیں بھی کرتا۔ شوٹن کوپ کی بیوی اُس کی ہموطن تھی راسی سلسلہ سے اینے سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ دل جو فرینک فورٹ میں ایک بانی جو رجفہ کے تیر نظر کا خکار ہو چکا تھا پھر لائپنگ کی آزاد آب و ہوا میں دعوت خزاں کے لئے جگر پاروں کو جمع کرنے میں مصروف ہوا۔ یعنی اینے سے راہ و رسم یہاں تک بڑھی کہ گوشتے کو اُس سے محبت ہو گئی اور شلو سر کی روائی کے بعد بھی شوٹن کوپ کا ہوٹل بدستور گوشتے کا جولا نگاہ بنارہا۔ وہاں اینے کی دنو از صحبت سے اُس کی آتش شوق اور تیز ہوئی جن لوگوں نے اینے کو دیکھا تھا وہ سب اُس کی تعریف میں رطب اللسان تھے اسکے حسن کی رعنائی اُس کے قد و قامت کی دلربائی اور پھر اس پر اُس کی دانائی تو اس قابل تھی کہ اُس کو بت بنا کر دل کے مندر میں پرستش کے لئے رکھ لیا جائے۔ اس کا حسن و جمال اور گوشتے کا والہانہ انداز دیکھ کر نو گوشتے کے دوست بارن کا یہ خیال تھا کہ اینے بس گوشتے کے لئے پیدا ہوئی ہے مگر باوجود اینے کے عشق کا دم بھرنے کے گوشتے اول ہی روز سے جان گیا کہ اینے میری بیوی نہیں بن سکتی۔ گوشتے کی پے رمی کی وجہ سے آخر اینے کی

نسبت ڈاکٹر کاٹنے سے ہو گئی اور کچھ دنوں بعد شادی بھی ہو گئی۔ گوٹے کی بے پروائی کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جیسا کہ اُس کا برابر دستور رہا اپنی معشوقہ کو تصور کی آنکھ سے دیکھتا اس کے عشق کی تباہی میں زیادہ ترخیل کی رنگ آمیزی ہوتی جو اس کو اپنی معشوقہ کے ساتھ دیر پا وابستگی سے لکتی پھر اُس کے ساتھ اسکی تلون مزاجی اُس کو ایک مرکز پر قرار نہ لینے دیتی۔ ایسا واقعہ اُس کی زندگی میں کئی بار پیش آیا کہ وہ اپنی معشوقہ سے محبت اور شفقت کی کے زمانہ میں یکایک بے پروا ہو جاتا اور بے اعتنائی برتتا۔

دلے دیوانہ دارم کہ باد بھر نمی سازد

اُس نے اس زمانہ میں اپنے دوست بہرش کے نام جو خطوط لکھے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی روح کسی عذاب میں مبتلا ہے۔ ساتھ ہی اُس نے اس تلون مزاجی کی تصویر اپنے ایک ڈرامہ موسوم بہ ”عاشق کی تلون مزاجی“ میں کھینچی ہے اور اُس میں ایٹھے سے اپنے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ یہ زمانہ اُس کے لئے سخت روحانی کشمکش کا زمانہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح کسی چیز کی تلاش میں مصروف ہے مگر نہ ملنے کی وجہ سے سخت بیقرار ہے۔

لائپزگ کے زمانہ طالب علمی کے آخری دور میں اُس کی ملاقات ایک شخص مسی فریڈریش اورنر سے ہوئی جو پلاٹی سن برگ کے تصویر خانہ کا انسپکٹر تھا وہ فن مصوری میں درس دیتا تھا گو خود کوئی بڑا مصور نہ تھا مگر اپنے زمانہ میں وہ شاید تصویروں کا سب سے بڑا پرکھنے والا تھا۔ یونانی حسن کی سادگی کی طرف پہلے پہل اُسی نے دینیکلمن کو توجہ دلائی تھی فنون لطیفہ میں سادگی کا قائل تھا اور چونکہ خود سادہ زندگی بسر کرتا تھا اس لئے اُس کی تعلیم کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ اس میں ایک بات اور بڑے کمال کی تھی یعنی وہ اپنے طلباء میں فنون لطیفہ کا سچا شوق پیدا کر دیتا اور اگر کوئی جو بہر قابل مل جاتا تو اُس کی تربیت بڑی محنت سے کرتا۔ اپنے طلباء میں سے اس نے ہوتاہار گوتے کو فوراً تاڑ لیا کہ یہ جو بہر قابل ہے۔ یہ ہوتاہار نے اس کو ہر طرح کی آسانیاں بھی بھجوائیں اور لائپزگ کے بڑے بڑے ماہرین سے اس کی ملاقات کرا دی جس سے گوتے فنون لطیفہ پر پیش کرتا۔ اورنر کی تعلیم کا اس پر بہت اثر پڑا چنانچہ اورنر کو ایک خط میں لکھتا ہے ”میں نے حقیقت اور حسن تک پہنچنے کا جو راستہ دیکھ پایا ہے وہ آپ ہی کی تعلیم کا طفیل ہے۔۔۔ یہ کتنی کھلی مگر ناقابل فہم حقیقت ہے کہ ایک مصور کا تصویر خانہ ایک نوخیز شاعر اور ایک نوخیز فلسفی کی اہمیت بڑھانے کے لئے بہ نسبت کسی فلسفی یا ناقد کے حلقہ درس سے کہیں بہتر ہے“

اس سے کچھ پہلے جرمنی کے مشہور مصنف لیسنگ کی ”لارکون“ شائع ہو چکی تھی لیسنگ نے اس میں

شاعری اور مصوری کا فرق نہایت واضح طور پر بیان کیا تھا اور ساتھ ہی فنون لطیفہ کے اصول بتائے تھے اس کتاب سے گوئے کے خیالات نخلک بہت صاف منظر یعنی غور و فکر کے ساتھ اس میں باریک بینی کی بھی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی دیکھ چکے ہیں کہ لائپزگ کے دوران قیام میں اول اول گوئے قانون وادب کے لکچروں میں شامل ہوتا رہا مگر بعد کو اُس نے قانون چھوڑ دیا البتہ ادب سے اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ پھر اوزرکی مدد سے فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کرتا رہا لیکن ان چیزوں سے اُس کے خیال میں صفائی نہیں آئی تھی۔ اس کے سامنے کھرا کھوٹا رطب یا بس بھی کچھ تھا مگر ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے پکھنڈا مشکل کام تھا لیکن یسنگ نے جب یونانی اثرات سے موثر ہونے کے بعد فرانسیسیوں کی تقلید کے بندوں کو کاٹ کر فنون لطیفہ کی تعریف کی اور بت تراشی، مصوری اور شاعری کی حدیں مقرر کر دیں اور بت تراشی و مصوری کو زمان و مکان سے محدود اور شاعری کو لامحدود قرار دیا تو گوئے کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کو معلوم ہوا کہ اصل علم کا آفتاب اب طلوع ہوا ہے اور اب تک ہم سب فرانسیسیوں کے موضوعات میں جسکا فطرت انسانی سے کوئی تعلق نہیں گرفتار تھے۔ گوئے اب تک فرانسیسیوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا مگر اب اسکی فطری بھینچی اس تاریکی سے نکلنے کی آرزو مند معلوم ہوتی ہے اور وہ کوئی ایسا ٹھکانا تلاش کرتا ہے جو اس کے روحانی سرمایہ میں مدد دے سکے۔ یہیں سے اُس کی روحانی کشمکش کا تھوڑا بہت سبج بدلتا ہے اور یہی کشمکش آگے چل کر اُس کو فنون لطیفہ کی صحیح شاہراہ پر پہنچا دیتی ہے۔

لائپزگ آکر اس کو کتب بینی کا شوق اور بھی بڑھ گیا تھا۔ جرمن زبان میں ادب پر جتنی کتابیں نکلتیں وہ اس کو ضرور پڑھتا ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے شعرا کا کلام بھی پیش نظر رہتا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے ڈاڈ کی کتاب ”ٹیکسپیر کے کلام کا حسن“ کا مطالعہ کیا۔ اس سے ٹیکسپیر کا اور شوق بڑھا اور پھر دانیل ڈیفو کو پڑھا۔ اتنا پڑھنے پر بھی اُس کے ہمہ گیر دماغ کو سیری نہیں ہوتی اور اُس کی طبیعت دوسرے علوم کی بھی طالب ہوئی۔ قانون وہ چھوڑ چکا تھا مگر اب قانون کی طرف پھر راغب ہوا اور قانون کے علاوہ دینیات، فلسفہ اور طب پڑھتا۔ لیکن اتنا پڑھنے کے بعد اگر کھانا نہ ہو تو پڑھنا سیکر ہے۔ لائپزگ کے قیام میں اُس نے کئی قصے، ڈرامے اور نظمیں لکھیں۔ اس دور کے افسانے زیادہ تر عشقیہ ہیں جس میں ایک عاشق اپنے ہجر کی داستان خطوں کے ذریعہ کسی دوست کو سناتا ہے جن میں اندرونی کشمکش کا حال زیادہ نمایاں ہے۔ وہ اپنے کلام کی بنیاد اپنے اندرونی جذبات پر رکھتا ہے مگر خارجی حالات سے بھی آزاد نہیں۔ اندرونی احساسات اور خارجی حالات دونوں پر نظر رکھنے سے عیا

کہ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے اُس کی عادت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی جو تادم مرگ قائم رہی یعنی جس چیز سے اُسے لطف حاصل ہوتا یا تکلیف ہوتی اسکی وہ شعر میں تصویر کھینچ دیتا کیونکہ اس طریقہ سے اپنے دل کے جذبات کی خواہش اظہار کو پورا کر دیتا اور یہ بھی دیکھ لیتا کہ خارجی حالات کی صحت کا اُس نے کتنا تک خیال رکھا ہے۔ آگے چلکر وہ کہتا ہے کہ اس وجہ سے میں نے جو کچھ لکھا ہے اسکو میری داستان زندگی کا ایک ٹکڑا سمجھنا چاہئے۔

ان علمی مشاغل کے درمیان ۱۷۶۹ء میں اُس کی صحت خراب ہونے لگی۔ مزید براں اُس کی طبیعت کی افسردگی نے جولاہنگ کے قیام کے کچھ ہی دنوں بعد شروع ہو گئی تھی اور خراب اثر والا اس زمانہ میں اسکو درد سینہ کا شدید دورہ آٹھا جو ایک دفعہ گھوڑے سے گر جانے سے پیدا ہوا تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ اُس کی صحت کو خراب کرنے والی اور بہت سی چیزیں تھیں مثلاً کھانے کی خرابی سے تو اُس کا معدہ خراب ہو چکا تھا۔ اس پر شراب اور قہوہ کی زیادتیوں نے یہی سہی قوت باضمیر بباد کر دی۔ اس حالت میں کبھی وہ اپنی صحت کی طرف نا اُمید ہو جاتا اور کبھی اُس کو صحت کی پوری اُمید ہوتی۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں اُس نے روسو کے نظریہ فطرت کا مطالعہ کیا۔ اُس کے مطالعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس کی طبیعت میں ایک طرح کی آشفنگی پیدا ہو گئی۔ وہ فطرت سے ہم آغوشی کی خواہش میں یقینا برداشت کرتا۔ ٹھنڈے پانی سے نہاتا۔ تخت ایسی چارپائی پر سوتا اور بدن کو زبردستی تکلیف پہننے کا عادی بناتا۔ اُس کا خیال تھا کہ ان سب باتوں سے انسان بزم فطرت کا ایک رکن بن کر مسرت سے زندگی گزار سکتا ہے۔ کچھ دنوں تک تو اُس کی جوانی کی قوت نے اُس کے خبط کا ساتھ دیا۔ لیکن جب بدن پر شدید مزہیں پڑنے لگیں تو بدن نے بھی جواب دے دیا۔ یعنی ایک روز رات کو اُس کے سینہ کی ایک رگ پھٹ گئی اور منہ سے خون آیا۔ ہفتوں وہ ڈاکٹروں کی نگرانی میں صاحب فراش رہا اور اُس کے دوستوں اور شناساؤں نے اُس کی تیمارداری سے کسی قسم کا دریغ نہیں کیا۔ ہم اس خراب نتیجہ کے لحاظ سے اسکی اس حرکت کو غلط کہہ سکتے ہیں لیکن یہ چیز اس کے ارادہ کی مضبوطی اور عزم کی پائوری کی دلیل بھی ہے اسی اثنا میں اسکی ملاقات ایک جامع علم و فضل شخصیت لانگر سے ہوئی۔ لانگر مذہبیات کے علاوہ

۱۷ جون ۱۷۷۵ء (۱۷۶۲ء) فرانس کا مشہور اہل علم انقلاب فرانس کا بانی اپنی تصنیف "معادہ اجتماعیہ" میں انسان کی تمام تکالیف کا ذمہ دار خود انسان کی خود ساختہ تہذیب کو قرار دیتا ہے اس لئے تہذیب گریزاں ہونے کا مشورہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کنگل کی سادہ زندگی سے انسان کا اخلاق فطرت سے قریب تر ہو کر بہتر بن سکتا ہے۔

یونانی تمدن پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اُس نے گوتے میں اول اہل یونانیات کا شوق بڑھایا اور یونانی مصنفین کی مشہور تعلیقات کی طرف توجہ دلائی رنہ رنہ دولوں میں بخشیں ہوئے لگیں مگر سب سے زیادہ زریح بن صفون نہیب رہتا تھا اُس زمانہ میں عیسائیت کے فرسودہ خیالات میں زبردست تبدیلی ہو رہی تھی۔ مسیح سے علمبرہ خدا کی وحدانیت کا مسئلہ لوگوں میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ قدیم الخیال عیسائیت کو اس سے سخت معرکہ آرائی کرنی پڑی جب یہ مسئلہ ابھر تو اُس کے ساتھ ہزاروں باتیں اور پیدا ہو گئیں مثلاً عقائد میں عقل و جذبات کی کیا حد ہونی چاہئے مسیح کا کیا درجہ ہے اور خدا کا اُن کے ساتھ کیا تعلق ہے غرض عقائد کی اس جنگ سے لوگ کئی فرقوں میں بٹ گئے جو زیادہ ذی فہم اور پیدا مغز تھے وہ عیسائیت کے فرسودہ عقیدہ سے بیزار ہو کر اس سے ثابت ہو گئے۔ لیکن جو ذرا کچھ نرم تھے انھوں نے اپنی راہ الگ نکال لی یعنی وہ عیسائیت سے الگ ہونے کے بجائے اُس کے اندر رہ کر ترمیم کے خواہاں ہوئے۔ لاکر کا شمار مومن خالذ کر گردہ میں تھا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ خدا کے یہاں بندوں کی رسائی براہ راست نہیں ہو سکتی۔ کسی نہ کسی ذریعہ کی ضرورت ہے اور یہ زمین و آسمان، یہ چاند و تارے اُس کے ذرائع ہیں۔ انسان مناظر قدرت کے اس بڑے پردہ کی جلوہ گری پر اگر غور کرے تو اُس کے پیچھے ہستی مقصود اُس کو نظر آتی ہے لاکر کے اس عقیدہ کا یہ مار گوتے پر بڑا اثر پڑا۔ انجیل کو وہ اب تکسینہ نبیوں کے قصوں اور قدرتی زندگی کے ماحول کی خاطر ٹھہرا کر اٹھا لگا۔ اُس کو الہامی کتاب سمجھنے لگا اور خالق کائنات کے متعلق اُس کا یقین پختہ ہوئے لگا۔

الف ۳

ستہم سنہ ۴۷ میں جب اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ مکان واپس آیا راستہ بھر برابر اُس کو خیال لگا رہا کہ میں لائینرنگ سے بغیر کوئی سند لئے جا رہا ہوں اور اکثر اپنی گزشتہ تین سال کی زندگی پر افسوس بھی کرتا تھا پوچھا تو باپ اپنے بیمار لڑکے کی صورت دیکھ کر جو وقت کے ساتھ صحت بھی کھو چکا تھا بہت رنجیدہ ہوا باپ نے فوراً علاج کا معقول انتظام کیا اور اپنی ماں اور بہن کی سخت تیمارداری سے اداس ستہم ۴۹ میں گوتے کو کلی صحت ہو گئی۔

صحت کے بعد اُس نے جب کیٹش کی ٹاکٹر کانے کے ساتھ شادی کا حال سنا تو سنسے ہی اُسے اپنے عشق کا بھولا ہوا افسانہ بھر یاد آ گیا۔ کیٹش کے ساتھ اُس کی بہت سی رنگین صحبتیں گزری تھیں اور اُس کے اثر سے اُس نے اُس کی شان میں بہت سے اشعار بھی کہے تھے۔ اب جو خیال آ یا کہ کیٹش بالکل دوسری دنیا میں جا رہی ہے تو اُس نے کیٹش کو ایک نہایت درد بھر اخطا لکھا جس کے جتنہ جتنہ انتہا سات مند بڑ ذیل ہیں اور جس سے گوتے کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے :-

رات میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے ہزاروں بار پھرتی رہی لیکن میں دیکھتا اور محسوس کرتا رہا کہ یہ چہرہ شاید کسی اجنبی کا ہے۔ اب میں تمہارا خط پڑھ کر جس کو آئے ہوئے کئی مہینے ہوئے تمہاری ایک ایسے شخص سے محبت و رافت کو محسوس کرتا ہوں جو اس کا کسی طرح سزاوار نہ تھا تو مجھے خود اپنے سے شرم آتی ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل میں کتنا انقلاب پیدا ہو گیا ہے یعنی میں اب اس چیز کے ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ سکتا جو کسی زمانہ میں میری خوشیوں کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیتی تھی۔ مجھے معافی کرو۔۔۔ میری بد قسمتی نے میری نیکیوں کو بھی خراب کر دیا ہے۔ میرا جسم تو ضرور تندرست ہو گیا مگر میری روح اب تک بیمار ہے۔ میں بالکل بیکلام اور کاہل ہو گیا ہوں۔۔۔ اور اس بیکاری کی حالت میں میرا خیال بھی اتنا سا کُن ہو گیا ہے کہ آج میں اس صوت کی یاد بھی نہیں کر سکتا جو مجھے کبھی بہت عزیز تھی۔ یہ خواب ہی کا طفیل ہے کہ میرا دل اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے اور اُن خوبصورت چیزوں کی یاد دلا کر جذبات میں اگلا سا شوق پیدا کر دیتا ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تمہاری صورت کی یاد مجھے خواب میں آتی میں تم سے اُسی خواب میں ملا، تمہارے ساتھ رہا لیکن یہ کیسے ممکن ہوا میں اسے نہیں بتا سکتا۔ مختصر یہ کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو خدا کرے کہ یہ تمہاری آئندہ خوشیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔۔۔ میں اس خواب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے تمہاری اور تمہارے شوہر کی خوشیوں کو دیکھنے کا موقع دیا۔۔۔ اگر میرا خواب صحیح ہے تو ہم لوگ پھر ملیں گے لیکن جلدی نہیں۔ اگر انسان قسمت کے مقابلہ میں قدم اٹھا سکتا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ ہماری تمہاری ملاقات کسی آئندہ موقع کے لئے مل جائے۔۔۔ اب میں اس جگہ کو چھوڑ کر جانے والا ہوں تاکہ تم سے دور ہو جاؤں اور لا پتہ لگسکی زندگی کی یاد دلانے والی سوائے بیقراری کرنے والے خوابوں کے اور کوئی چیز نہ ہو۔ نہ تو کوئی دوست ہو جو آکر تمہارا حال بتائے اور نہ کوئی خط ہو جو زبان حال سے تمہاری کیفیت بیان کرے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کچھ کام نہ آئیں گی۔ یہ کام صبر، وقت اور فاصلہ ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔۔۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ خدا ارجمند کوئی خط نہ لکھو۔ ہاں اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو کسی دوست کے ذریعہ سے کہنا دو بس اسے یہ سمجھ کر پورا کر دو کہ یہ ایک بد بخت کی آزد ہے۔۔۔ میں تمہاری تحریر اب نہیں دیکھنا چاہتا اور نہ تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں کیونکہ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ میں اپنے خواب کی کیفیت میں مشغول ہوں۔ ایک خط میں اور بھی جو لگا اور ضرر بھی بھول گا اور اس طرح گویا اپنے ایک بار سے سبکدوش ہو گا۔ ادب قیہ کے لئے تم سے معافی کا خواہش کرتا ہوں

لے غالب کے مشہور قطعہ سے موازنہ کیجئے۔

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
ہے درو دیوار سا کچھ بننا یا چاہئے۔ کوئی ہمساہ نہ ہو اور ہاں کیا کوئی نہ ہو
پڑیے گر بہار تو کوئی نہ ہو تیار دار نہ ہو اور اگر مر جائیے تو نوہ خواں کوئی نہ ہو

اپنے دوسرے خط میں جس کا اوپر ذکر کر چکا ہے لکھتا ہے: ”سب سے زیادہ لائق محبت وہ دل ہے جو محبت جلد محبت کرنے لگتا ہے لیکن جو آسانی سے محبت کرتا ہے وہ آسانی سے بھول بھی جاتا ہے“ جس زمانہ میں اُس کی صحت خراب تھی اُس کی ماں کی ایک دائم المریض دوست فرڈلانٹ فائلڈینبرگ آیا کرتی تھی اس کا تعلق پائٹسٹ دھونیوں کا ایک گروہ، فرقہ سے تھا۔ اپنی خرابی صحت کو اس عالم فانی کا ایک ناگزیر جزو سمجھتی تھی اور اپنے آلام کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کرتی وہ اپنے عقیدہ میں بہت استوار تھی اور گوٹے پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کرتی۔ لانگر کی صحت نے گوٹے میں جس عقیدہ کا بیج بویا تھا وہ فرڈلانٹ فائلڈینبرگ کے اثر سے پر دان چڑھا یعنی گوٹے کی طبیعت بھی کچھ نہ کچھ نفسی کی طرف مائل ہو گئی۔ فرڈلانٹ فائلڈینبرگ اور گوٹے کے معالج ایک ڈاکٹر میٹرنے جو علم طب و کیمیا کے ماہر تھے اور مذہب سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے گوٹے کی ذہنیت تمام جزو کو کل کی نسبت سے دیکھنے کی متقاضی تھی اس وجہ سے اُس نے ڈاکٹر میٹرنے سے طب و کیمیا بھی سیکھنا شروع کر دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ روح مادہ کے تعلق کا راز دریافت کرنے کے بعد انسان حقیقت کی آخری کڑی تک پہنچ جائیگا۔ اس میدان میں اُس کا خط اتنا بڑھا کہ اُس نے اپنے گھر میں دواٹیوں ہشیشیوں، نلکیوں اور اسی قسم کی بہت سی ضروری وغیرہ ضروریات کا ذخیرہ جمع کر کے اپنے گھر کو اچھا خاصہ کبائٹ خانہ بنا لیا۔ دن رات وہ اس کبائٹ خانہ میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ رات کی رات گزر جاتی اور وہ ایک نلکی کے کیمیاوی اجزاء کو دوسری نلکی اور دوسری سے تیسری میں ڈالتا اور دیکھتا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ اگر میں کسی چیز سے دلچسپی لیتا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اس سے کچھ فائدہ ہوتا اور آئندہ کے لئے کچھ نہ کچھ اچھے نتائج کی بنا پڑتی۔ ایک شاعر کو اس کا ٹھکڑا کے اندر دیکھ کر کچھ لوگوں کو ہنسی آتی ہوگی اور کچھ لوگوں کو جہم مگر یہ اُسی کی ہمہ گیر طبیعت کا ایک رنگ تھا کہ وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی لیتا لیکن دور میں نگاہوں سے یہ مخفی نہ رہا ہو گا کہ اس کا یہ جوش عمل اور شوق تعلیم کسی بڑے کام کا پیش خیمہ تھا جو بعد کو فائوٹ ایسی عظیم الشان شخصیت کی تخلیق میں ظاہر ہوا۔

گوٹے کے صحتیاب ہو جانے پر اُس کے باپ کو پھر خیال آیا کہ ہونا مرزاوند کو تعلیم کے لئے پھر کہیں بھیجے۔ گوٹے بھی فریڈرک فوٹ کی زندگی سے کچھ دل برداشتہ ہو چلا تھا۔ باپ سے آئے دن بات بات میں بحث ہوتی۔ آخر جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو گوٹے کی بار اسٹراس برگ روانہ ہوا اور اپریل ۱۸۷۷ء میں وہاں پہنچا جس نے یونیورسٹی میں داخلہ کرا لیا۔

شروع شروع میں تو شہر اُس کو پسند نہ آیا لیکن بعد کو جب اُس کی دلچسپیاں بڑھ گئیں تو اُس کا دل لگ گیا۔ اسٹراس برگ میں وہ ایک ایسے بورژوازمک باؤس میں رہتا تھا جہاں علم طب کے طلباء رہتے تھے۔ اُن کی صحبت سے ڈاکٹر میٹر کی یاد تازہ ہو گئی اور طب کی بھولی ہوئی دلچسپیاں پھر از سر نو زندہ ہو گئیں پھر شوق اتنا بڑھا کہ علم تشریح البدن، علم الکیمیاء اور علم البرق کے کچھ دلوں میں شامل ہونے لگا۔ جب کبھی چھٹی ملتی تو لوح ملک کی سیر کو جاتا اور وہاں کوئلے کی کالون، شیشہ اور لوہے کے کارخانوں کو دیکھتا اس اثنا میں اُس کے ایک دوست ساسمن نے اُس کا تعارف چند معزز گھرانوں میں کر دیا جہاں اُس نے تاش کھیلنا، رقص کرنا اور تفریح کے اور بہت سے طریقے سیکھے جن سے وہ اب تک بالکل بیگانہ تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُس نے قانون کی نسبت کیا کیا جس کی تعلیم کے لئے وہ خاص طور پر اسٹراس برگ آیا تھا۔ اسٹراس برگ فرانس کے نزدیک تھا اس لئے وہاں کی ہر چیز فرانسیسی تمدن کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ کردار، گفتار، وضع قطع، علم و فن غرض ہر شے میں فرانس کا طرز نغیب العین سمجھا جاتا تھا وہاں کی یونیورسٹی بھی اس اثر سے باہر نہیں تھی چنانچہ قانون کی تاریخی اور ارتقائی تعلیم کے بجائے صرف عروہ قانون کی تعلیم دی جاتی تھی یعنی چند ابتدائی باتوں کے ساتھ مقطوعہ اہمیت اصول معتصر الفاظ میں بتا دیا جاتا تھا اور یہی قانونی تعلیم کی کل کائنات تھی۔ گوئلے لائبرنگ کے شروع زمانہ میں اس سے کہیں زیادہ پڑھ چکا تھا اس لئے اسکو نصاب اتنا آسان معلوم ہوا کہ اُس نے پہلا امتحان بغیر کسی محنت کے پاس کر لیا۔ اب سند حاصل کرنے کے لئے بس کوئی ایک مضمون قانون پر لکھ کر پیش کرنا رہ گیا۔ اس مضمون کی تیاری کے لئے اُس نے ایک سال مقرر کیا مگر جب دوسرا طرم شروع ہوا تو اُس نے طب کا مطالعہ اس محنت سے شروع کیا گویا وہ قانون کے بجائے طب کا طالب علم ہے۔ مریضوں کے کمروں میں جاتا گھنٹوں اُن کے دکھ درد کی داستانیں سنتا اور اُن کو تسلی دیتا۔ اس طرح انسانی زندگی کی معلومات بڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے علم کی واقفیت بھی پیدا کر رہا تھا جو بعد کو اُس کے کام آئی۔ طب کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنی بہت سی طبی کمزوریوں پر غالب آیا یعنی وہ پہلے کسی بیمار کو یا لاش کو نہیں دیکھ سکتا تھا اب یہ ہوا کہ ان چیزوں کے دیکھنے سے کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ اسی طرح وہ اگر ادھنچائی سے نیچے دیکھتا تو اسکا سر چکراتا یا زور کی آواز سننے سے اُس کے کان میں ایک تکلیف دہ سنسنہاٹ پیدا ہوتی۔ ان چیزوں کو دور کرنے کے لئے وہ دھول کی گونج سنتا اور کسی اونچے گرجا کے مینار کے بالائی حصے پر چڑھ کر زمین کی طرف دیکھتا۔ اکثر اندھیری راتوں میں قبرستانوں، ہنسان جگہوں اور گرجا گھر دلوں

لی سیر کو مکمل جاتا تا کہ اس کا خوف دور ہو جائے۔ ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصود صرف اتنا ہے کہ گونٹے نے اپنے باطن کو سنوارنے اور اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کی جو کوششیں کی ہیں اُس کی مثال گونا بیخ میں کم ہی مگر انسان کے لئے دلیل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر اپنی قوت ارادی سے کام لے یا یوں کہئے کہ اپنی خودی کو بروے کار لائے تو اپنی ہستی کو بلند مرتبہ اور اعلیٰ درجہ پر پہنچا سکتا ہے۔

اُس زمانہ میں جب وہ گر جا گھروں کے میناروں پر چڑھتا اسکو اسٹراس برگ کے ایک گاتھی وضع کے ایک گر جا گھر میں خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ گاتھی وضع کلاسیکی (تہیم یونانی اور رومی) وضع سے بالکل مختلف ہے۔ اس وضع کی عمارتیں زیادہ تر عظیم الشان اور رفعت نشان ہوتی ہیں۔ یورپ میں ان کی تعمیر تیرہویں چودھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اُن کی اونچائی اور چوڑائی میں خاص تناسل ہوتا ہے۔ ان میں سنگ تراشی اور پچھکاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ لیکن باوجود اُن کی عظمت کے ان میں سادگی کا بھی عنصر موجود ہے۔ ان عمارتوں کا حسن گو کلاسیکی طرز کا نہ سہی مگر ایک صاحب ذوق کے تشبیل کو چھپر کر اس میں لطف پیدا کر سکتا ہے۔ گوٹے اس گر جا گھر کو بڑے شوق سے دیکھا کرتا اور اُس کے حسن ترتیب، ہم آہنگی و سادگی سے کافی لطف اٹھاتا۔ اس وضع کی عمارتوں میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو خالص مشرقی ہے اور وہ انکا محراب ہے۔ یورپ میں پہلے پہل محراب دار عمارتوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ اول، اول گھڑناں کے شکل کی محراب دار عمارتیں عراق میں تیار ہوئیں پھر نویں صدی کے آخر میں محراب نے نیکیلی شکل اختیار کر لی اور یہ جدید طرز قاہرہ کی ایک عمارت میں پہلے پہل نظر آتا ہے اور پھر اسی رنگ میں کئی صدی بعد یورپ کی عمارتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ گاتھی طرز کی عمارتوں میں گوٹے کی دلچسپی شاید یورپ کی نقلی کلاسیکی وضع کے تنفر سے پیدا ہوئی تھی۔ اُس وقت یورپ میں گاتھی طرز اتنا ناقابل مقبول تھا کہ فن تعمیر میں ہر ہنگم بد صورت اور بد وضع طرز کا نام ہی گاتھی پڑ گیا۔ مگر گوٹے نے اس طرز کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اپنے ملک کے فن تعمیر کو پرکھا اور اُن کو از سر نو زندہ کیا۔ اُس نے گاتھی طرز کی موافقت میں ایک مضمون لکھا جس میں مصری، مشرقی اور دیگر طرزوں کا موازنہ کیا اور دکھایا کہ گاتھی طرز میں خوشنمائی، ہم آہنگی، سادگی اور خوبصورتی سبھی کچھ موجود ہے۔ گویا اس کی پہلی آواز تھی جو اُس نے فرانس کی نقلی کلاسیکیت کے خلاف بلند کی۔ اس طرح وہ اس نقل سے ہٹ کر اپنے ملکی علم و فن کے سرمایہ کی طرف رجوع ہوا اور ساتھ ہی ساتھ نامعلوم طریقہ سے ایک زندگ

مشرق کی طرف بھی مائل تھا جس کا اثر بعد کو اس کے کلام پر بہت چلا۔ ہم آج چلکر ان اخراجات کا ذکر کریں گے۔ دوسری چیز جس نے گوئٹے کے زمانہ قیام اسٹراس برگ میں اُس پر نہایت گہرا اور دیر پا اثر ڈالا وہ ہرڈر کی فلسفہ تھی۔ ہرڈر کے فیض صحبت سے گوئٹے گوئٹے ہو گیا۔ گوئٹے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس شخص کے کمالات کا بڑی دریا دانی سے اعتراف کرتا ہے اور اُس کے بیان کو اُس نے سب سے زیادہ پھیلا کر لکھا ہے۔ گوئٹے اور ہرڈر کی ملاقات جرمن ادب میں ایک نئی روح پھونکنے کا باعث ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی روح کیا تھی اور اس سے قبل جرمن ادب کی کیا حالت تھی؟

سترھویں صدی کے وسط میں سی سالہ جنگ نے جرمنی کے تمام علوم و فنون کا خاتمہ کر دیا اور تمدن کی بس لہر کو جزوقدوں و سطی سے چلی آ رہی تھی بجائیکہ روک دیا۔ "تمدن زیر فاک، ملکی خوشحالی کا چراغ گل" انھیں وہ فقر و غریب میں اس تباہی کی داستان دہرائی جاسکتی ہے۔ جرمنی کی یہ حالت کم و بیش سو برس تک قائم رہی۔ اختیار جرمنی کے بعض حصوں پر قبضہ تھے۔ خود ملک میں کئی حکومتیں تھیں اس وجہ سے نہ تو سیاسی ہم آہنگی تھی اور نہ آزادی لیکن اس زمانہ میں بھی جرمنی کی حقیقی روح مردہ نہیں تھی۔ وہ تڑپنا چاہتی تھی مگر تڑپ نہ سکتی تھی۔ وہ ظاہر ہو نا چاہتی تھی مگر اظہار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ پھر آخر وہ کیا چیز تھی جس نے کشمکش حیات یہ کشاکش اظہار پیدا کر دی تھی؟ یہ جرمن قوم کا درد فی سوز و گداز تھا جس کا اظہار فرو کی زبان سے برابر نغزل میں ہوتا رہا اور جو حالات کے موافق ہونے پر

۱۷۰۳-۱۸۰۳ء) کو گیسبرگ میں مذہبیات کا مطالعہ کرنے کے بعد شہر ریچا میں بحیثیت پادری اور معلم سکونت پذیر ہو گیا یہیں اس نے علوم اور دوسری تصنیفات کا مطالعہ کیا اور شہر فلسفی کانٹ کی علمی صحبت سے بھی تنفید ہوا اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ایک شخص سمی ہامن سے ہو گئی جو انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی جاننے کے علاوہ عبرانی اور عربی بھی جانتا تھا یہاں پر مشرقی آیات کا کافی اثر تھا اس لیے بھی دیکھی لکھتا اور شاعری کے متعلق تو اس کا قول تھا کہ شاعری انسان کی مادری زبان ہے۔ ہامن کی صحبت میں ہرڈر کی نفسی تہمت ہوئی۔ ہامن نے اسکو انگریزی ادب اور خاص کرٹیکسیس کی شاعری کا مطالعہ سکھایا اور اسکو ادب و فنون لطیفہ کا مطالعہ کرتا رہا مگر اس کو فرانسیسی علمی آب و ہوا مطلق پسند نہ آئی۔ وہ حقیقت دروغ کا متلاشی تھا اور اچھا لیکر فرانسیسی سر تا پا نقل تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کو فرانسیسیوں کے ادب اور تمدن سے نفرت ہو گئی کیونکہ فرانسیسی اس کے خیال میں حقیقت کی دائیں گردن دار ہو کر ملکات سے قریب تر ہونے جاتے تھے جب وہ اپنے وطن آیا تو اُس کی شخصیت تیس چوبیس برس کی عمر میں علم و فنون کے ساتھ ساتھ ایک وسیع تجربہ کی بھی مالک تھی۔

ہرڈر نے شاعری کے متعلق ہامن کے قول کو اختیار کر لیا اور جوہر کے مطالعہ سے اُس نے اخذ کیا کہ شاعری علم و فنون کی تعلیم اور اثر انداز ہونے سے خالی ہے نہ وہ شاعری نہیں ہے یعنی شاعری حقیقت کی ایک ایسی خراب گل رنگ ہے جو لوگوں کو بہت گھٹیا کرنے کا ہے اچھا نہیں اچھا نہیں بلکہ کچھ پیدا کرتی ہے شاعری کا یہ خوش و خوش غیر مذہب لوگوں میں زیادہ پھیل گیا ہے کیونکہ ان میں شاعرانہ ذوق کی تربیت خود کرتی ہے اسلئے نظریہ کے مقابل میں ہرڈر کا رنگ رنگ اچھا ہے اگرچہ ہم کی شاعری کا مطالعہ تو ہرڈر کے لئے سب سے اچھا لکھنا تھا مگر ہرڈر کا یہ کہ شاعری ایک ایسی حکمت ہے جس کی اندیشی اور لگاؤ کو اس کے بیانیہ ارتقا کا نظریہ ہے جسکو منہجہ کرنے کا سہارا ملنا چاہیے کہ سہ ہے۔

”طوفان و بھجان“ کی تحریک میں ظاہر ہوا۔

فرانس کے اثر سے جرمنی میں نقلی کلاسیکی طرز کی باندی کی جاتی تھی یعنی فرانسیسی یونانی فن کو جس عقلی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے جرمن بھی اسی نظر سے دیکھنے لگ گئے اس طرح اصل پر نقل بدل نکل کا پردہ پڑ گیا۔ دیکھن، سمیٹنے اور لکھنے نے یونانیات کا اصل سچہ دریا نہ کیا۔ اور یونانی حسن کی لطافت علم کی روشنی اور تمدن کی شیرینی پر نقل سے جو بچہ پیدا کیا تھا اسکو اٹھا دیا۔ ان لوگوں نے اپنی کوششوں سے جلوہ طور کا سامان تو کر دیا مگر احساس ویدیا و چشم موسیقی، نکال سے لاتے گویا ایک میدان تو تیار ہو گیا مگر گوئے و چوگان والوں کا ہنوز انتظار تھا۔ یعنی خالص تخلیقی ادب ابھی کسی ایسے شخص کا منتظر تھا جو ان لوگوں کے شروع کئے ہوئے کام کو انجام تک پہنچا دے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سی سالہ جنگ کے بعد سے تغزل کا چراغ کسی نہ کسی طرح ٹٹٹا ٹٹا چلا آ رہا تھا مگر پاشاک نے اس میں تیل لکڑا اسکی روشنی کچھ تیز فرود کر دی مگر ہر ڈرنے ادبی ترقی اور خاص کر شاعری کی ترقی کا ساز اسی میں سمجھا کہ اس چراغ کو بجھ کر پایا جائے۔ اُس نے اپنے نظریہ کے مطابق غیر شعوری روحانی قوتوں کے انقباض پر زور دیا اور احساس کو اپنا راہ نما قرار دیا کیونکہ حرکت کا جوش اور عمل کی سرگرمی انہیں قوتوں کی تالیخ میں اس غیر شعوری قوت اور احساس کو وسعت دینے کے لئے تصوف کی چاشنی کے ساتھ آفتاب و ہاتھاب کی دلچسپیوں، بہار و خزاں کی نیرنگیوں غرض مناظر قدرت کی تمام دلچسپیوں سے کام لیا گیا۔ اسی زمانہ میں

یونان شائع ہوئی جس سے دلوں کا احساس اور بھی تیز ہو گیا۔ ہومر اور شکسپیر کی پرستش کا زمانہ نیا ہیوم لائے کوئی دو ہزار سال ہوئے کہ شمالی یورپ، شمالی اسکاٹ لینڈ اور شمالی آئر لینڈ کے پہاڑی علاقوں اور دایلوں میں ایک قسم کیلٹ آباد تھی۔ اُس کا مسکن دشوار گزار ہونے کی وجہ سے رومی افراد ہنگامیں پہنچا تھا۔ یہ قوم چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں تقسیم تھی ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا جو اپنی رعایا کی باہمی نزاعات کا تصفیہ کرتا اور جنگ کے وقت سپہ سالاری بھی کرتا ہر شخص کی بزرگی بہت سادہ تھی۔ بیشتر وقت سپہ سالار میں اور پھر لڑائیوں میں گزرتا تھا۔ چونکہ دور و دراز ملکوں سے وسائل آمد و رفت آجئے نہ تھے اسلئے ان کے رسم و رواج اور ان کی زبان میں صدیوں تک کوئی فرق نہیں آیا۔ پہاڑوں اور دایلوں میں قدرتی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے یہ لوگ فطرت بہادر اور شجاع تھے اسلئے ناموری اور شہرت کی بڑی خواہش تھی اور اس مقصد کے لئے ہر دریا میں ایک شاعر ہوتا تھا جو ان کے آبا و اجداد کے زرمیہ کا زاموں کو آب و تاب کے ساتھ آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ان کے کلام میں گذشتہ دور کی عظمت کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی ناقدری اور بے بسی کا ذکر بھی اس سوز و گداز سے ہوتا کہ لوگوں کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا۔ انہی قبیلوں میں سے اسکاٹ لینڈ کے ایک قبیلہ کا سردار نکل تھا جو شاہی تیسری صدی عیسوی میں حکمران کرتا تھا۔ نہایت جری اور شریف النفس تھا۔ اُس کی بہادری کا کہ نام ملک پر چٹھا ہوا تھا۔

اس پر رحم کرتا اور دوستوں پر شفقت کی نظر رکھتا۔ اس کے تین لڑکے اوسیان، ضیلان اور راتھو تھے اور تینوں نے کوئی آدلا دہیس چھوڑی جس سے فنکار کے خاندان کا چراغ نفاہت پریشانی سے گل ہو گیا مگر فنکار کو زندہ رکھنے والا اسکا نامور فرزند اوسیان تھا جو بہادر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا فاعل بھی تھا وہ فنکار کے ساتھ برابر لڑائیوں میں شریک ہوا

کے گیتوں اور کہانیوں سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی۔ افعال و اقوال میں جوش و خروش، عقائد و خیالات میں تنوع کی بنا پر ہی۔ قدیم روایات کا سلسلہ جو معاشرت کو مدتوں سے جکڑے چلا آتا تھا ٹوٹ گیا۔ نظریاتی دور جس ادب میں مطلقانہ ادب و بھان کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے اصول مضبوط کرنے والا تو ہر دور تھا مگر اس کو ادب میں کامیابی کے ساتھ برتنے والا گوئے تھا۔

ہر دور جب اسٹرا س برگ آیا تو اُس کے خیالات کی حد بندی اور اُس کے ادبی مقصد کی نشو و نما ہو چکی تھی گوئے اُس کی شہرت سنکر اُس سے ملنے گیا مگر ان دونوں کی طبیعتوں میں بعد المشرقین تھا۔ ہر دور تنگ مزاج، سخت کلام، بد خو اور چڑچڑا تھا۔ اپنے ملنے والوں کو اپنے قائم کردہ معیار کمال سے دیکھتا اور جب ان میں وہ خوبیاں نہ پاتا تو بد دل ہو کر برہم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تحریک طوفان و بھان کے بانی ہونے کے باوجود اُس کو انجام تک بخیر و خوبی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ علاوہ بریں وہ شاعری میں دلچسپی لیتا تو ضرور تھا مگر خود شاعر نہ تھا اور یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ برخلاف اس کے گوئے کی حقیقت کو ش طبیعت میں طلب علم کی تمنا خیالات کو سمجھنے اور پرکھنے کی خواہش، دوستانہ انداز کے ساتھ رواداری اور درگزر کرنے والا اسلوب تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُس میں دوسروں کا نقطہ نظر سمجھنے کے لئے قدرت نے ہمدردی کا عنصر پیدا کیا تھا جو اُس سے بہت سی غلط فہمیوں کی خلیج سے بے کھیلے پار مٹا رہا لیتا تھا۔ گوئے کے اس انداز طبیعت نے وہ ماحول پیدا کر دیا جس سے ہر دور سے بھی اور خوب بھی مگر بھی دوستی اور محبت کے درمیان مفاہمت کا بھی ایک دور گزر چکا تھا۔ مدتوں بعد بڑھاپے کی حالت میں جب وہ آنکھوں سے محذور ہو گیا تھا اُس نے اپنے بزرگوں کے کازناموں کو ایک عورت یونا سے نہایت پردہ و طریقہ سے بیان کیا جس سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر یہ داستان تمام ملک میں پھیل گئی اس خطا صہ یہ ہے کہ ایک قبیلہ کا سردار سواران آئر لینڈ پر حملہ کرتا ہے۔ کیتھولین جو آئر لینڈ کے نوجوان سردار کا اتالیق ہے، فنگل سے مدد طلب کرتا ہے مگر قبل فنگل کے پہنچنے کے سواران کیتھولین کو شکست دیدیتا ہے۔ پھر فنگل اپنی کمک لے کر پہنچتا ہے اور پیسیم تین سخت خونریز لڑائیوں کے بعد جن میں طرفین کے ہمارا اپنی جو ہر دار تین کا خوب خوب کمال دکھانے میں سواران کو شکست دیتا ہے۔ سواران گرفتار ہو کر آتا ہے مگر فنگل سواران کی بہن کے احسان سے متاثر ہو کر جس نے ایک دفعہ فنگل کی جان بچائی تھی سواران کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ رزمیہ داستان منظومات ادیبان کے نام سے مشہور ہے اس سے ان قبائل کی تہذیب پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً فنگل طریقہ مبارزہ طلبی عزت و دولت کے خیالات اور طرز زندگی کا چہرہ چلتا ہے۔ پھر دونوں طرف کے ہمارا دونوں کی سیرت بھی معلوم ہوتی ہے۔ سواران مغرور سرکش اور پیسیم ہونے شیر کی طرح ہے۔ کیتھولین آبرو کا پاس رکھنے والا ڈر سپاہی ہے۔ ان لفظوں کے انداز بیان میں نزاکت، رنگینی اور ایک طرح کی عظمت ہے۔ خیالات کو تشبیہ و استعارہ کی رنگ آمیزی کے بعد اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے واقعہ کی بوری تصویر آجائے۔ مناظر میں سنسان جنگل، چاندنی رات، دریا کا کنارہ، سبز پوش مزارات، کسانوں کی خوشیاں اور وادیاں اس طرح دکھائی گئی ہیں کہ ان سے دل پر کافی اثر پڑتا ہے کہیں کہیں مانتاب و کوکب، دشت و جبل کو نہایت

اسٹراس برگ میں ہر ڈر کوئی سات مہینے رہا اور اس عرصہ میں اس نے اپنا سارا پیام گوٹے کے اثر پذیر دل پر نقش کیا اور اُس کے سینہ کو اس امانت کا خزانہ بنایا جو نہ صرف ادب میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئی روح بھونکنے کا باعث ہو گئے۔ نیشک ٹیکسیر پڑھا تھا مگر اب تک اُس کے حقیقی مفہوم سے بے خبر تھا مناظر قدرت سے دلچسپی لیتا تھا، لہذا احساس نہ تھا جس سے دل میں درد پیدا ہوتا ہے، شاعری کرتا مگر فرانسس سیدل کی فنی نقید کے بند گراں سے اُس کے تخیل کی پرواز وسیع نہ تھی۔ ہر ڈر کے فیض صحبت کا یہ اثر ہوا کہ وہ جس چیز کی طلب میں دلوں سے پریشان اور آشفٹ مزاج رہا کرتا تھا وہ اُسے مل گئی یعنی اُس کو اپنی فطرت کے سہ بستہ راز کا حال معلوم ہو گیا۔ شینسیسی، ہوم اور اوسیان کے حکمت ممل ہو گئے۔ آفتاب و ماہتاب سے سرگوشیاں بولنے لگیں نسیم صبح، دوست کی پیغام میر، ن گئی اور یہ بزم کہ عالم جواب تک یہ گانہ تھی رازداری کا دم بھرنے لگی۔

ہزاروں سالوں سے اپنی بے لوثی پر مبنی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے جن میں دیدہ و پیدا احساس کا دریا اس زور شور سے بہا کہ بند باندھا مشکل ہو گیا۔ آزاد اور فطرت پرستی اُس کی شاعرانہ اہم زندگی کا اہم جزو بن گئیں۔ ہر ڈر کے قول کے مطابق کہ ہر ملک اپنی ہی روایات پر قائم رہ کر شاعری کے میدان میں ترقی کر سکتا ہے، اُس کو اپنی ملکی شاعری اور زبان سے الفت اور فرانسس سیدل سے نفرت ہو گئی اور فطرت کی وجہ بھی تھی یعنی فرانسس سیدل! وجود جرموں کی نقالی کے ان کے ادبی مذاق کو کم درجہ کا سمجھتے تھے اسٹراس برگ کے زمانہ قیام میں گوٹے پر ایک تیسرا قابل ذکر اثر بھی پڑا۔ اسٹراس برگ سے ۱۷ میل کے فاصلہ پر مقام سینہاٹم میں ایک پادری پرلوں رہتا تھا گوٹے اکثر اُس سے ملنے جاتا یا پادری کے کئی لڑکیاں تھیں۔ ان میں فریڈرک حسن جمال میں سب پر فوقیت تھی اور اس زمانہ میں اپنی پوری عنانی کے ساتھ میلان شباب میں کامزن تھی گوٹے نے اس سے

پراثر طریقہ سے خطاب کیا گیا ہے یہ طرنا دلوں شرفی اثر سے آزاد بھی مگر مشرقی انداز زبان سے مزور ملتی جلتی ہے۔
ان افشاروں کا شمالی اسکاٹ لینڈ میں دلوں سے چرچا چلا آتا تھا۔ اسکاٹ میں ایک شخص سسی جیمز میکفرسن ۱۷۹۴-۱۸۳۷ نے ان نظموں کو بڑی محنت کے بعد جمع کر کے انگریزی ترجمہ شائع کیا یہ ترجمہ نہایت مقبول ہوا۔ ناقدین میں دو گروہ ہو گئے ایک تو ان کو مترجم کے دعویٰ کے مطابق ترجمہ اور دوسرا انکو میکفرسن کی من گھڑت بتاتا۔ قطع نظر اس بحث کے ان نظموں سے اُس زمانہ میں سخت ہیجان برپا ہوا۔ تخیل کو ایک زبردست ایڑ لگی اور اٹھارہویں صدی کی عمر وہ زندگی میں کچھ کچھ جان آنے لگی۔ اس عہد سے تخیل کے زور سے احساسات کو پھیر کر رنگ آمیزی کا جو سلسلہ ادب میں شروع ہوتا ہے اوسیان اُس کی ایک نہایت اہم کڑی ہے۔ اوسیان کا یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ بعضوں نے اوسیان کا موازنہ ہومر سے کیا ہے اور لاڈ باڑن نے تو فنگل کی سیرت کو ہومر کے کپڑا اور اڈویموس سے زیادہ ممتاز بتایا ہے۔ جرمنی کی تحریک طوفان و ہیجان کے چہرہ کی زیبائش میں اوسیان کا کافی جزو ہے گوٹے خود اسکاٹ لاداح تھا اور درقصر کے باب دوم میں سیلما کے گیت داخل کر کے اُس نے اوسیان سے اپنی عقیدہ بندی کا اظہار کیا ہے

مٹے ہی اپنے دل میں درد عشق کی کسک محسوس کی۔ اُدھر فریڈریک کے چشم مست نے اس طائر دام پرست کو اسیر کرنے کی کوشش کی جو اپنے کی قید محبت سے رہائی کے بعد ذرا آزادی کی سانس لے رہا تھا۔ گوٹے کئی سفر پارہی کا جھان رہا چاندنی راتوں میں فریڈریک کے ساتھ بیٹھے جانا اور راستہ میں انکی باتیں سنتا جواتی پر کیف ہوتیں کہ ”رات کی تاریکی کا فوہ ہو جاتی تھیں اور رات میں جب کبھی موقع ملتا دونوں تنہائی میں بیٹھ کر نہ ختم ہونے والی گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ گوٹے اس فرصت کی داستان کو برابر طول دینا چاہتا مگر ضروری کاموں کی وجہ سے اُسکو جلدی اسٹریس بگ آنا پڑا۔ لوٹتے وقت اُس کی طبیعت بے حد پریشان تھی۔ اِدھر آب دیدہ اور ادھر جہانے غمازی کی اور راز آشکار ہو گیا۔ اسٹریس بگ پوچھ کر فریڈریک کو لگتا ہے کہ ”میری نئی دوست! تمہیں اس لقب سے یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر مجھے آنکھوں کی کیفیت سے بہت کم واقفیت ہوتی تب بھی میں تمہاری پہلی نظر میں محبت کی لگاؤ کا حال جان جاتا اور وہاں حال تو یقین کے ساتھ کہیں کیا تمہارے نازک اور اچھے دل کے لئے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے بالکل اتفاق نہ کرے در آنحالیکہ تم مجھ کو جان سے بھی سوا عزیز ہو؟“ اسٹریس بگ کے کاموں سے جب کبھی فرصت ملتی گوٹے فریڈریک سے آکر ملتا۔ فریڈریک بھی اس سے محبت کرتی اور اس کی محبت کا یہ اثر ہوا کہ گوٹے نے اس زمانہ میں جو غزلیں لکھی ہیں اُن سے تحریک طوفان و بھجان کا صاف پتہ چلتا ہے یعنی صرف جذبات ہی جذبات ہیں، اصول و قواعد کی پابندیوں سے بڑی حد تک آزادی برتی ہے۔ مزید برآں فریڈریک کے فیض عشق سے گوٹے کی دماغی اور ذہنی قوتیں جو پردہ خفایں تھیں بردے کا رانے لگیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہر فرد کے اندر کے ساتھ فریڈریک کی محبت شامل حال نہ ہوتی تو شاید دریا میں وہ جوش اور روانی نہ ہوتی جو پیدا ہوئی۔

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا یہ پردانہ جہوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے

ان دونوں کی الفت کا تقاضا تھا کہ دونوں رشتہ مناکحت میں منسلک ہو کر زندگی کے دشوار گزار مرحلوں کو آسانی سے طے کرتے مگر عین شباب محبت میں گوٹے کی وہی پرانی سیرت کی جھلک یعنی ہلے پر دانی در میمگ، وہی روح کی بے قیاری اور دام سے رہائی کی تڑپ پھر نمودار ہوئی۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے فریڈریک بیمار ہوئی اور معالجوں نے کوئی جھلک عارضہ تجویز کیا۔

گوٹے کئی بار فریڈریک کو دیکھنے سینباٹم گیا۔ مگر اُس اُدھیڑ بن میں کئی راتیں اُس نے گزاریں کہ چھٹکارے کی کیا صورت ہو۔ آخر اس نے دہک فیصلہ کر لیا کہ فریڈریک کے ساتھ رہنا محال ہے۔ فریڈریک کو معلوم ہوا تو وہ دل تھام کر رہ گئی۔ اس نے اس بازگاہ عشق میں اپنی ساری متاع الفت و کلامی غنی اور تہجد کی منتظر تھی کہ یہ زبردست چھٹکارا لگا جس سے شاید وہ پھر اچھی طرح نہیں سنبھلی۔ اس واقعہ کے متعلق گوٹے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ ”میرے الوداعی خط کے جواب میں فریڈریک کے تحریر نے میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا۔۔۔ آج پہلی دفعہ مجھے اُس کی تکلیفوں کا احساس ہوا۔ مجھے ہمیشہ اُس کی جدائی شاق گذری اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ خود میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے

پانوس میں کھڑی ماری.... گردن میں مجھ سے چھین لی گئی، اپنے بیوفاکلی اداس معاملہ میں تو میں خود مودر الزام ہوں مگر کیا کیا جائے انسان کسی نہ کسی طرح مبرک کر لیتا ہے۔ گوٹے کی سیرت کے اس عجیب و غریب پہلو کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ عین بقراری کی حالت میں اُس کے عشق کو ایک بیک سکون ہوتا نظر آتا ہے؟ بہت سے لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں مگر اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شادی سے اس لئے بھاگتا تھا کہ اس کی زندگی کی حرکت سکون سے نہ بدل جائے اور اُس نے اپنی زندگی کے لئے جو مقصد قائم کر رکھا تھا اُس کے حصول میں فسر ق نہ آجائے۔ اس کے خیال میں شادی سکون کے مترادف تھی اور اپنے مہا کی تلاش میں اُس کی ہستی ایک تڑپ، ایک بقراری اور ایک طرفانی کیفیت کی حامل تھی۔ پھر بھلا یہ دونوں چیزیں کیسے ایک جگہ جمع ہو سکتیں۔ ٹھیک ہی بات بزرگوار! اپنے ایک ڈرامہ میں یوں ادا کرتا ہے کہ اگر میں شادی کروں تو میں بجائے زمانہ مستقبل کے زمانہ ماضی کا آدمی ہو جاؤں گا۔ بہر حال جب فریڈرک سے جدائی ہو گئی تو اُس کا جوش سکون سے بدل گیا اور طبیعت میں کچھ اسی چھا گئی اور اُس آداسی سے شاید اس کو اپنی قوت شریہ کے بڑھانے میں کافی مدد ملی۔ آخر اُس نے اسٹراس برگ کی یونیورسٹی میں اپنا خاص مضمون پیش کیا اور وکالت کی سند لیکر اگست ۱۸۸۷ء میں مکان واپس گیا۔

گوٹے گھر لوٹا تو وکیل بن کر آیا اور باپ کے نقش قدم پر چل کر اُس نے وکالت بھی شروع کر دی مگر وکالت میں اسکا بالکل جی نہیں لگتا تھا۔ وہ ادبی دلچسپیوں میں منہمک ہو گیا۔ اسٹراس برگ ہی میں اس کو فائوٹسٹ اور گوتس کے پڑنے قصوں کو از سر نو ڈرامہ کی شکل میں لکھنے کا خیال ہوا تھا۔ گو وٹن واپس آکر فائوٹسٹ کا خیال اُس نے فی الحال ملتوی کر دیا مگر گوتس کا خاکہ ذہن میں سوچنے لگا۔ پھر عقوڑا سا لکھا بھی اور پھر چوبہ ہفتہ کی مسلسل محنت کے بعد ۱۸۸۷ء کے آخر میں اُسکو ختم کر دیا گوتس ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا گوتس کے قصہ کا سرا جرمی کی سولہویں صدی کی تاریخ میں ملتا ہے۔ گوٹے نے اس قصہ کو پر اثر اور ڈرامہ کے لائق بنانے کیلئے کہیں کہیں تعریف بھی کیا ہے اور دلچسپی کی خاطر عشق و محبت کی چاشنی بھی دیدی ہے۔ گوتس فان برلی شنگن سوہویں صدی کا ایک بڑا بڑا جنگجو تعلقہ دار ہے جو اپنے اوپر صرف شہنشاہ کی حکومت تو تسلیم کرتا ہے مگر دوسرے تعلقہ داروں سے برابر لڑتا بھڑکتا رہتا ہے اُس کی نشو و نما گویا جنگ ہی کے لئے ہوئی ہے۔ اُس کے توانا بازن میں وہ طاقت ہے کہ بڑے بڑے دشمن اسکا لوہا مانتے ہیں۔ فن حرب کے تمام اصول اُس نے فطرت سے سیکھے ہیں اس کی لڑائی کا مقصد صرف غریبوں اور غلاموں کی مدد کرنا ہے۔ انکی خاطر وہ ہر طرح کی معینتیں جھیلنے اور ان کو دکھ درد سے چھڑانے کے لئے فہم کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک دفعہ وہ قید بھی ہوتا ہے مگر چھوٹ کر پھر لڑتا ہے اور لڑتے لڑتے مارا جاتا ہے گوتس کی بہادری اور نیکی دکھا کر گوٹے فطرت کو کتب پر ترجیح دیتا ہے، خاندانی و نسلی روایات کے مقابل میں آزادی کو

سرا ہوتا ہے اور جماعت کے سامنے فرد کی کوششوں کو لائق تحسین قرار دیتا ہے۔ اس ڈرامہ میں اُس نے نوجوانوں کو زندگی کے لئے ایک ایسے اعلیٰ اخلاقی نصب العین قائم کرنے اور اُس کی طلب میں فنا ہو جانے کی تلقین کی ہے جس کی بنیاد آزادی اور فطرت پرستی پر بیوں یعنی وہمہادی، سچائی، رحم اور ہنسی کو جو انسان کی اندرونی زندگی کا مظہر ہوں، تمدن کی بنا و فی زندگی کے مقابلہ میں صد آفریں کہتا ہے۔ ”طوفان و بیجان“ کے خط و حال اس ڈرامہ میں مکمل طور پر نمایاں ہیں یعنی آزادی، فطرت پرستی، جوش و عمل، خلوص، راستبازی اور احساس۔ اب تک ڈرامہ میں نرسیسیموں کی تقلید سے زمان و مکان و کردار کی ہم آہنگی چلی آتی تھی مگر گوٹے نے اس رواج کو توڑ ڈالا کیونکہ کسی شخص کی مکمل فطری زندگی دکھانے کے لئے زمان و مکان و کردار کی ہم آہنگی بیان میں حارج ہوتی ہے جب یہ ڈرامہ شائع ہوا تو عام طور پر بہت مقبول ہوا۔ نوجوانوں نے بڑھکے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کے لئے آزادی کا علمبردار اور عمل کا صورت تھا۔ انگلستان میں اسکاٹ کے شہر قصبوں پر اس کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے بعد گوٹے جرمین طرز عمارت، انشیکسپیر، پنڈار اور دیگر شعراء کے کلام پر تنقید لکھنے اور شائع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ساتھ رسالوں میں کتابوں اور رسالوں پر ریویو بھی کرتا۔ اُس کی زندگی مینڈوں اسی طرح گزرتی رہی۔ قانون کی محنت اُس کے لئے ہر ن پرگھاس لانے والی مش کی طرح تھی۔ وطن بھی اُس کو طبعاً ناپسند تھا۔ باپ نے دیکھا کہ بیٹے کا جی یہاں نہیں لگتا اور کچھ اس خیال سے کہ اگر کسی بڑی جگہ وکالت کرے تو شاید ترقی کے اچھے ذرائع ملیں بیٹے سے ویز لڑکی عدالت العالیہ میں جا کر وکالت کرنے کے لئے کہا گوٹے نے جو ذہنی کمزوری سے باہر جانے کا نام سنا تو فوراً راضی ہو گیا اور مئی ۱۸۷۷ء میں ویز لڑ چلا گیا۔

گوٹے جب ویز لڑ رہا تھا تو اُس کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔ ظاہر تو وہ وکالت کرنے کے ارادہ سے آیا تھا مگر باپ کے سامنے سے ہٹا تو ہوم اور پنڈار پڑھنا شروع کر دیا۔ قانون کے بجائے ادب اسکا میدان عمل بنا پھر عدالت العالیہ کی حالت خود ایسی ناگتہ بہ تھی کہ گوٹے اس طرف راغب بھی نہیں ہوا۔ تنہا طبیعت گھبراتی تھی کہ اتنے میں کچھ زندہ دلوں کی سوسائٹی میں اُسکا داخلہ ہو گیا۔ یہ سوسائٹی گویا ایک گول میز کلب تھی جس کے ہر ممبر کا ایک مخصوص نام ہوتا۔ گوٹے کا نام گوٹس فان برلی شگن پڑ گیا۔ اس کلب کے بہت سے ممبر تھے جن میں قابل ذکر نوجوان بریٹولم، ہنسوک کے سفارتیاد کا منشی تھا اور جس سے گوٹے سے بہت جلد دوستی ہو گئی۔

ویز لڑ رہی وہ مقام ہے جہاں ”درتھر“ کے افسانہ کی بنا پڑی۔ یوں تو گوٹے کی تمام تصنیفات میں اُس کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات شامل ہیں مگر ”درتھر“ میں جیسا کہ اُس کے سوانح نگاروں کا خیال ہے اُس کی

سوانح عمری کی جتنی صاف جھلک نظر آتی ہے اتنی اسکی ادراستی تصنیف میں موجود نہیں۔ ایک ایک واقعہ کی تفصیل کی جو ”درخت“ میں موجود ہے اُس کے حالات زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیزلر کا شہر صاف ستھرا نہیں تھا اس لئے گوٹے زیادہ وقت شہر کے باہر سیر و تفریح میں گزارتا جہاں کیفیت یہ ہوتی کہ ”جس درخت کو دیکھو پھولوں سے لدا ہوا ہے اور اس بشت زار میں بس یہی خواہش ہوتی کہ کسی طرح تلی ہوئی بکری اس موٹر نصاب پر روانہ کی جائے۔“ ”درخت“ کے ابتدائی حصہ میں جس مقام کی دلچسپیوں اور مناظر قدرت کی دلفریبیوں کا ذکر ہے وہ دراصل دیزلر ہی ہے پھر جس چشمہ کا ذکر ہے وہ بھی دیزلر کے باہر ہے اور وہ باغ وادی بھی پاس ہی موجود ہے کبھی کبھی لمبی سیر کرتے کرتے وہ دور گاربنہاٹم کے موضع تک نکل جاتا جس کو ”درخت“ میں دالہاٹم کے نام سے پکارا گیا ہے۔ وہاں وہ جا کر نمبو کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر چائے اور قہوہ پیتا۔ پہلی دفعہ جب وہ گاربنہاٹم گیا تھا تو راستہ میں اسکو تین بچے ملے جن میں سب سے چھوٹا چھ مہینہ کا تھا۔ اور ہر ایک کو اُس نے ایک کر لیزر دیا۔ یہ واقعہ ”درخت“ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ درج ہے۔

دیزلر آنے کے دو تین ہفتہ بعد اُس کی ملاقات کیسٹرن سے ہوئی جو ڈیوک آف بریمن کے سفیر کا سکرٹری تھا مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے گول میز کلب کی رکنیت سے علیحدہ ہو گیا تھا کیسٹرن گوٹے سے آٹھ سال بڑا تھا۔ متین اور ذرا خشک مزاج تھا مگر طبیعت بہت سلجھی ہوئی تھی اور اپنے کام میں بڑا مہوشیار تھا۔ کیسٹرن گوٹے سے ملکر بہت خوش ہوا اور جلدی دونوں دوست ہو گئے۔ کیسٹرن نے گوٹے کے ابتدائی قیام کا حال ایک دوست کو لکھا جس سے گوٹے کے اس زمانہ کی ذہنی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”موسم بہار میں یہاں ایک مناسب گوٹے آئے ہیں۔ عمر قریب ۲۲ سال کے ہوگی۔ کسی امیر آدمی کے لڑکے ہیں۔ یہاں نکالت میں تجربہ حاصل کرنے آئے ہیں۔۔۔۔۔ آدمی بہت قابل ہیں۔۔۔۔۔ ان کے تخیل میں کافی رنگینی ہے اور اس لئے وہ ہر چیز کا اظہار تشبیہ اور استعارہ میں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے جذبات میں جوش بہت ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر قابو رکھنے کی بھی صلاحیت ہے۔ ان کو نہ تو آبرو، نہ رواج اور نہ فیشن کا خیال ہے۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ پابندیوں سے ان کو سخت نفرت ہے۔۔۔ انکا ابھی کوئی اصول نہیں مگر رفتہ رفتہ وہ کوئی نہ کوئی اصول ضرور بنالیں گے روسو کے متعلق انکا خیال اچھا ہے مگر اس کی وہ اندھا دھند پرستش نہیں کرتے۔۔۔ وہ شک و شبہ سے بھاگتے ہیں اور چند اصولی باتوں میں سچائی اور حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ نہ تو گر جا جاتے ہیں اور نہ کسی عبادت میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ میں عبادت کر کے ریاکار نہیں بننا چاہتا۔ عیسائی مذہب سے ان کو بے شک محبت ہے مگر اس رنگ کو پسند نہیں کرتے جس میں ہمارے پادری ہمیشہ کرتے ہیں۔

معاذ اور حیات بعد الممات میں ایک بہتر روحانی نظام کے قائل ہیں۔ وہ سچائی اور حقیقت کے متلاشی ہیں لیکن اُسے انہما سے زیادہ وہ اندرونی جذبہ کی قدر کرتے ہیں۔ اتنی کم عمر میں انہوں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ معلومات بھی بہت وسیع ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ وہ غور فکر کے عادی ہیں۔ روٹی کمانے والے علوم کے علاوہ انکو تمام علوم سے دلچسپی ہے۔

اُس زمانہ میں وزیر کے ایک مشہور شہری مسٹریف کی لڑکی غمار لطف سے گوشت کی ملاقات ہوئی شارٹ جوائے اور لائسن کے نام سے بھی پکاری جاتی تھی حسین، نازک اندام، خوش باش اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ علم کا اسے کوئی خاص شوق نہ تھا مگر کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادی تھی۔ اُسکا زیادہ تر وقت گھر کے دھندوں میں گزرتا تھا۔ دو سال اُس کی ماں کے انتقال کو ہوئے تھے اور اُسی وقت سے سولہ سال کے سن میں گھر کا سارا کام اُس کو سنبھالنا پڑا۔ اتنے بڑے کنبہ میں جس میں کئی بچے ہوں۔ بچوں کی دیکھ بھال ان کی پرورش، گھر کی صفائی اور چولے برتن کا سارا کام اُس کی نگرانی میں ہوتا تھا مگر گھر کے لان کاموں سے اور لڑکوں کے شور و غصہ سے اس کے پرسکون ہاتھ پر کبھی بل نہیں آیا۔

گوشت کی ملاقات شارٹ سے ایک رقص کے موقع پر ہوئی جو مقام دلپہر ہونڈن میں منعقد ہوا تھا دلپہر ہونڈن دیزلر سے ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ کیسٹنر بھی اس رقص میں مدعو تھا مگر اس کو دہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی البتہ شارٹ اپنے چند دوستوں کے ساتھ پہلے پہنچ گئی تھی۔ شارٹ جس طرح رقص میں پہنچی ہے اُس کا پورا حال درحضرہ میں درج ہے۔ جب کیسٹنر آیا تو گوشتے اس سے لاکھ بٹن ایک خط میں اس ملاقات کا حال یوں لکھتا ہے کہ ”گوشتے ایک گاؤں میں رقص کی شرکت کے لئے گیا تھا۔ میں اور میری منسوبہ بھی وہاں موجود تھے۔۔۔ وہ بڑا قابل آدمی ہے طبعی اور اخلاقی لحاظ سے اُس نے فطرت کے مطالبہ کو اپنا خاص شعار بنالیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں حسن بکھویا رہتا ہے۔ وہاں کسی عورت سے مل کر اُس کو خوشی نہیں ہوئی مگر شارٹ نے پہلی ہی دفعہ اُس کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی۔ شارٹ میں جوانی کی اُمتک ہے اور گوشتے حسین نہ سہی مگر کافی حسین ہے۔ اُس کی نظر میں موسم بہار کی سی شگفتگی ہے مگر اُس روز تو رقص کی وجہ سے خاص طور پر تھی کیونکہ وہ رقص کو پسند کرتی ہے۔ وہ سادہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور بہت خوش تھی۔۔۔ گوشتے کو اس بات کا مطلق علم نہ تھا کہ وہ کسی سے منسوب ہے۔ میں کئی گھنٹے بعد پہنچا۔ ہم لوگوں میں یہ رسم ہے کہ سب کے سامنے اپنی منسوبہ سے سوائے معمولی دوستی کے اور کسی چیز کا اظہار نہیں کرتے (جس سے شاید گوشتے کو غلط فہمی ہوئی)، وہ بھی اس وقت بہت خوش تھا حالانکہ بعض وقت طویل رہتا ہے۔ شارٹ رقص میں کچھ اس ادا سے مصروف تھی اور اپنے کو بھول بیٹھی تھی کہ گوشتے کی آنکھوں میں کب گئی

دوسرے روز گوٹے اُس سے ملے آیا۔ رقص کے موقع پر تو اُس نے شارلٹ کو ایک خوش باش اور مشتاق رقص عورت کے طور پر دیکھا لیکن اب اُس نے اُس کو بالکل دوسرے اور بہتر رنگ میں دیکھا یعنی وہ گھر کے کاروبار میں مشغول تھی۔ شارلٹ کے اس رقص نے پھر اس جنگجاری کو ہوا دیدی جو فریڈیک کی جدائی کے بعد گوٹے کے دل میں دلی ہوئی تھی یعنی وہ پھر پروانہ دار شارلٹ کے شمع حسن پر شمار ہونے کے لئے آگے بڑھا جیسا ہی واردات قلب کی داستان اُس نے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد رقص کی زبان سے ادا کی ہے۔

اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ لائٹن کی طبیعت میں سادگی تھی۔ اول تو خود اُس کی طبیعت سادہ تھی دوسرے اُس نے ایسے شخص سے محبت کرنا شروع کی تھی جو ہر طرح اُس کے لائق تھا اور جو ہر سرد و گرم میں ہلکا رفتی بننے پر تیار تھا۔۔۔۔۔ اُس نے اپنے چاروں طرف مسرت و انبساط کی فضا پیدا کر لی تھی۔۔۔۔۔ نئے ملاقاتی زبانِ طرف اشارہ ہے، نے اول اول اپنی پُرانی روش پر چلنا شروع کیا مگر جلد ہی اُس کی عشوہ دناز کا سیر ہو گیا اور پھر وہ (دوہلا) (شارلٹ اور کیسٹر) اس کے ساتھ محبت اور دوستی کا ایسا بڑا جو کرتے کہ وہ اپنے کو بھول گیا۔ تخیل پسند اور ایک گونہ کا ہل ہونے کی وجہ سے وہ حال سے دل برداشتہ تھا۔ اسکو لائٹن میں ایک دوست کی ساری خصوصیات نظر آتی تھیں گو لائٹن مستقبل سے بے پروانہ تھی مگر حال سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اُس نے اس ملاقاتی کی دوستی لطف اٹھایا اور وہ ملاقاتی بھی اُس کی عدم موجودگی کو محسوس کرتا۔۔۔۔۔ کچھ دنوں بعد میدانِ دباغ کی سیر میں دونوں ساتھ رہنے لگے۔۔۔۔۔ کبھی کبھی لائٹن کا سنگیتر بھی ساتھ ہو لیتا مگر ان تینوں کو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ تینوں کس طرح ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔

چونکہ گوٹے کو وزیر لر میں کوئی خاص کام نہ تھا اسلئے زیادہ تر وقت لائٹن کے ساتھ ہی گزارتا۔ وہاں بچوں کے ساتھ خوب کھیلتا چنانچہ رقص کی زبان سے ایک جگہ کہتا ہے کہ ”مجھے یہاں کے سب لوگ خاصہ کچھ بخوبی جان گئے ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ ان حالات میں گوٹے شارلٹ کے دل میں اپنی محبت استوار کرنا چاہتا تھا مگر شارلٹ کیسٹر کی منسوب ہونے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتی تھی اور وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس سے کسی قسم کی غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

کیسٹر اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ گوٹے کو یہ معلوم کرنے میں زیادہ دن نہیں گئے کہ لائٹن اُس کی محض دوست ہو سکتی ہے۔ لائٹن کا بڑا گوٹے کے ساتھ نہایت عمدہ تھا۔ ہم لوگوں میں خفاق کی یکجہتی اور ان دونوں کے آپس کے میں جول سے ہم لوگ دوست ہو گئے۔ گوٹے حالانکہ لائٹن کی طرف سے مایوس ہو کر دست بردار ہو چکا تھا مگر اپنے جذبات کو باوجود اپنی فلسفہ دانی اور اپنی طبیعت کے فطری وقار کے اچھی طرح نہ دبا سکا۔ اس میں جزا ایسی

خصوصیات ہیں جو حساس اور با مذاق عورتوں کے لئے سخت خطرہ کا باعث ہیں۔ لائشن اُس سے اول ہی روز سے ایسا برتاؤ کرتی جس سے گوسٹے کے دل میں کسی قسم کی نازیبا امید پیدا ہونے کا نہ تو کوئی امکان ہوا ورنہ دوستانہ رویہ میں کوئی فرق آئے مگر گوسٹے کا دماغی سکون اور دلی اطمینان اتنے ہی میں خست ہو گیا بعض وقت تو ایسے مواقع بھی پیش آئے جس نے مجھے لائشن کو بے اختیار سہانے پر محبوب کر دیا، اور جس سے اُس کی محبت میرے دل میں ادھر بڑھ گئی....

مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہونا تھا کہ محبت بھی کیا بلا ہوتی ہے جو ایسے بھلے جنگے اور ضبط نفس والوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ کبھی مجھے یہ خیال ہوتا کہ میں لائشن کو اتنا خوش نہیں رکھ سکتا جتنا گوسٹے رکھ سکے گا لیکن پھر اُس کے چھوڑنے کے خیال تک کو گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کشاکش میں بھی کبھی خیال کا میاب رہتا مگر میں لائشن میں اس کشاکش کا ذرا سا شبہ تک نہیں دیکھتا تھا۔ ایک دفع گوسٹے اور لائشن میں بوس و کنار کی بھی نوبت آئی تھی جس کو لائشن نے فی الفور کیسٹرن سے کہہ دیا مگر کیسٹرن نے چھوڑے سے انطمانا راہنگی کے بعد اُسکو درگزر کیا۔ دوسرے روز لائشن نے گوسٹے کو نہایت نرمی سے اُسکی بے اعتدالیوں پر نصیحت کی۔ گوسٹے کی اس دلانہ محبت سے گوسٹے اور کیسٹرن کے درمیان کوئی رقابت کا جذبہ نہیں پیدا ہوا لائشن فرات کی وجہ سے دونوں کی دوستی بدستور جاری رہی۔ البتہ یہ معاملہ اس لحاظ سے ذرا نازک تھا کہ کیسٹرن ابھی باقاعدہ رشتہ مناکحت میں منسلک نہیں ہوا تھا اور اس گونگو کے عالم میں اس کو نتیجہ کی طرف سے ضرور اندیشہ ہوتا چاہئے تھا۔ ۲۸ اگست کو اتفاق سے کیسٹرن اور گوسٹے دونوں کی سالگرہ تھی۔ اُس دن کیسٹرن نے گوسٹے کے پاس ہومر مؤلفہ دیٹائن کا ایک نسخہ تحفہ بھیجا جس کا ذکر وہ تقریباً موجود ہے۔

آخر کار جب عشق کی آگ بہت بھڑکی اور گوسٹے ڈرا کر اسے شعلے کہیں کیسٹرن اور لائشن کو نقصان نہ پہنچ جائے تو وہ یکایک دیزلر سے کسی سے ملے بغیر چلا آیا۔ آنے سے ایک روز قبل باتوں باتوں میں حیات بعد المات کا ذکر لائشن سے چھڑ گیا۔ پھر لائشن نے اسی سلسلہ میں اپنی والدہ کی موت کا حال بیان کیا۔ یہ سارا ماجرا گوسٹے کے سوال و جواب کے ٹھیک اُسی روز کی تاریخ میں یعنی ۱۰ ستمبر کے خط میں ”در بھر“ میں درج ہے۔ لائشن سے آخری بار ملکر گوسٹے گھر آیا اور اس نے ایک خط کیسٹرن کو اور ایک لائشن کو لکھا جو اُس کی روانگی کے بعد دیا جانے والا تھا۔ کیسٹرن کے خط میں لکھا ہے کہ ”وہ چلا گیا اور جب یہ خط تم کو ملے گا تو وہ جاچکا ہوگا۔ لائشن کو ساتھ والا خط دیدینا میری طبیعت میں سکون تھا لیکن تمہاری گفتگو سے تو میرا دل دو نیم ہو گیا۔ اس وقت میں تم سے سواے الوداع کے اور کیا کہوں اگر تمہارے ساتھ درادیر اور رہتا تو میں اپنے کو بالکل نہ سنبھال سکتا۔ اس وقت میں بالکل تنہا ہوں اور کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ لائشن والے خط میں تھا کہ ”تمہاری گفتگو سن کر میرا دل بھر آیا خاص کر جب میں سوچتا تھا کہ تم سے آخری بار مل رہا ہوں....“ آخر کون سی بات تھی جس سے تم ایسے مسئلہ پر گفتگو کرنے لگیں تھیں؟ لیکن اس سے

مجھے اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا... اے وہ تمنا لکھو، اب میں وہاں نہیں جاؤں گا، تمہارے ابا جان مجھے دروازہ کھکھچانے آئے تھے۔ میں اس وقت تنہا ہوں اور رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن تمہیں مسرور اور خوش باش چھوڑ کر جانا ہوں... میں تم سے پھر ملوں گا۔ لیکن کل نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی نہیں۔ بچوں سے کہنا کہ وہ چلا گیا، اب اس سے زیادہ کہنے کی تاب نہیں، دوسرے روز صبح کو چلتے وقت اُس نے لاشن کو ایک خط اور لکھا اور پھر وزیر میں چلا رہا ہے کہ بعد کی شہزاد لاشن دفن سے جدا ہو گیا۔ رات کی کے دن اور اُس سے ایک روز قبل کا حال کیسٹر کے روزنامے سے معلوم ہوتا ہے:-

”اے ستمبر ۱۸۸۷ء۔ آج ڈاکٹر گوٹے نے میرے ساتھ باغ میں کھانا کھایا۔ شام کو وہ مجھ سے ملے آئے۔ وہ لاشن اور ہم تینوں حیات بعد المات پر بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو لاشن نے شروع کی تھی۔ بعد کو ہم لوگوں میں طے ہوا کہ جو ہم میں سے پہلے اس دنیا سے کوچ کرے وہ اپنے بقیہ دوستوں کے پاس اپنی نئی زندگی کی خبر بھیجے۔ گوٹے بہت افسردہ دل تھا کیونکہ اس نے دوسرے روز جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔“

اے ستمبر ۱۸۸۷ء۔ آج صبح گوٹے بغیر ہم لوگوں سے ملے چلا گیا۔ چلتے وقت اُس نے ایک خط مع چند کتابوں کے بھیجا۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ ایک دن اسی طرح چلا جائیگا لیکن اس کے باوجود مجھے یقین نہ آتا تھا۔ اُس کے اس فعل سے مجھے کافی روحانی تکلیف ہوئی... ہر بچہ کی زبان پر یہی تھا کہ ڈاکٹر گوٹے چلے گئے... گوٹے بہت افسردہ دلی کی حالت میں گیا ہے... شام کو ۵ اُس کا خط میں ملنے لاشن کو دیا۔ وہ بھی گوٹے کے چلے جانے سے رنجیدہ ہوئی اور خط پڑھتے پڑھتے تو آنسوؤں کے بے اختیار قطرے اُس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ مگر وہ ایک طرح سے مطمئن تھی کیونکہ وہ گوٹے کی مرضی کے مطابق عمل نہیں کر سکتی تھی...“

گوٹے لوٹ کر فرینکفورٹ آیا تو عشق کی ایک زندہ داستان بن کر آیا مگر دوست احباب کے بیکاری کے طے اور فشارِ دل کی جہاں کے غم نے ایک سوہان روح پیدا کر دیا تھا۔ اسی عالم میں وہ نقاشی اور مصوری کی طرف پھر رجوع ہوا تاکہ طبیعت کسی طرح گنگ جائے کبھی کبھی سیر و تفریح بھی کرتا اور بعد کو تو ان مشغلوں میں اتنا منہمک ہوا کہ ادب کو بالکل بھلا بیٹھا البتہ جون شٹلے، میں اپنے دوست مرک کے مشورہ سے اُس نے گوٹس شالیع کیا گوٹس شالیع ہونے کے بعد وزیر لڑکی زندگی کی یاد اُس کو رہ کر ستاتی۔ اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے اُس نے ارادہ کیا کہ لڑکے کے حالات ایک قصہ کے پیرایہ میں لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ تھوڑے دنوں بعد اُس نے اپنی مشہور تصنیف ”نوجوان و فقیر کی داستان غم“ شالیع کی جس میں تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد اُس نے اپنے وزیر لڑکے فرصت کے

دلوں کی تصویر کھینچی ہے۔ ”درتھر“ ہی ہمارا موضوع بحث اس لئے اُس پر تفصیل کے ساتھ ہم آگے چلا کر لکھیں گے۔

”درتھر“ شایع ہونے کے بعد گوئے دیناے ادب کی ایک نہایت ممتاز و معروف شخصیت کا مالک ہو گیا۔ بڑے بڑے نامور اہل قلم در دور سے ”درتھر“ کے مصنف سے ملنے آئے اور اُس کی خدا داد قابلیت کا بلا اعتراض کرتے اُس کا مکمل پرستار ادب کا مروج بن گیا۔ گوئے جس زمینی میں اور ”درتھر“ لے یورپ میں ایک دھوم مچادی۔ یہ زمانہ گوئے ہی انتہائی شہرت کا زمانہ تھا اور اُس زمانہ میں اُس کی طبیعت میں بلا کا جوش اور غضب کی روانی پیدا ہو گئی تھی۔ خیالات کا طوفان اتنا اُٹا کہ قلم اس باگراں کا متحمل نہ ہو سکا تاہم اُس نے نفردلظم و دونوں لکھی اور بہت لکھی۔

مئی ۱۸۷۷ء میں اُس کا ڈرامہ کلاویگو شایع ہوا جس کو اُس نے چند گھنٹوں میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ کلاویگو ایک نوجوان ہے جو اپنے مقاصد کی خاطر اپنی محبوبہ میری سے جو کسی سینہ کے مرض میں مبتلا ہے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے مگر میری اس کی علیحدگی پر اُس سے اور زیادہ محبت کرنے لگتی ہے۔ آخر میری انتقال کرتی ہے اور کلاویگو اُس کے جنازے پر حجاز دیتا ہے۔ کلاویگو گوئے اور فریڈریک کی محبت کا ایک ادبی پردہ ہے جس کی اُڑ میں گوئے خود اپنا درد دل سناتا ہے اور اپنی بے پروائی اور بے رخی پر افسوس کر کے کلاویگو کو موت کے منہ میں لے جاتا ہے یہ ڈرامہ اس لحاظ سے اہم کہا جاسکتا ہے کہ اس میں ”طوفان و بیجاں“ کے دور کی خصوصیات کا اظہار بہت کم ہے۔

گوئے نورسیمی فلسفہ سے طبعی نفرت تھی مگر ۱۸۷۷ء اس لحاظ سے اُس کے ردِ حافی ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے کہ اس نے اُس سال مشہور ہودئی فلسفی اسپنوزا کی ”اخلاقیات کا مطالعہ کیا اور اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ اُس کے پڑھنے سے کائنات اور علم اخلاق کے متعلق میری معلومات میں صفائی اور وسعت آنے لگی لیکن اس کی جو چیز مجھے نہایت پسند آئی وہ اُس کی غیبِ جذبہ داری تھی۔ کیا خوب کتاب ہے کہ جو خدا سے سچی محبت کرتا ہے اس کو پھر اس بات کا خیال چھوڑ دینا چاہئے کہ خدا بھی اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟ اسپنوزا کے اس فقرہ نے گوئے پر گویا جادو کا اثر کیا اور وہ اس کا ہمیشہ کے لئے عقیدہ مند ہو گیا۔ عرض یہ سال پڑھنے لکھنے، ملنے ملانے میں گذر ہاتھا کہ اردسمبر کو دائرہ کے دو شاہزادے اُس کی ادبی شہرت سن کر ملنے آئے اور ان میں بڑا کارل آگسٹ تو گوئے کا اتنا گرویدہ ہو گیا کہ اُس نے اس کو دائرہ آنے کی دعوت بھی دیدی۔ مگر گوئے کسی وجہ سے فوراً دائرہ جاسکا۔ فریڈکفورٹ کے قیام کا آخری زمانہ ہے کہ نئے سال کے دن ایک دوست کی وساطت سے گوئے ایک مالدار اور باکسار کی بیوہ فراڈشون من کے یہاں مدعو ہوا۔ اُس کے چار لڑکے اور ۱۱ سال کی ایک خوبصورت لڑکی الینر بیٹھ تھی جو لیلی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ دعوت ایک رقص کے سلسلے میں ہوئی تھی جس میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ گوئے رجب پہنچا تو لیلی پیانو بجا رہی تھی۔ گوئے کو طبعاً موسیقی سے کچھ پسند تھی اس لئے وہ پیانو کے پاس بیٹھ کر نمبر سے لطف اٹھانے لگا

مگر تھوڑی دیر کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ لیلیٰ کی ہر اٹھلی بجائے پیانو کے اُس کے ساز دل کو چھڑ رہی ہے۔ پیانو بجا کر لیلیٰ اٹھی تو گونٹے کا دل اپنی مٹھی میں لے کر اٹھی۔ گونٹے اُس پر ہزار جان سے عاشق اور اُس کی بیقراری اتنی طبعی کہ دینر کے زمانہ کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ لیلیٰ کی چشم مست کے پیچھے گونٹے اپنا سارا عیش و آرام بھول گیا۔ لیلیٰ ایک مہذب اور تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ گونٹے کو اُس کی آغوش کی پراکثر تسلی دیتی مگر جلد تشہ آزار تھا۔ اہلکلا سستی لیلیٰ کا گھر بالکل امیرانہ تھا۔ جہاں گونٹے کی قدیم شاعر نہیں بلکہ مثل ایک مشہور آدمی کے ہوتے گونٹے کو یہ فضا بالکل ناپسند آئی مگر کیا کرتا لیلیٰ کی نیم نگاہی نے جبر کو اختیار میں بدل لیا۔ آخر باوجود سخت خاندانی اختلاف کے گونٹے کی لیلیٰ سے نسبت بھی ہو گئی مگر نسبت کے بعد گونٹے کی پھر وہی آزادی کی لہر اٹھتی ہے اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ موقع کا انتظار ہے کہ اُس کے چند دوست اُس کو سوئٹزر لینڈ چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی دعوت پر گونٹے بغیر لیلیٰ سے ملے چل نکلتا ہے اور اسٹرک برگ سینسٹام ہوتا ہوا سوئٹزر لینڈ جاتا ہے۔ جانے کو تو وہ چلا گیا مگر اس بیباں نوردی میں زنداں کا خیال اس کو برابر پریشان کرتا رہا۔ جب وطن واپس آیا تو پھر وہی بے رخی کی کیفیت غالب آئی۔ فہرہ نیکفورٹ میں کچھ دن رہتا ہوا تو اُس نے اپنی اور لیلیٰ کی محبت اور پھر اپنی "بیدلی" کی داستان دوسرے ڈرامہ اسٹیلان لکھ ڈالی۔ اُسی زمانہ میں "نغمہ محمد" کے نام سے ایک اور ڈرامہ لکھنا شروع کیا۔ اس کا خاکہ کئی سال سے دماغ میں تھا مگر پورا نہ ہو سکا۔ اس ڈرامہ میں تبلیغ اسلام، رسول اللہ کے غزوات، اسلامی حکومت کا قیام اور پھر رسول اللہ کی رحلت وغیرہ دکھانے کا خیال تھا جس میں پیغمبر صاحب کی سیر نکالنا اور ان کو پہلو نظر آئے مگر کچھ دنوں لکھنے کے بعد اُس کی طبیعت کا رخ دوسری طرف پھر گیا جس سے یہ ڈرامہ پورا نہ ہو سکا۔ اکتوبر میں کارل گسٹ جواب وائمر کا ڈیوک ہو گیا تھا۔ پھر فریڈرک فورٹ آیا اور اُس نے اس دفعہ بھی گونٹے کو وائمر آنے کی دعوت دی۔ ابکی گونٹے نے سامان سفر تیار کیا اور وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر وائمر میں وائمر پہنچ گیا۔ یہاں اُس کی زندگی کا پہلا دور ختم ہوتا ہے اور دوسرا شروع ہوتا ہے۔ اب تک وہ صرف ایک نوجوان و نامور ادیب تھا۔ اُس کے خیالات جوش کی وجہ سے تختے نہیں تھے مگر وائمر کی ذمہ دارانہ زندگی نے اُس کے خیالات میں ہر طرح سے تبدیلی پیدا کر دی اور اُس کے جوش کو ایک راستہ پر لگا دیا۔

وائمر وسط جرمنی میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ آبادی زیادہ تر کسانوں پر مشتمل تھی۔ صنعت و حرفت اُس زمانہ میں اول تو تھی ہی نہیں اور اگر کچھ تھی بھی تو وائمر اُس کے لحاظ سے بھی معمولی ریاست تھی۔ البتہ نوجوان ڈیوک کو فنون لطیفہ کا بڑا شوق تھا۔ وہ شاعری اور مصوری کی دل سے قدر کرتا اور فنون لطیفہ کے ماہرین کی امداد کرتا چو نکہ وہ طبعاً آزادی پسند تھا اس لئے پُرانی اور پوشیدہ روایات اور وضع و قطع کی پابندیوں میں رہ کر

زندگی گزارنا اُس کے لئے سخت مشکل ہو گیا۔ وہ بہت سے پُرانے طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر آزادی برتا۔ وہ اپنی چینی حیثیت کے قید خانہ میں بند ہونے کے بجائے چمن زندگی کی گل چینی کی خواہش کرتا۔ ساتھ ہی اُس کو آدمی پہچاننے کا بڑا ملکہ تھا۔ وہ حکومت کے اداروں میں بہترین آدمی جن کر رکھتا اور ہر شخص کے لائق کام عطا کرتا۔ اپنی ان چند خصوصیتوں سے اُس نے بہت جلد دائرہ علم ادب و فنون لطیفہ کا مرکز بنا دیا جسکی شعاعیں تمام ملک پر پڑنے لگیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب گوٹے نے دائرہ میں قدم رکھا تو اُس کے خیالات میں تبدیلی شروع ہو گئی تھی۔ طوفان دیہان کا وہ عملی جوش اب اُس کی تحریروں میں نہیں۔ درحقیقت اس تحریک کا انفعالی اثر ہے اور لاویگور تہم کہ چہ گو اس کی تحریروں میں اس تحریک کا جوش سر دہرا رہا تھا مگر عملی زندگی میں گوٹے اب بھی سرایا طوفان دیہان تھا۔ اس کی صحبت میں نوجوان ڈیوک کی آشنائی اور آزادی جنوں تک پہنچ گئی۔ شیشہ عقل و خرد پر جتنی ضربیں پڑ سکتی تھیں پڑیں اور ہوسناکی کے جتنے جام بھرے جاسکتے تھے بے تکلف بھرے گئے۔ گوٹے ڈیوک کی بزم عشرت میں برابر کا شریک رہا لیکن ڈیوک کی طرح وہ اس محفل میں تمام کار نہ تھا۔ اُنکی کھلی ہوئی تھیں اور وہ ریاست کا ہر شیب و فرزند دیکھ رہا تھا کبھی وہ ڈیوک سے ہوش کی باتیں کرتا اور افسانوں اور قصوں کی آڑ میں اسکی سرستوں کے نتائج کی طرف اشارہ کرتا۔ آخر اس قسم کے افسانوں کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اثر ڈالکر وہ ڈیوک کو سیدھے راستہ پر لایا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈیوک نے گوٹے کو منصب وزارت سے سرفراز کیا۔

ابھی گوٹے کو دائرہ آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پھر اُسکا شوق ”اسیری“ تیز ہوا اور اتنا تیز ہوا کہ بہت جلد زندان محبت کا ایک بے دست و پا اسیر ہو گیا۔ فرڈفان اسٹائن ایک شادی شدہ معرورت تھی جو گوٹے سے سات سال بڑی تھی اور سات بچوں کی ماں تھی۔ گوٹے اول اول فرڈفان اسٹائن کی تصویر دیکھ کر اُس سے غائبانہ محبت کرنے لگا اور جب دائرہ آیا تو اُس کو دیکھ کر اُس کے تخیل میں اور بھی جوش پیدا ہوا۔ فرڈفان اسٹائن کا شوہر دربار میں کسی عہدہ پر ملازم تھا، آزاد مزاج اور بے پروا تھا۔ ہفتہ میں شاید ایک یا دو بار گھر آتا ہو۔ اپنے شوہر کی اس لاابالی زندگی سے فرڈفان اسٹائن زیادہ تر تنہا رہتی۔ گوٹے سے اُس کی ملاقات بہت جلد دوستی میں بدل گئی اس لئے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بد دل ہوتی جاتی تھی۔ گوٹے اس تنہائی اور کس مہر کی عالم میں اس کو کبھی کبھی اپنا افسانہ دل سناتا اور کہتا۔

برآستان امیدت کشادہ ام در چشم کہ یک نظر فگنی چوں فگندی از نظر مگر برسوں گوٹے اور فرڈفان اسٹائن کے تعلقات باوجود گوٹے کی بیچینی کے دوستی سے زیادہ نہ بڑھے آخر گوٹے کی آرزو کے وصال موتوں صدا بہ صحرانابت ہونے کے بعد چوبیس ہویں مارچ ایک دن آیا جب وہ کہہ سکتا تھا کہ

ہم شب برب در خسار و گیسوی زخم بوسہ گل و نسیرین و سفیل را صبا و خرمین است شب
 فراوان اسائن کے دامن حسن سے گونٹے باوجود اپنی فطری سیماں دشمنی کے اس برس تک وابستہ رہا اور صحت منقیا زندگی
 گزارا تا رہا یہ امر ضرور باعث تعجب ہے کہ آخر گونٹے کو ایسی ”پختہ“ ہستی سے کیوں محبت ہو گئی؟ وہ ہاتھ جو کبھی
 چمن میں گلاب کی نازک پنکھڑیوں کی تلاش کرتا تھا اب کیوں ایک مرجھائے ہوئے پھول پر صرف اکتفا کرتا ہے
 بلکہ اُس کو برا کر خوش ہوتا ہے۔ فراوان اسائن نہ تو جوان تھی اور نہ تندرست اور نہ آغاز شباب میں اتنی حسین ہی تھی
 جو کہہ سکتی کہ

جس کی ہمار وہ ہو پھر اُس کی خزان نہ پوچھ

بات یہ ہے کہ گونٹے کی طبیعت ایک مہمہ زار تھی ہم بتا چکے ہیں کہ اُس میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی کافی طاقت
 موجود تھی۔ وہ اپنے خیالات کو ہمیشہ گہرا بیدار کی طرح دریا کی تہ میں رکھتا اور جذبات کے طوفان کو اس طرح چھپا جاتا کہ
 سطح پر ایک موج بھی نہ دکھائی دیتی یعنی دل اگر ”محیط گریہ“ ہوتا تو نہ لب آشنا سے خدہ ہوتے۔ وہ لوگوں سے
 یہ گمانہ دار اس طرح تھا کہ اس کی اندرونی کیفیتوں کا راز نہ کم لوگوں کو معلوم ہوتا لیکن فراوان اسائن کی پختہ بخیر
 نظر نے تھوڑے ہی دنوں میں گونٹے کی ساری قلبی بیچینیوں کا پتہ چلا لیا اور اس کی سیرت کے ہر پہلو سے واقف ہو گئی
 گویا اُس نے اس خزانے کا حال جس کو گونٹے لوگوں کی نظروں سے بچا بچا کر رکھتا تھا معلوم کر لیا۔ گونٹے اب فراوان
 اسائن کا بندہ بے زرتھلا رہ گیا گونٹے کی روحانی زندگی کا ایک زبردست بازو بن گئی اور گونٹے کے تمام معاملات
 میں مشورہ دیتی۔ گونٹے اس سے فلسفہ و ہیئت، سائنس و مذہب، تاریخ و جغرافیہ، غرض ہر قسم کے بحث پر گفتگو کرتا
 اس غیر معمولی روحانی اختلاط سے اُس کے دل کی پوشیدہ قوتیں برے کاٹنے لگیں۔ اس زمانہ کی اپنی ایک نظم میں لکھا ہے کہ

”تو میری ہستی کی راز دار بن گئی اور تو نے میری پھر کتنی ہوئی گہ پہچان لی

تجہ میں وہ قوت تھی جس سے تو اس گہرائی تک پہنچ گئی جس سے انسان اب تک بے خبر تھا

تو نے میری زیادتیوں میں اعتدال پیدا کر دیا اور میری ہیبتناں اور بے ہمار خواہشوں کو روک دیا

تیری آغوش میں میرے دھڑکتے ہوئے سینہ کو سکون ملا“

فراوان اسائن کا یہ اثر ہوا کہ گونٹے اُس کو فطرت کی شان جمالی کا مظہر اور اپنی اخلاقی ترقی کا بلند ترین
 نصب العین سمجھنے لگا۔ ہمیں سے اُس کی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خارجی ماحول اور اندرونی کیفیات کی
 ہم آہنگی کی بنا پڑتی ہے۔ طوفان دیحان کے پھلے دور میں جو سراسر احساسات کا حامل تھا۔ اب خارجیت ”بھی“ شامل ہو گئی
 گونٹے نہ صرف شاعر تھا بلکہ ایک کامیاب وزیر اور ایک ماہر سائنس بھی تھا۔ ٹھوڑے دنوں میں اپنی محنت

اور تندی سے وہ سلطنت کا دست راست اور ڈپوک کا مشیر خاص بن گیا۔ ڈپوک پر اُس کا اتنا اثر ہو گیا تھا کہ وہ ہر جگہ کے نظم و نسق میں اس سے مشورہ کرتا۔ بہت سے محکموں میں تو خود گوسٹے نے کامیاب اصلاحیں جاری کیں مثلاً محکمہ ایالتی و محکمہ برید میں اس کی اصلاحات سے سلطنت کو خاصا فائدہ ہوا۔ پھر تجارت اور زراعت کو فروغ دینے میں اُس کی کوششیں نہایت بار آور ہوئیں۔ وزارت کے زمانہ میں اُس کو کان کنی، علم نباتات اور سائنس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی علم نباتات پر تو اُس نے اپنی تحقیقات کو جمع کر کے ایک رسالہ بھی لکھا جس میں ابتدائی نشوونما کی حالت میں پودوں کے تخریفات کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ نباتات کے علاوہ طبیعیات بھی اُس کی ممنون احسان ہے۔ سائنس کی تاریخ میں آج بھی اُس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ریاست کے کاروبار میں الجھنے اور کچھ سائنس میں دلچسپی پیدا ہوجانے سے گوسٹے کی شاعرانہ قوت میں کمی آگئی یعنی وہ شخص جو قلم پر اتنی قدرت رکھتا تھا کہ ایک نشست میں ایک تصنیف ختم کر دے آج ٹھوڑے سے اشعار سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور شاعر کی یہ بیکاری ہکوئی آٹھ دس دن نہیں بلکہ دس برس قائم رہی البتہ شاعری کے زمانہ میں اُس نے دودھ لے لکھے۔ ایک ڈرامہ تو ایگمانٹ ہے جس کا خاکہ فریڈکفورٹ میں تیار ہو چکا تھا اور جس کے آخری صفحات اٹالیہ میں ختم ہوئے۔ فریڈکفورٹ کے انٹر سے اُس میں وہی پرانے خیالات کا نقشہ ہے یعنی ایگمانٹ ایک نوجوان ہے جو ایک لڑکی کا شوق سے محبت کرتا ہے اور محبت میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ اس رستہ کے معمولی معمولی پیچ و خم سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ آخر اسی سلسلہ میں کسی جرم میں گرفتار ہو کر آتا ہے اور پھانسی پر لٹا دیا جاتا ہے حالانکہ اگر وہ چاہتا تو آسانی سے بھاگ سکتا تھا لیکن شاید وہ ایسا قیدی تھا کہ اگر رہائی بھی پاتا تو پھر جاکر دام میں پھنسا۔ اس کے کچھ دنوں بعد اس کا دوسرا ڈرامہ لڑکی گیتی تیار ہوا جس میں دائرہ کے اثرات ہیں۔ یہ ایک یونانی نغمہ ہے جس کو اُس نے اپنے خیالات کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ جوانی کے جوش میں بیشتر حاکت پوشیدہ ہوتی ہے اور زندگی کا بہترین لطف ہم کو بندریج زمانہ کے ساتھ مل سکتا ہے۔ انتظار کرنا ہمارا کام ہے اور عطا کرنا عالم بالا کا۔

پھر دائرہ کی اس خاموشی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ پہلے وہ سرتاپا جوش تھا مگر اب وہ اس جوش و خروش کے نتیجہ کی تلاش کرتا ہے اور کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں جو اُس کو جذبات کے سمندر میں تنگے کی طرح بے دست دبا چھوڑ دے۔ وہ احساس کو اب شبہ کی نظروں سے دیکھتا تو ضرور ہے مگر اس کو دبانے اور اُس سے کوئی کام لینے کے متعلق ابھی تک اُس کے دماغ میں کوئی خاص نقشہ نہیں آیا ہے۔ یہ زمانہ اُس کی روحانی کشاکش کا ہے ایک طرف جذبات پرنا زور رکھتے ہیں اور دوسری طرف عقل حکمت پسندانہ کو دبانے کا مشورہ دیتی ہے۔ اس کشاکش کی وجہ سے وہ میدان شاعری میں کوئی تھم نہ بڑھاسکا۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اُس کے لئے یہ بہت آسان بھٹاکہ

اس کشاکش کا اپنی شاعری میں ذکر کرتا لیکن یہ سوال اُس کی فطرت سے لاعلمی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ گوئے
 ہمیشہ شک سے گریزاں رہا وہ کسی ایسی چیز کے اظہار کے لئے کبھی تیار نہیں تھا جس میں مشابہ کے دونوں پہلو الگ الگ پیش کئے گئے
 ہوں یہی وجہ ہے کہ وہ دس سال تک شاعری سے بالکل بیگانہ رہ کر سوچتا تھا کہ کس طرح دریائے زندگی کے بہاؤ کو کارآمد
 و مفید مطلب بنایا جاسکتا ہے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ طوفان و مہجانب کے دور میں اُس کے خیالات اور
 متاعل زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا اپنی شاعری اور زندگی دونوں ہم معنی الفاظ تھے مگر دائر میں رہتے رہتے وہ طوفان
 و مہجانب سے بالکل علیحدہ ہو کر زندگی اور مقصد زندگی پر غور کرتا ہے۔ اس کی روح پھر کسی جستجو میں محو ہے۔ اس کے
 خیالات کسی مرکز پر جمتے نہیں۔ آگے جانے کی تلاش ہے مگر کوئی ماہ نامیں لٹاتا تو اس میں فراڈ خان اسٹائن سے بھی وہ
 کچھ الگ تھلگ رہنے لگا تھا کیونکہ اُس کا شوہر اپنی بیوی اور گوئے کے تعلقات کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔
 اس ذہنی کشاکش میں اُس کی صحت خراب ہو گئی اور وہ جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی صحت کی خاطر کسی ملک کے
 سفر کا قصد کرنے لگا۔ اطالیہ سے اُس کو بچپن سے دلچسپی تھی۔ باپ کے اثر سے وہ ہمیشہ اس ملک کو دیکھنے کا شوق رکھتا
 تھا مگر وہ دفعہ سوئٹزرلینڈ تک جا کر واپس آیا۔ ابکی اطالیہ کا شوق کچھ اس طرح پیدا ہوا کہ وہ بغیر کسی کو اطلاع دیتے
 ہوئے چل کھڑا ہوا اور اس خوف سے اتنی جلدی جلدی منزلیں طے کرتا گیا کہ کہیں ڈیوٹک آدمی بھیج کر واپس نہ بلا لے۔
 ستمبر میں جب گوئے اطالیہ پہنچا تو اُس کو وہاں بالکل دوسری دنیا نظر آئی۔ وہاں کی آب و ہوا دائر کے
 مقابل میں زیادہ آزاد اور فرحت افزا معلوم ہوئی۔ اطالیہ میں گوئے کوئی دور سس رہا اور اس عرصہ میں وہ روکے
 علاوہ تمام مشہور مقامات کی سیر کرتا رہا۔ اطالیہ کی آزادانہ زندگی میں اُس نے لطف و تفریح کے کچھ ایسے مناظر دیکھے کہ
 اُس کو بے اختیار اپنے عہد شباب کی ابتدائی منازل یاد آ گئیں اور گوہر بقرار ہو کر اُس نے بھی اس نوجوان بخودی سے
 مسرت و انبساط کے جام پر جام بھرے لیکن انگلیں اس حسن کی تلاش میں برابر مصروف رہیں جو انسانی زندگی کو حقیقت
 کا راستہ بتاتے اور انسان کی اندرونی کاوشوں کو سکون سے بدل دے۔

اطالیہ میں اُس نے قدیم کلاسیکی تمدن کے آثار، مجسمے، نقوشیں، عمارتیں وغیرہ دیکھیں اور اُن کو دیکھ کر
 اُس کو پہلی بار معلوم ہوا کہ انسان کی لا ا بالانہ زندگی کی تولدوں کو اور غیر ذمہ دارانہ جوش و خروش کے طوفان کو کس
 طرح تمدن کے وسیع میدان میں لگا کر زندگی میں نظم و ترتیب ہم آہنگی و حسن پیدا کیا جاسکتا ہے یعنی فو کے عمل و
 احساس کیا تھوکر تمدن و معاشرت کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے اُس کے لئے اب جماعت اور فرد کی کشاکش
 بے معنی چیز بن چکی تھی ان میں باہمی ترکیب دے کر زندگی کو مسرت کا جوا لگا لگا بنانا ضروری ہے۔

اُس نے سارے اطالیہ کا سفر تو ضرور کیا مگر نشاۃ ثانیہ کے دور میں اطالیہ نے فنون لطیفہ میں جو حیرت انگیز

ترقی کی تھی گوئیے اس سے بالکل بے خبری کے عالم میں گذرا البتہ ایمیکل انجیلو کا نام درودِ اولیٰ الٰہی کا تقاضی کے سلسلہ میں لیتا ہے جس سے قدیم رومی افغان تھے گو وہ اپنی کلاسیکی تلاش و جستجو کی پیاس بجھانے آیا تھا اور ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھتا تھا اطالیہ کے سفر سے اس کی روحانی اور دماغی زندگی میں مطابقت شروع ہو جاتی ہے۔ اور احساس کے طوفان کو وہ عقل کے پستوں سے قابو میں لانے کی بنا ڈالتا ہے یعنی وہ زندگی کے داخلی اور خارجی پہلو کو ہم آہنگ بنانے کا راز دریافت کر لیتا ہے جو اس کا سب سے بڑا کا نام ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں سے میری بالکل نئی زندگی شروع ہوتی ہے اب میں ہر چیز کو کل کی حیثیت سے دیکھتا ہوں۔ حالانکہ پہلے میری نظر میں صرف جزو تھا.... جس دن میں روم میں داخل ہوا اُس دن کو میں اپنی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ مجھے جذبات کے مودی احمد زکر کر دینے والے مرض سے نجات ملی۔ اگر میں اپنے ارادہ میں ثابت قدم نہ ہوتا تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا اور کسی چیز کے حاصل کرنے کے لائق نہ ہوتا۔ ہر ڈرے گوئیے کے خیالات میں جس انقلاب کی بنا ڈالی تھی اطالیہ کا سفر اس کا ایک کامیاب مقدمہ ثابت ہوا اگر یہ نتیجہ نہ برآمد ہوتا تو شاید گوئیے کی زندگی دوسرے رومانی شعرا کی طرح اٹل بے چوڑ ہو کر رہ جاتی۔ اطالیہ جاتے وقت گوئیے کی روح اور جسم دونوں بیمار تھے لیکن وہاں کے دو سال کے قیام نے دونوں کو تندرست بنا دیا۔ وہاں اپنی گذشتہ زندگی پر بالکل خارجی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے اور آئندہ کے لئے منصوبے سوچتا ہے۔ اطالیہ میں اُس نے ایک غنائی ڈراما سولکنا شروع کیا جس میں عہد جدید کے ایک حساس و نازک دل شاعر کی داستان ہے جو دنیا کے سرد و گرم میں گرفتار ہو کر زندگی سے تنگ آ جاتا ہے۔ اس ڈرامہ میں گوئیے نے کلاسیکی ہم آہنگی کا خیال رکھا ہے۔

اطالیہ سے گوئیے لوٹا تو نئے نئے خیالات اور بلند عزائم ساتھ لایا اور دائرہ پھیلا تو ہر چیز بے کیف معلوم ہوتی۔ دوستوں میں اس کا عجیب گہرا تسلط کے کاروبار سے اُس کو تکلیف سی ہونے لگی۔ اس حالت کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ میں صورت دار اطالیہ سے بے صورت جرمنی میں لوٹ آیا.... میرے دوست بجائے مجھے تسلی دینے اور مجھے اپنی طرف راغب کرنے کے مجھ سے بدل ہو کر مالوس ہو گئے۔ قدیم زمانے کی چیزوں سے میری دلچسپی، میری علالت اور میری گم شدہ چیزوں پر میرے افسوس سے ان کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ افسوس میری زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ ان خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کی دنیا سے وہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ اس کی بات کوئی نہیں سمجھتا۔ ٹھوڑے دنوں کے بعد وہ لوگوں سے بے رخی برتتے لگا اور اس پر لوگ اُسے مغرور کہتے۔ کوئی چہ برس تک وہ اسی طرح کی زندگی گزارتا رہا۔ ڈیوک نے اُس کی یہ حالت دیکھ کر اُس کو سلطنت کے بہت سے کاموں سے سبکدش بھی کر دیا گو درپردہ وہ تمام مشوروں میں شریک رہتا۔ ۱۹۱۱ء میں جب ڈیوک نے ایک سرکاری

تھیں مگر لاگو نہ ہوئے۔ اسکا نگراں مقرر ہوا مگر سچ پوچھنے تو اسکا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ دنیا میں کوئی ایسا محرم نہ رہا جو اسکا درد نہ جان سکا۔ فرزدخان اسٹائن سے رومہ کے سفر سے پہلے ہی کشیدگی شروع ہو گئی تھی جو بعد کو اتنی بڑھی کہ علیحدگی ہو گئی۔ اس پر گھوٹے کے بعض دوستوں کو تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا مگر یہ اُسکی فطرت کا تقاضا تھا جو اُس کو ایک مرکز پر غمر نے نہ دیتا تھا۔

اس زمانہ میں زیادہ تر وہ ناکھڑیں پڑا رہتا بہت کم لوگوں سے ملتا ایک روز جب سیر کو باہر جا رہا تھا تو راستہ میں اُس کو ایک نوجوان خوش فہم لڑکی ملی جو اپنے بر نصیب بھائی کی سفارش کرنا چاہتی تھی۔ اسکا نام کریمین دلیپوس تھا۔ وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی جس کی بسیرا اوقات کا غذا اور کپڑے کے پھولوں کو نہ کرنا کہیں پہنچے۔ گھوٹے نے جب اُسے دیکھا تو نہ جانے اُس کے جی میں کیا آئی کراس کو گھر لے کر دعوت دیدی۔ وہ گھر آئی تو اُس کو اپنی داخلہ بنا کر رکھ لیا۔ غھوٹے دنوں بعد اُس سے اسکا لڑکا گھٹ گھٹے پیدا ہوا جب گھوٹے نے شادی اور خانہ داری کے رواج کو جس پروان میں برائے نام عمل ہوتا تھا، تو ڈوڈا لا تو تمام حلقوں میں سخت ہنگامہ برپا ہوا مگر گھوٹے نے اس کی کچھ پروا نہ کی کیونکہ وہ رسم سے زیادہ روح کا قائل تھا۔

کریمین دلیپوس نہ تو زیادہ طبعی لکھی تھی اور نہ زیادہ تیز فہمی تھی۔ خط بھی مشکل سے لکھ سکتی تھی۔ مگر گھوٹے اسکی طرف اتنا مائل ہوا کہ اس نے اس کے ساتھ کامل اٹھارہ سال متا بلانہ زندگی گزارنے کے بعد اس سے مستلزمہ میں باقاعدہ شادی کر لی اس شادی پر اس لحاظ سے تعجب نہ ہوتا ہے کہ گھوٹے ایسی آزاد شخصیت رکھنے والا آدمی اتنی مدت تک اس سے بلائے جان میں کیسے گرفتار رہا۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ رہی ہو کہ وہ طوفانِ تیجان کے دور سے گزر چکا تھا۔ عمر بھر کی بے قراری اب شاید سکون کی تلاش تھی مزید بل اُس کے خیالات میں بھی تبدیلی ہو چکی تھی اور وہ فرد کو جماعت سے علیحدہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دائر کے لوگوں سے بد دل تھا اور اس بد دلی کا اظہار اُس نے اپنی اس حرکت سے کیا جو ان لوگوں کی نفاس طبع سے سخت ملتا تھا لیکن خواہ کچھ ہی ہو اس کی بلند دماغی سطح کو دیکھ کر یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی شریک زندگی کو بھی عام لوگوں سے بلند ہونا چاہئے تھا۔ یورپ کے اس عالی دماغ شخص نے ایک معمولی عورت کے ساتھ بھرپور زندگی بسر کرنا کو ہنسی میمیش کیا ہے۔ وہ آج تک کسی کے سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ تاریخ اس قسم کی مثال سے خالی نہیں۔ یورپ کا دوسرا مشہور شخص رومو جو موجودہ سیاسی دور کا بالوالہ اور انقلابِ فرانس کا بانی کہا جاتا ہے اُس کا بھی یہی حال تھا اُس کی شریک زندگی ایک نہایت معمولی دہرہ کی عورت تھی جو کسی طرح میدانِ زندگی میں مجموعی طور سے اُس کی معاونت کی سزاوار نہیں کہی جاسکتی۔ شاید یہ فطرت کے ان رازوں میں سے ایک ہے کہ جبر کا عقدہ کسی عمل نہ ہو سکے گا۔ بہر حال کریمین دلیپوس نے گھوٹے کو گرفتار بنا دیا اور اس میں مکانیت کی پویدا کر دی۔ یہ گھوٹے کے لئے بالکل نئی چیز تھی کیونکہ گھوٹے اب تک خانہ داری کی زندگی سے بالکل بیگانہ تھا۔ گھوٹے کو کبھی دلیپوس کو اپنے باغ کا "لالہ بھرائی" کہتا ہے۔

اس کے غھوٹے دنوں بعد وہ پھر اٹالی چلا گیا۔ مگر اکی ۱۵ جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ واپس آیا تو بالکل خاموش۔ سانس میں جو پچھلی

پیدا ہو گئی تھی اس سائنس میں تحقیقاتیں کرتا کرتا کتابیں پڑھتا اور گھر بیٹھا اسی زمانہ میں فرانس کا مشہور انقلاب رونما ہوا۔ حالانکہ اس عظیم الشان انقلاب سے یورپ کے شعور و عمرانی اپنی جگہ سے دوڑنے لگے تھے مگر گوٹے بالکل متاثر نہیں ہوا بلکہ اپنی طبیعیات کی تحقیقات میں بدستور مصروف رہا۔ وہ انقلاب کو محض ایک ایضی نمائندگی کی نظر سے دیکھتا رہا مگر کسی طرح اس میں شریک نہیں ہوا کسی دوہیں نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ انقلاب کے پہلے فرانس میں جو دروغ و رعیایا کے لئے سخت جانگداز تھا اور اسکا نتیجہ کسی کسی انقلاب کی صورت میں ضرور نمودار ہو گا۔ شاید وہ اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا اور اسی لئے انقلاب سے متاثر نہیں ہوا۔

کچھ ایسی طبیعت کی انفرادی اور کچھ سائنس میں انہماک کی وجہ سے اس کی شاعری پھر معرض التوائیں پر گئی اور شاید یہ دور تولوں تک قائم رہتا اگر اسی زمانہ میں ایک نوخیز فلسفی شاعر سے اس کی ملاقات نہ ہو جاتی تو شکر گوٹے سے دس سال چھوٹا تھا۔ گوٹے کی شاعرانہ طاقت اول اول مشہور ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ یہ ملاقات پانچ چھ سال میں بڑھ کر دوستی میں بدل گئی۔ شکر کی طبیعت فلسفیانہ تھی وہ کائنات کے ساتھ رہ چکا تھا اور اس کے فلسفہ جمال سے متاثر تھا اسی لئے وہ شاعری کی بنیاد فلسفہ پر رکھتا تھا۔ وہ پہلے حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک خیال قائم کر لیتا ہے پھر اس خیال کا ثبوت کائنات کے ذروں میں تلاش کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں کافی جوش ہے مگر اس سکون سے خالی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد حاصل ہو گا۔ مگر خلاف اس کے گوٹے فلسفی نہیں بلکہ شاعر ہے اور اس کی شاعرانہ پرواز اتنی بلند ہے کہ فلسفہ وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس کی حقیقت آشنا طبیعت بغیر کسی خیال کے کائنات کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کوشش میں وہ عقل و دل دونوں کی خدمات سے کام لیتا ہے۔ شکر وہیں شکر گوٹے کے متعلق لکھتا ہے کہ اس کا دماغ ہم آہنگی اور وحدت کی خاطر ہر طرف پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے میر خیال میں وہ بڑا آدمی ہے۔ شکر ایک دینی رسالہ نکال رہا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے گوٹے کو ادارت میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ گوٹے نے اس دعوت کو منظور کر لیا اور اس کے بعد دونوں کی دوستی میں وہ استواری پیدا ہو گئی جو شکر کی موت تک ۱۸۹۸ء قائم رہی۔ شکر کی دوستی سے گوٹے کی شاعرانہ زندگی پر کافی اثر پڑا۔ شکر کی محبت نے اس میں شاعری کا جوش پھر پیدا کر دیا اور اس نے بہت سی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ علاوہ بریں گوٹے کاؤٹس کے مسودہ کو بالکل بھلا بیٹھا تھا۔ شکر کے تقاضوں سے اس پر نظر ثانی کی ضرورت کی بنا پر وہ اختتام تک پہنچ گیا۔ شکر نے کوشش کی تھی کہ گوٹے کا ناول ”ولہلم ماٹسر کا زمانہ ابد داری“ اس کے سال میں شائع ہو جائے مگر گوٹے اس کی اشاعت کا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہ ناول شائع تو ہوا ۱۸۹۷ء میں مگر اس کی ابتدا اظالیہ کے سفر سے پہلے ہو چکی تھی اور آخر میں گوٹے نے کافی رد و بدل بھی کیا۔ پہلے مسودہ میں ایک نوجوان ”ولہلم ماٹسر“ کا قصہ ہے جو کسی تھیسٹین میں ملازم ہوا اور پھر وہیں کی ایک بیوہ فائیکٹس پر عاشق ہو گیا۔ اس زمانہ میں ولہلم نے بڑی مصیبتیں ٹھائی اور تھیسٹین سے بھی علیحدہ ہو گیا۔ پھر اس نے خود سرمایہ جمع کیا اور اپنا تھیسٹین قائم کیا۔ اب وہ خود ڈرائے لکھنے لگا اور ان کو کھیلنے لگا۔ اس نمائندگی کی خبر کو جانتے ہوئے اس کا قافلہ لوٹ جانا ہے اور تفریق اس کو زخمی کرتے تنہا چھوڑ جاتے ہیں پھر ایک حسینہ اس کی جان بچاتی ہے اس قصہ کا کچھ زیادہ طلب نہیں رکھتا مگر دوسرے مسودہ میں جو اظالیہ کا سفر شروع ہونے کے بعد لکھا گیا گوٹے نے قصہ کا کچھ بدل کر

اس میں غصے میں پھنسانے ہیں۔ یعنی وہ اہل علم و دانش پر حملے معمولی تعمیر کی اُمید داری کے خود زندگی کے تعمیر کی اُمید داری کو کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی نظریاتی نشوونما میں ہر کچھ کی پیدا کرے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوٹے کا مقصد آرٹ نہیں بلکہ خود زندگی ہے۔ آرٹ کو وہ زندگی کے تابع کرنا چاہتا ہے اور ہر اور نظری کے مقابل میں نظم و ترتیب، نظم و انضام کے مقابل میں تعین اور عشق کے مقابل میں مراد مت عمل کو سر ہٹاتا ہے۔ وہ اہل علم پر بہت مصیبتیں پڑتی ہیں اور وہ انکا دردنا دار مقابل کرتا ہے تب کہیں اُس کا شمار ایک خاص اور ممتاز کردہ کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس قصہ کا مطلب یہ ہے کہ عمل ہر شخص کو کرتا ہے مگر سوچاؤ اور مشغل کام پہ انسان بڑی مصیبتیں بھینے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد دانائی سے عمل کرنا سیکھتا ہے۔ اصل استاد وہ ہے جو جانتا ہے لیکن وہ جانتا نہیں جو سب جانتے ہیں بلکہ اصل جانتا وہ ہے جس سے معلوم کی مدد سے لا معلوم کا پتہ لگایا جائے۔ اور یہی چیز بنیاد کردہ کو استاد بناتی ہے۔ اس لئے انسان کی قوت عمل کو صحیح راستہ پر لگانا علم کا اصلی مقصد ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُسکی تشریح کو کچھ جاسکتی ہے کہ انسان زندگی کی صحیح تعلیم ٹھوکریں کھانے کے بعد حاصل کرتا ہے بشرطیکہ علوم و ہدایت کو اپنا مشغلہ بنا لے کیونکہ خلوص ہی سے حیات ابدی ملتی ہے۔ وہ اہل علم و دانش کے متفق شدہ کا خیال ہے کہ وہ اہل علم اس حالت سے جس میں زندگی کا کوئی مقصد عین ہو ایک ایسی منزل کی طرف ترقی کرنا ہے جس کا اسکی زندگی سرتاپا عمل ہے اور جہاں اُسکے مقاصد کا نفع بھی موجود ہے۔“

ایکے بعد گھوٹے نے اپنا افسانہ نہیں اور درودِ حقیا شایع کیا جو شروع سے آخر تک نظم میں ہے افسانہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ ایک فخر کے پرنسٹنٹ بلڈ کے عیسائی شہر بدر کئے جاتے ہیں اور سفر کے دوران میں ان میں سے ایک نوجوان برمن سے ایک حسین دھنیزہ درودِ حقیا سے ملاقات ہوتی ہے۔ برمن نور اُس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اُس کا حسبِ نسب دریافت کر کے اپنے باپ سے کہتا ہے کہ اگر وہ دھنیزہ مجھے نہیں ملی تو میں زندگی بسر ہی نہیں کروں گا۔ باپ بیٹے کو اس حرکت پر نصیحت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ میری کیا کہاں مانتا ہے۔ آخر باپ راضی ہو جاتا ہے وہ لڑکی بلاتی جاتی ہے اور وہ بھی راضی ہو جاتی ہے اور پھر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اُس داستان میں گھوٹے نے اپنے زمانہ کے نوجوانوں کے عشق کی نفسی نفسور پر پیش کی ہے مگر ان زمانہ میں اُس نے مور کا اختیار کیا ہے۔ گوئس اور دھنیزہ شایع کرنے کے بعد گھوٹے کے خیالات میں بڑی تبدیلی ہو گئی تھی۔ جذبات کو جو عوام کی تکلیف ہے وہ شہر کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ علاوہ برمن روایت کا آغاز ہو چکا تھا اور انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں تو اس کا بہت زور تھا۔ ان وجوہ سے اُس کی مقبولیت بہت کم ہو گئی تھی مگر برمن اور درودِ حقیا نے اس کی مقبولیت پھر زندہ کر دی۔ ہر طرف اُس کا چرچا ہونے لگا۔ اس مقبولیت کی وجہ یہ کہنا چاہیے کہ برمن اور درودِ حقیا کے آئینہ میں ہر سن پرست دل رکھنے والا شخص اپنے ہی خط و خال کی جھلک پاتا اور مصنف کے کمال کی داد دیتا۔ واپس اور برمن و درودِ حقیا گھوٹے کے فخر کی زندگی میں شمر کے مشورہ سے شایع کی تھیں۔

۱۔ مغربی ادب میں اٹھارہویں صدی کے نصف دوم کا زمانہ رومانیت کی ابتدا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغربی مصنفین ادب کی تمام تاریخوں میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ادب کو کلاسیکی اور رومانی دور میں تقسیم کرتے ہیں مگر تقسیم جتنی ناجائز ہے اتنی ہی غلط بھی ہے کیونکہ کوئی درخواہ وہ کلاسیکی ہو یا رومانی مکمل طور پر نہ کلاسیکی کہا جاسکتا ہے اور نہ رومانی کیونکہ ہر دور میں دولوں کی کچھ نہ کچھ خصوصیات باقی جاتی ہیں۔

جس طرح آج تک کسی معروف و مشہور مصنف کی کوئی جامع تعریف ہو سکی اس طرح رومانیت کی بھی کوئی جامع تعریف نہیں ہوئی، سایک مصنف اگر تو رومانی

شکر کی موت کے بعد گوئی کی زندگی کا دوسرا اور آخری دور شروع ہوتا ہے۔ شکر کی موت سے گوئی کو بہت صدمہ ہوا کیونکہ دس بارہ برس کے قریبی تعلق سے دونوں میں خاصی محبت ہو گئی تھی۔ شکر کی موت کے بعد سے وہ کچھ آزدہ خاطر اور پریشان حال رہتا اور کبھی کبھی یحییٰ بھی ہرجاتا۔ آخر طبیعت کی اصلاح کے لئے اُس نے چند مقامات کا سفر بھی کیا۔ اسی زمانے سے اُس میں ضعیفی اور پیری کے آثار نمودار ہوتے ہیں جب وہ سفر سے لوٹ کر آیا تو اُس کے تھوڑے ہی دنوں بعد یورپ میں نیپولین کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد نیپولین کے ماتھے میں مطلق العنانہ اختیارات آئے جس سے فائدہ اٹھا کر وہ بادشاہ بن بیٹھا۔ نیپولین اُس نے پروشیا پر حملہ کر دیا۔ دالمی ریاست پر دیشیا کی حلیف تھی۔ جینا کی مشہور جنگ میں پروشیا کے ساتھ دالم کو بھی شکست فاش ہوئی۔ دالم کو فرانسیسیوں نے خوب لوٹا مگر جنرل نے کئی عسکریوں کی وجہ سے گوئی اُس دسبر سے بچا رہا۔ صلح کے بعد نیپولین گوئی کی ملاقات نیپولین سے ہوئی اور بڑی دیر تک ادب و سیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔ نیپولین گوئی کا بڑا مداح تھا۔ اُس نے سات مرتبہ "وتھو" پڑھا تھا اور شکر کی شہنشاہی پر اُس کتاب کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب ملاقات ختم ہونے کو آئی تو نیپولین بول اٹھا کہ "یشک یہ ایک انسان ہے۔"

۱۔ مشہور گوئی کا شاہکار فادسٹ کا حصہ اول شائع ہوا اُس ڈرامہ کا خاکہ اول اول اُس نے اسٹریس برگ میں تیار کیا تھا۔ پھر فریکفورت میں کچھ گھٹانے بڑھانے کے بعد اُس کو اطالیہ کے سفر تک یوں ہی ڈال رکھا۔ گوئی فادسٹ کے ڈرامہ کو اتنا اہم سمجھتا تھا کہ بہت بار کر اُس سے مایوس ہو بیٹھا۔ شکر سے جب دلی رفاقت کا آغاز ہوا تو اُس نے گوئی کی توجہ فادسٹ کی طرف دلائی پھر اُس کے سہم اصرار سے گوئی نے فادسٹ کا حصہ اول بڑی محنت سے مشہور میں ختم کیا۔ پہلے سارہ میں تو فادسٹ کے جزات و خیالات اور اُس زمانہ کے کارناموں کو دوبارہ زندہ کرنے کو روایت کرتا ہے تو دوسرا جز، حسن اور بیگم کی روایت کی نوع معلوم ہوتا ہے پھر تیسرا روایت کو نامعلوم اور ہم خواہشات کی تروپ سے تعبیر کرتا ہے۔ سادہ چوتھا اُس کو انسانی زندگی کے لامحدود گوشوں کی طرف اشارہ کرنا بتاتا ہے۔ پانچواں حرف انڈاز بیان پر اپنی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے۔ عرض جتنے مناسبتی باتیں ہیں لیکن ان مختلف بیانات کو اگر دایا جاسے تو روایت کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ضرور ہو جائیگا۔ اصل میں روایت جو ش میں ٹوٹا ہوا ایک جذبہ ہے جو کائنات کے ہر منظر میں حسن کی تلاش کرتا ہے اور اس تلاش میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ پھر عقل کے ساتھ ہم آہنگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ہر دیکھی بھالی چیز سے جس میں عقل کا ذرا سا بھٹکا ہو اسکو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے معلوم کے بجائے نامعلوم حال کے بجائے ماضی اور محدود کے بجائے لامحدود کی طرف جانا ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایت کی کیفیات کی ایک دنیا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے روح مندرجہ ذیل چیزوں کی استعانت چاہتی ہے۔۔

۱۔ مناظر قدرت۔ ہمارے خزاں کی آمد و رفت۔ آفتاب و ماہتاب کا طلوع و غروب۔ سبزہ دہلی کی عطرینیری، نسیم صبح کی دلا دہری غرض مناظر قدرت کی تمام تر نگہیوں سے انسان کے دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے کیونکہ نرم قدرت حسن کا ایک بے پایاں سند ہے اکثر مناظر قدرت کے مشاہد سے انسان اندر دہل اور پز مردہ خاطر بھی ہو جاتا ہے اور لالہ مسخرا کا داغ اُس کو اپنے ہی داغ دل کا پر تو نظر آتا ہے۔ پھر رات کی سنان تاریکی اور دایوں اور پہاڑوں کے خاموش گوئی اور قدرت کے عجیب منظر سے دلوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اکثر عالم کی حقیقت اور موت و حیات کے مسئلہ میں الجھ پڑتا ہے۔

۲۔ تخیل۔ مناظر قدرت نے جب دل میں اضطراب پیدا کر دیا ہو تو تخیل آکر اُسے چھیڑتا ہے کیونکہ روح کی برقراریاں خود روح کی کڑائی

بالکل ”طوفانِ وہجوان“ کا دوسرا نقش تھا لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور گوشتے کے خیالات میں تبدیلی ہوتی گئی فائوسٹ بھی اس تبدیلی کا ترجمان بن گیا۔ آخر جب یہ تبدیلی ایک خاص مرکز پر اکرجم گئی تو گوشتے نے فائوسٹ میں ہاتھ لگایا اور اُس کو اپنے ”جدید“ خیالات کا رنگ دیکر ختم کیا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص فائوسٹ کو جو ستر یا عقل ہے، کائنات کا راز اور انسانی زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا یہ حق ہے اور اس حق کی تکمیل میں اُس نے آدمی سے زیادہ مگر گزاردی۔ دنیا بھر کے علوم بڑھوٹے مگر میری نہ ہوئی۔ کتابوں کے دریا کے دریا خشک کر ڈالے لیکن جگر کی پیاس نہ بھی۔ آخر علوم سے تنگ آکر اُس نے فنِ سحر کی طرف توجہ کی مگر وہاں بھی بدستور سابق اُس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنی ناکامی سے اُس کو اتنی مایوسی ہوئی کہ آخر وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گیا مگر کچھ سوچ کر کیا زائیا اسکے بعد ایک روز ایک کالے کتے کو دیکھتا ہے جو اُس کے گھر میں چلا آتا ہے۔ یہ کتا شیطان ہے جو گھر میں اگر ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جو کسی یا دیری یا ملا کی شکل سے ملتی جلتی ہے یا شیخِ سعدی کی مجوزہ شکل سمجھے یعنی۔

مرابلیس را دید ششے بخواب بقامت صنوبر برنج آفتاب

شیطان فائوسٹ سے اُسکی آرزوؤں کی تکمیل کا وعدہ کرتا ہے بشرطیکہ فائوسٹ مرتے وقت اپنی روح شیطان کے حوالے کر دے۔ فائوسٹ اپنے خون سے راضی نامدکھ دیتا ہے اور آرزوؤں کی تکمیل کی صورت یہ قرار پاتی کہ فائوسٹ تمام دنیا کا علم حاصل کرنے کے بعد اگر دنیا میں ملوث ہو جائے تو شیطان جیتا ورنہ فائوسٹ۔ شیطان نے فائوسٹ کو تمام دنیا کی سیر کرائی اور طرح طرح کے لوگوں سے اُسکی ملاقات کرائی اور اس خیال سے کہ دنیا کا مطالعہ در اچھی طرح ہو سکے اُس نے جادو کے زور سے فائوسٹ کو جوان بنا دیا۔ جوان فائوسٹ اس کے بعد ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے پھر قدیم یونان کی مشہور جینہ ہیلن سے ملاقات کرتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ آخر ایک فقرہ خود آباد کر کے اسکی نگہبانی اور ترقی کی ترکیبیں سوچتا ہے کہ اس کی زندگی کا وقت پورا ہو جائے کہیں اُس کو شیطان شیطان معاہدہ کے مطابق روح طلب کرنے آتا ہے نورانی فرشتے آکر اُس کی روح کو شیطان کے پنجے سے چھڑا کر سے پیدا ہوتی ہیں۔ تخیلِ روایت کا ایک ضروری عنصر ہے۔

۳۔ حمد ماضی کی داستان۔ خود تخیل کو بروئے کار لانے میں حمد ماضی کی داستان بہت مدد دیتی ہے۔ پرانی پرانی عاریض، بوسیدہ عمارات اور اُجڑے بعد گاہ وغیرہ جب زمان حال سے غفلت رفتہ کا افسانہ بناتے ہیں تو دونوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور وہی آرزو ہوتی ہے کہ ہاں دکھا دے اسے قصہ بچہ و چوچ و شام تو دور بیچھ کی طرف اسے گردشِ ایام تو اور بھرا کھوں سے دل کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ اخلاق۔ اٹھکداری کے سامنے ہیں یہ اُچڑے بام و در گریرہ پیہم سے مینا ہے ہماری چشمِ تر
۴۔ اخلاق۔ حال کی کیفیت، ہمیشہ ناگفتہ بہ ہوتی ہے اس لئے لوگ اخلاقِ ترقی کا نصب العین ماضی میں تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلہ سے حمد ماضی کی داستان کو جذبات سے از سر نو زفرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۵۔ دور دراز ملکوں کے قصوں اور حالات سے بھی تخیل کو حرکت ہوتی ہے۔ مثلاً مشرقی ممالک کے قصے اُس زمانہ میں یورپ میں بہت مقبول تھے۔
۶۔ عوام کے افسانوں اور قصوں سے حمد ماضی سے سیلہ بر سیلہ چلے آئے ہیں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

عالم قدس کی طرف لہجائے ہیں اور فائوٹ کو نجات ملتی ہے۔ ڈرامہ کے شروع میں تین قیدی مناظر میں ہیں اور ان میں جو منظر تعمیر کے لئے لکھا گیا ہے اس سے کالیڈر اس کے شکست کا اثر معلوم ہوتا ہے کیونکہ مغربی ڈراموں میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

فائوٹ نہ صرف ڈرامہ کی ایک شخصیت ہے بلکہ تمام بنی نوع انسان کا ایک جیسا جانتا جاتا نامید ہے جو ہر عقائد و عمل کی دعوت دیتا ہے مگر انسان میں نیک نیتی ہو تو خطا کوئی گناہ نہیں کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اس میں شک نہیں کہ انسان کے قدم حقیقت کی تلاش میں دنگا جاتے ہیں مگر آخر میں کامیابی اُسی کے ہاتھ ہے۔ شیطان بھی انسان کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اس کا سارا دل و فریب انسان کی اخلاقی ترقی کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ روحانی اور اخلاقی ترقی کے راستہ میں شیطان ایک بہت بڑی دیوار ہے اور کشاکش پیدا کرتا ہے اور اسی کشاکش پر کامرانی اور فخر مندی حاصل کرنا بنی نوع انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ یہ کشاکش نہ ہو تو پھر انسان انسان نہ ہو۔ دنیا میں دراصل برائی کی کوئی طاقت نہیں درجہ چہرہ کو بظاہر بری معلوم ہوتی ہے وہ بھی ہم کو بالواسطہ اچھائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کشاکش سے انسان کو اس لئے ناامید نہ ہونا چاہئے کہ انسان غلطی کر بیٹھتا ہے بلکہ انجام کار پر عقائد رکھ کر خلوص کے ساتھ پیہم عمل کرنا چاہئے جب تک دل میں اعتقاد و عمل کی چٹکاری نہیں جھکتی ہے انسان باوجود غلطیوں کے خدا کا خاص بندہ ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ خدا اپنے بندہ کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے گا۔ آخر میں نیکی و بدی بذاتہ کوئی چیز نہیں بجاتی گویا یہاں پہونچ کر گم گئے کی دونوں متخالف روحوں میں کمال درجہ کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

فائوٹ شایع کرنے کے بعد کوٹے کے قلم میں پھر فرینکفورٹ کے آخر زمانہ کی سی "اٹائی" لکھی اور اُس نے بہت سی تعریفیں کیے بعد دیگرے شایع ہوئے وہیں اسکا مشہور ناول "انتخابی مائت" شائع ہوا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص ایڈورڈ اور ایک لڑکی شارلٹ دونوں کسی کے زمانہ سے آپس میں محبت کرتے چلے آئے ہیں۔ بڑا ہونے پر ایڈورڈ اپنے خاندان کے اثر سے کہیں دوسری جگہ شادی کر لیتا ہے چنانچہ شارلٹ کی بھی دوسری جگہ شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں ملتے ہیں اور کسی طرح پھر ایک جگہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے پہنے لگ جاتے ہیں۔ پھر اُسے دونوں بعد ایڈورڈ کا ایک پرانا دوست کپتان آتا ہے اور ایڈورڈ کے ساتھ رہنے لگ جاتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ایڈورڈ کی دعوت پر شارلٹ کی بھی اوٹلی بھی آکر وہیں رہنے لگتی ہے۔ ان چار آدمیوں کے اکٹھا رہنے سے ان کو گولڈ کی قدرتی مماثلت اپنا اثر دکھائی ہے یعنی جن دو شخصوں کی طبیعت ہم رنگ ہوتی ہے وہ آپس میں محبت کرنے لگتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کپتان شارلٹ سے اور ایڈورڈ اوٹلی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ایک دن بخت کے دوران میں اس نئی طرز کی محبت پر یوں روشنی پڑتی ہے کہ جب وہ ہم مثل اجزا ملتے ہیں تو ان کے اشتراک سے ایک تیسرا سر جو بنتا ہے۔ لیکن اس عشقی کا نتیجہ نہایت

اٹھا رہا ہے۔ صدق کے آخر میں ان چیزوں کا داخلہ یورپ کے ادب میں ہونے لگا جس سے عقلیت کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور احساس کامل بڑھ نکلا۔ جرمنی کی تحریک "طوفان دہیجان" کے ایوان کی ریشائش انھیں چیزوں سے کی گئی ہے۔ اٹھا رہا جس حدی سے آخر میں جرمنی کی روحانی تحریک میں متغیر ہو گئیں۔ تحریک طوفان دہیجان اور روانیت میں فرق یہ ہے کہ تحریک طوفان دہیجان ان چیزوں کے ساتھ ایک زبردست پیغام عملی بھی ہے اور روحانی تحریک ہے اس حد تک کہ انفعالی پہلو ملے ہوئے ہے عمل اس میں مفقود ہے۔

خطرناک صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شارٹ اور ایڈورڈ نہایت دردناک حالت میں جان دیتے ہیں۔ کپتان کا بھی برا حال ہوتا ہے
گوٹے نے اس قصہ میں میان بیوی کے تعلقات کی نفسی تحلیل کی ہے اور شادی کی اہمیت اور میاں بیوی کے صحیح تعلقات پر زور دیا
ہے اور بتایا ہے کہ اخلاق کے زبردست اور عالمگیر قانون سے سرکشی سخت خطرہ کا باعث ہے۔ اب صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوٹس اور
ورنر کے مصنف کا نظریہ بدل چکا ہے۔ پہلے وہ سوسائٹی کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا جماعت کے مقابلہ میں فرد کی کوششوں کو لائق
تعمین قرار دیتا تھا لیکن اب سماج کے اثرات اور اخلاقی قوانین کی پیروی پر نہ صرف زور دیتا ہے بلکہ ان کا پورا جاری ہے اس کے
بعد گوٹے اپنی سوانح عمری لکھنے میں مشغول ہوا جس کو اس نے کئی حصہ کر کے ”سلسلہ“ سے لیکر ”سلسلہ“ تک شائع کیا اور اس کا نام
”شاعری اور حقیقت“ رکھا۔ یہ سوانح عمری بچپن سے لیکر دائرہ کی روانگی تک یعنی پچیس برس کی مکمل داستان ہے۔ اس میں گوٹے نے
اپنے مختلف عشقہ کا زمانہ، دوستوں کا حال، جرم، ادب کی حالت، اپنی تعلیمی سرگرمی غرض جو کچھ اس کی ذات سے وابستہ تھا اس کو
لکھ کر اپنی روحانی اور ذہنی ارتقاء کی تفصیل پیش کی ہے جو ان کی خام کاریوں اور جبر وصال کی کیفیتوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا
ہے مگر طرزیان میں اتنی مناسبت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے پر پختہ کا اپنی جوانی کے جوش و خروش کو دیکھ رہا ہے بعض لوگوں نے
کہیں کہیں واقعات کی غلطیاں بتائی ہیں مگر یہ غلطیاں شاید اراداً نہ ہوں مثلاً ”طوفان“ و ”بیجان“ کی تحریک کے زور کا جس کا ذکر
ادبی تاریخوں میں ملتا ہے اور جس کا وہ گوٹے علمبردار تھا اس میں بالکل پتہ نہیں چلتا۔ پھر لائپزگ کی رنگین زندگی کا حال صاف طور پر
نہیں کھلتا۔ طرز تحریر صاف اور سادہ اور کہیں کہیں زوردار بھی ہے۔ کارل بریول کا خیال ہے کہ گوٹے سے قبل جتنی بڑی سوانح عمری
شائع ہوئیں ان میں زیادہ تر مصنف کے ذاتی تشوہ کا حال ہوتا ہے مگر گوٹے کا سنا وہ شخص ہے جس نے اپنی سوانح عمری میں جماعت
کے ساتھ فرد کے ارتقائی منازل کی کیفیتیں پیش کی ہیں اور ان کے پیش کرنے کا مطلب صرف اظہار نہیں ہے بلکہ خود اس کے ذہنی
ارتقاء کو سائنس اور فلسفہ کے نقطہ نظر سے سمجھنے کی دعوت عام ہے۔ اس لئے ”شاعری اور حقیقت“ اپنے اعلیٰ مقصد کے
محاط سے محض معمولی حقائق سے تشکیل ایک زبردست اور زندہ حقیقت کی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔“

پھر غور سے دلوں بعد اس نے اپنا مغربی مشرقی دیوان، شائع کیا۔ اس میں گوٹے کی وہ غزلیں اور نظمیں درج ہیں جنہیں اس نے
بادہ مشرق سے مست ہو کر لکھی ہیں۔ ”سلسلہ“ میں گوٹے کی نظر سے دیوان حافظ کا جرم ترجمہ گذرا جس کو آسٹریا کے ایک عالم فان
ہیمر پرگسٹال نے دو ایک سال قبل شائع کیا تھا۔ مگر مشرق کی طرف گوٹے کی توجہ بدل کرنے والا صرف دیوان حافظ ہی نہیں تھا
بلکہ اس مشرقی تحریک کے آغاز سے جو دیوان حافظ کا ترجمہ جھپٹنے کے بعد شروع ہو گئی تھی مدتوں پہلے گوٹے مشرق کا شیدائی تھا
مشرقی ادب میں عالم رنگ و لبو کی کیفیت، احساس کی حرکت اور تخیل کی آمیزش کے ساتھ ایک نہ ملنے والی چیز کی جستجو
اور تڑپ بھی ہے جس کا گوٹے اپنے شاعرانہ احساس و لطافت کی بنا پر مدتوں سے دلدادہ تھا۔ علاوہ بریں جرمنی میں مدتوں
سے مشرقی ادب کیچ چلا آتا تھا۔ گلستان و بوستان کا ترجمہ سترھویں صدی کے آخر میں ہوا۔ الف لیلہ اٹھارہویں صدی میں تیار

مقبول ہوئی۔ فرانسیسی بھی مشرق سے متاثر تھے جس کا اثر بالواسطہ جرمنی پر بھی پڑا لیکن گئے اپنے نوادہ مائیں کا ماحول بالکل مشرقی رکھا ہے۔ آخر میں ہر ڈاکے انٹر سے مشرقی ادب میں کافی لچک سی بڑھ گئی تھی اور اس برگ میں ہر ڈاکے ہی کے فہم و سمجھت سے گڑھے کی روع میں جو نئی دنیا تعمیر ہوئی تھی وہ بڑی حد تک ہا من اور مشرقیت کی مروجوں منت تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گوٹے اول اول انجیل کو محض قدس احوال کی خاطر جس سے دور دراز مشرق کی بو آتی تھی پڑھا کرتا تھا۔ پھر اسٹراس برگ کے کا تھی وضع کے گریسا سے اسکی دلچسپی میں مشرقی مضمون بھی موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلہ سے اسکو خاصا مخف تھا کیونکہ ”در مفر“ میں جس جگہ شتی ڈوبنے اور اس کا لوہا کسی نقطا طیسی پہاڑ میں جا کر لیٹ جانے کا حوالہ ہے، وہ سندباد جہازی کے ایک سفر کا حال ہے پھر جیسا نے فاسٹ شائع کیا تو یہی مضمون ایک منظر تھیر کے متعلق لکھا ”مفر کا لیلہ کے شگفتگی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ اثرات اس کے ذہن میں بے سے موجود تھے کہ دیوان حافظ شائع ہوا اور اس نے سونے پر سہاگہ کا کلام کیا۔ گوٹے نے خواجہ حافظ کی آنکھوں سے جو ایرانی کیف مسرتی، زندی و ہوسنا کی کا مشاہدہ کیا تو بے اختیار ہو گیا اور اس میں اس کو اپنی ہی تصویر نظر آئی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ مگر ان جذبات کو فی الفور بھٹرنے کے لئے رگ جان کے قریب ایک اور نشتر بھی تھا اور وہ سیرین ویلر کی ذات تھی۔ یہ فرینکفورٹ کے ایک تاجر کی حسین بیوی تھی۔ گوٹے جب ۱۸۱۷ء میں فرینکفورٹ آیا تو اس سے شناسائی ہوئی۔ اس حسن کی دیوی کی صورت دیکھ کر اس پر کہن سال کی رگوں میں پھر خون حیات دوڑنے لگا اور اس کی یاد میں اس نے جو غزلیں لکھی ہیں انھیں مغربی دیوان میں زلیخا سے خطاب کیا ہے۔

مغربی دیوان کی غزلوں کا جو ش اُن کے کیف اور ان کی مستانہ بخودی سے پتہ چلتا ہے کہ کافر پیری میں ابھی جوانی کی آگ پوشیدہ ہے اور یہ آگ سوزش و حرارت میں کسی طرح فرینکفورٹ کے زمانہ سے کم نہیں۔ ان غزلوں میں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گوٹے فارسی استعارات و تشبیہات استعمال کرنے کے باوجود اپنے جذبات کے اظہار میں بالکل مغربی بلکہ جرمن ہے۔ گویا اس نے ایک مغربی عروس کو مشرقی لباس میں سناوا ہے۔ ”وہ اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس کی نگاہ صرف انھیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جس کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے“

۱۸۱۷ء میں اس کا دوسرا ناول ”دلہلم بالٹسکی سرگزشت“ شائع ہوا اس میں دلہلم معاہنے لڑکے فیکلس کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اور مختلف مقامات کی سیر کرتا ہے۔ جہاں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ سفر سے تجربہ بھی خوب ہوتا ہے ناول میں کئی قصے ہیں جو کسی نہ کسی طرح آپس میں جوڑ دیئے گئے ہیں۔ اس ناول میں گوٹے نے مذہب، صنعت، حرفت، تعلیم اور معاشرت کے زیر اُصولوں پر بحث کی ہے اور دلشیں مثالوں سے انھیں سمجھا یا ہے۔ مذہبی تعلیم کے متعلق کہتا ہے کہ اپنے سے اعلیٰ اور اپنے سے کمتر اور جو کچھ اپنے اندر موجود ہے اُن کی تعظیم کرنی چاہئے کیونکہ انھیں تینوں کا باہمی متراجیح صحیح مذہب کی روح ہے صنعت و حرفت کے متعلق اُس نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے یورپ کے معاملات میں اُس کے کمال

پیش بینی کی داد دینی پڑتی ہے یعنی بھاپ اور بجلی کی ترقی، کاخالوں کی کثرت اور مردوں اور سرمایہ داروں کی آنے والی آواز پیش کلاس نے دھنسا سا اندازہ کر لیا تھا اور ان مشکوں کو حل کرنے کی جو صلاح اُس نے دی ہے اس میں درجہ اولیٰ کے بعض ناقدین کو اشتراکیت کی داغ بیل معلوم ہوتی ہے۔

گوٹے کا آخر زمانہ دور دوسرے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں اور اُس سے ملنے کو باعث فخر جانتے ہیں۔ وہ دنیائے ادب کا باطلہ شہسوار کیا جاتا ہے۔ تمام یورپ پر اس کا سکہ پیٹھا ہوا ہے۔ گوٹے اُن چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اپنی شہرت اپنی زندگی میں ہی دیکھ لی مگر اس کی طبیعت اور اس پرستی تھی بیٹا بالکل اکارہ نکل گیا بیوی بچوں کی بیٹھکی لالچی سے گھر میں ایک طوفان بے تیزی برپا رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں اُس نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ ”لوگ میری تعریف برابر اس طرح کرتے ہیں کہ قسمت نے ہمیشہ میری یادری کی اور اب میں اپنی قسمت کا کوئی مشکوہ بھی نہیں کرتا لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو میری زندگی محنت اور تکلیف کا مجموعہ رہی ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ۷۵ برس تک مجھے چار ہفتے بھی حقیقی آرام نہیں ملا، رفتہ رفتہ اُس کے تمام یارانِ حلیم اُٹھتے جاتے تھے۔“ اُس نے جب ڈیوک مرانو و بالکل خاندان نشین ہو گیا اور گھر میں بکر رسائل وغیرہ پڑھتا بہت دنوں سے اُس کو فائسٹ کا دوسرا حصہ لکھنے کا خیال تھا۔ اُس کو اُس نے پورا کیا اور سربراہ کر کے اپنی موت کے بعد شائع کرنے کی تاکید کر دی آخر ایک ہفتہ کی علالت کے بعد مقامِ داغ ۳۲ مارچ ۱۹۳۳ء کو عالم فانی سے ہیث۔ کے لئے کوچ کر گیا۔ مرنے وقت اُس کی زبان پر ”روشنی، مزید روشنی“ کے الفاظ جاری تھے۔ گوٹے کی زندگی ایک اچھے خاصے عہد کی داستان ہے کیونکہ کلاس عہد میں جرمنی کی ادبی ترقی اپنے عروجِ کمال پر پہنچی اور اس ترقی میں گوٹے کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔ اُس نے ادب کو خستہ حال اور کم پایا لیکن جیسے چھوڑ کر مرنا تو جس ادب کا نام دوسرے ادبوں کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

گوٹے کو انتقال کے سو برس ہوئے مگر اس پر تنقید کا سلسلہ اب تک بند نہیں ہوا کسی کسی نقطہ نظر کے مطابق برابر اس پر تنقید ہوتی چلی آتی ہے اور حال میں اس کی شہرت تو کافی بڑھ گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر مبنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کی صرف نہرست سے ڈیڑھ ہزار صفحات پُر ہو جائیں گے۔ یہ اعزاز آج تک کسی مصنف کو نہیں حاصل ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بحرِ تصنیف میں کچھ ایسے گہرا بدار بھی ہیں جنکی چمک تباہِ قائم رہے گی۔ لیکن اسکی بے شمار تعانیف دیکھ کر جب ہم فائسٹ، اپنی ناسو ہیرن اور ڈورڈتھیا اور روتھر برلن نظر ڈالتے ہیں جنکو قبولِ دوام کی سند متفقہ طور پر مل چکی ہے تو ہم کو اس ضخیم تعداد پر تعجب ہے اور سوال کرنے کو بھی چاہتا ہے کہ اتنے بڑے آدمی کی زندہ جاوید تصنیفیں اتنی کم؟ لیکن اگر ہم اس کی زندگی پر غور کریں تو جواب آسانی سے مل جائیگا لایں اُس کا باعثِ دہی اسکی دونوں روعیں ہیں۔ اس میں شگ نہیں کہ ان دورِ دوحول کی وجہ سے اس میں توازن و تجربہ، فہم و دانائی بہت آگئی تھی اور وہ زندگی کے مسائل کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے بھی لگا تھا مگر فنون لطیفہ کی نظر میں جواب کا معیار یہی چیزیں کم درجہ کی ثابت ہوتی ہیں کیونکہ فنون لطیفہ کے پرستاروں کا یہ مذہب ہوتا ہے کہ

الف

وہ اسی کے مورہتے ہیں اور اُسی کے پیچھے اپنے کو کھودیتے ہیں۔ ان کی مملکت میں ”یک گیر و حکم گیر“ کا سکہ چلتا ہے۔ وہ روح کی پروانے کے لئے صرف ایک ہی نصابتا رکھتے ہیں اور اُسی پر زندگی بھر قائم رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایک ہی فضا میں پرواز کرنے سے جو بلندی حاصل ہوتی ہے وہ کئی راستوں میں جانے سے نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے گوئے کی طبیعت ہمہ گیر تھی اور دونوں ردحوں کی کشش سے اس میں ایک طرح کا توازن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سائنس، فلسفہ، مذہب، تعلیم وغیرہ میں یکساں طور پر دلچسپی لیتا تھا۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا اور فلسفہ زندگی پر گہری نظر رکھتا تھا اُس نے زندگی کو ہم آہنگ بنانے کی خاطر فرینکفورٹ کے زمانہ کی ”طوفانی“ تحریک سے اپنا تعلق قطع کر لیا اور اپنے روحانی ارتقاء کی خاطر زندگی کے مختلف نظام کے مطالعوں میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی یہ ہم آہنگی زندگی کے لحاظ سے گو اُس کا سب سے بڑا کام نہ رہی مگر فن کے راستہ میں یہ ایک سنگ راہ ثابت ہوئی کیونکہ یہاں توازن کے بجائے وسعت پرواز اور ہمہ گیری کے بجائے یک گیری کی ضرورت ہے۔

”ورنہر“ کی ابتدا

جب گوئے وزیر سے لوٹ کر فرینکفورٹ آیا تو اس کے بہت سے قریبی دوست فرینکفورٹ سے جا چکے تھے۔ ان کی عدم موجودگی اس پر سخت گراں گزری۔ تنہائی میں وہ پھر غور و فکر کی طرف مائل ہو گیا۔ اکثر دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں سے جو اس کے حاشیہ خیال میں تھیں باتیں کرتا اور فنِ مصوری کے عمدہ شاہکاروں کو دیکھتا۔ ان کے علاوہ لاشن کی محبت کا نقش بھی اب تک دل سے مٹا نہ تھا جیسا کی یاد آتی تو دل میں چراہو جاتا۔ لاشن کے رخ کی یکطرفہ تصویر دیوار پر لٹکا کر لکھٹوں دیکھا کرتا۔ ابھی فرینکفورٹ آئے دو ہفتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خط میں لکھا ہے کہ ”میں ابھی ابھی رات کے وقت لاٹے (لااشن) کے رخ کی یکطرفہ تصویر سے رخصت ہو کر آیا ہوں“ پھر دوسرے خط میں لکھا ہے لکھنا نا کھانے کے قبل میں نے اس کی تصویر کا بڑے شوق سے استقبال کیا ”تیسرے خط میں لکھا ہے کہ ”یک طرفہ یقین مانو کل شام کو تم سے اور لاٹے سے میں قریب ایک گھنٹہ تک باتیں کرتا رہا... دروازہ کی طرف جاتے ہوئے میرا ہاتھ ایک کاغذ پر پڑا... دیکھا تو لاٹے کی تصویر تھی۔ اس چھوٹے سے کیسا دل خوش کن احساس پیدا ہوا میں نے اُسے بڑے شوق سے سلام کیا اور چلا گیا“ اس طرح وہ برابر عالم خیال میں حرکتیں کرتا رہتا اور اس بات کی مطلق پروا نہ کرتا کہ لاٹے کی تصویر کی ہوی ہو گئی ہے جو اس کا دوست ہے۔ ”ورنہر“ میں یہ واقعہ بھی تغیر کے ساتھ درج ہے۔

نوبل پرائز میں گوئے کو اطلاع ملی کہ اس کے وزیر کے دوست یرشلیم نے خود کشی کر لی۔ سفارتخانہ کے کام میں یرشلیم کا ہی بہت کم لگتا۔ اس وجہ سے سفیر نے ان کی ہو گئی تھی البتہ شعور شاعری و فلسفہ کا دلدادہ تھا تنہائی پسند تھا اور اکثر چاندنی راتوں میں تنہا سیر کو نکل جاتا جس کا دل رکھنے کی وجہ سے اکثر غمیں راتا کرتا اور موت کی آرزو کرتا۔ خود کشی کے کچھ دنوں قبل اس نے ایک شخص سے خود کشی کے مسئلہ پر گفتگو کی تھی جب محفل رقص کے موقع پر گوئے اول لاٹے کی ملاقات ہوئی تو یرشلیم بھی وہاں موجود تھا۔ سینا کوٹ اور سیلا پتلون پینٹنا تھا جو ورنہر کی

پوشاک بتائی گئی ہے۔ ویزلر کے ایک دوسرے رفیق کے پرائیویٹ سکرٹری کی حسین بیوی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا مگر کچھ سوسائٹی کی طرف سے
اور اپنی معشوقہ کی سرد مہری اور بے نیازی سے تنگ آ کر اُس نے ایک روز رات کو اکثر برٹش شاہیں کی سیٹھ سے پتوں لگا کر خودکشی کر لی اس
خطرناک واردات کے دن وہ اپنے کاغذوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا اور متعدد بار باہر بھی گیا۔ اسی روز اس نے اپنا قرض وغیرہ بھی ادا کیا
رات کو نو گھنٹے آگ جل رہی تھی اور دوسرے روز صبح تیار رہنے کا حکم دیا۔ رات کو اس نے بخور کی سی شراب بھی طلب کی تھی اُس کی زیر پرست
کاناول ایمیل گیٹوٹی لکھلا پڑا تھا۔ چونکہ اس نے خودکشی کی تھی اس لئے عیسائی مذہب کے مطابق کوئی پادری اُس کے جنازہ میں شرکت نہیں
ہوا اور کوئی مذہبی رسم پوری نہ گئی۔ اس دلہزدہ واقعہ کی خبر سے تمام قصبہ میں اتنی سنسنی پھیل کر بہت سے لوگ اپنی مینڈکھو بیٹھے۔

گوٹے ان واقعات کے معلوم ہونے پر اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ ”اسی زمانہ میں مجھے یروشلم کی موت کا حالی افواہ معلوم ہوا اور
بعد کو پورے واقعہ کی تفصیل بھی معلوم ہو گئی۔ اسی وقت ”وتھ“ کا خاکہ ذہن میں تیار ہو گیا اور نام چیزیں مکمل صورت میں اس طرح جمع ہوئیں
جس طرح ایک برتن میں جتنا ہوا پانی ایک معمولی حرکت سے جھک رہا ہو جاتا ہے ”گوٹے“ کا ایک شہر جرمن سوانح نگار گوٹے کے اس بیان
کو تسلیم کرتا ہے مگر درحاضر کے ایک مشہور انگریز ناقد پروفیسر رابرٹسن کو اس بیان کے تسلیم کرنے میں اس نے پس و پیش ہے کہ یروشلم کی موت
کے تقریباً ۱۵ ماہ بعد یہ افسانہ لکھا گیا حالانکہ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ فوراً لکھا گیا لیکن گوٹے کے بیان میں تعجب کی کیا بات ہے!
وہ صرف خاکہ کا ذکر کرتا ہے افسانہ لکھنے کا ذکر نہیں کرتا۔ خود فاسٹ کا خاکہ اس کے ذہن میں اسٹراس برگ کے زمانہ میں آیا مگر یہ خاکہ اس کے
دماغ میں کبھی برس پڑا رہا۔ پھر اُس نے فرینکفورٹ میں کچھ لکھ کر قلم روک لیا۔ غرض اس نام کو اُس نے لکھی دفعہ چھوڑا اور اٹھایا
کہیں دونوں کی محنت کے بعد پورا کیا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ یروشلم کی موت نے افسانہ کا ایک معمولی خاکہ اس کے ذہن میں تیار کر دیا
ہو مگر لکھنے کی نوبت نہ آئی ہوا اس لئے کہ اس زمانہ میں وہ زیادہ تر نقاشی اور مصوری میں مصروف رہا۔ پھر جب طبیعت مائل ہوئی تو لکھنے لگا
اور اُس کو پورا کر دیا۔

بہم بتا چکے ہیں کہ فرینکفورٹ میں اس کی طبیعت کو افسر لگی نے گھیر رکھا تھا۔ دل برابر ناخن غم سے کاوش کا تھا نہ کرتا تھا۔ لٹلے کی
خاندانگر میرد شکیب یاد آتی تو دل بے اختیار ہوجاتا۔ وہ ویزلر کی نیت نکالا۔ وہ فردوس گوش ”یاد دل سے محو کرنا چاہتا تھا اسی لئے
اُس نے نقاشی و مصوری کی طرف توجہ بھی کی تھی مگر نا کام رہا۔ آخر اس نے اپنی روحانی کاوشوں اور اندرونی پریشانیوں کو کم کرنے
کی ایک تدبیر سوچی اور وہ تدبیر یہ تھی کہ دنیا والوں کو بھی اس سوز غم میں شریک کر لیا جائے تاکہ جو آگ ایک سینہ میں جل رہی ہے اگر وہ سب
کے سینوں میں جلنے لگ جائے تو شاید اُس کی سوزش بھی کم ہو جائے اس خیال سے ویزلر کی داستان کو اُس نے ایک ادبی تصنیف کا آڑ
بنانکر دینے کے سامنے پیش کیا

سناتے ہیں انھیں افسانہ نویس بہانے ہیں یہ عرض دعا کے

مگر یہ واقعہ رہے کہ وہ پھر کے قصہ کا اہم آخری جزو خود گوٹے کی ذاتی تجربات سے بالکل مختلف ہے۔ البتہ دل باب کا بیشتر حصہ

گوئے مکی داستان ویزلر کا ایک رنگین ورق ہے جس کو وہ غلوٹے سے لہرے کے ساتھ میل کر تا ہے۔ گوٹے درتھر نہیں ہے۔ گو ایک حد تک دونوں کی سیرت بہت ملتی جلتی ہے مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گوٹے خارجی دنیا کے حالات سے آشنا، اپنے اپنے اظہار رکھنے والا انسان ہے۔ اس کا عشق کبھی جنون کی اس حد تک نہیں پہنچا کہ خودکشی کی نوبت آئی جو جیسے کہ درتھر کو پیش آئی۔ اس کا قدم میدان زندگی میں نہایت مستحکم طریقہ پر پڑتا ہے۔ وہ منزل عشقی میں اپنی تمام دارنگی کے باوجود کہہ سکتا ہے کہ

باچنیں زور جنوں پاس گرہاں داشتیم در جنوں از خود نہ رفتی کارہم دیوانہ نیست

اور درتھر سراسر تخیل و جذبات کا بندہ ہے کبھی خوش کبھی ناخوش۔ فطرت کے دل خوش کن مناظر سے آخر میں اس کو تکلیف ہونے لگتی ہے اور سب سے بڑی سرت اُس کو آشکارا ہی میں ملتی ہے۔ درتھر کی سیرت کا یہ رنگ یہ روشم کی سیرت سے ملتا جلتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوٹے نے اپنی اور یہ روشم کی سیرت کے باہمی امتزاج سے درتھر کی تشکیل کی ہے۔

فہرہ غلوٹہ اگر اُس کی طبیعت ادب سے ہٹ کر مصوری وغیرہ کی طرف مائل ہو گئی تھی لیکن تشنگی کے موسم گرما میں اُس کی طبیعت میں لکھنے کا جوش پیدا ہوا اور جوش کا پیدا ہونا تھا کہ اُس نے اپنے کو تمام کاموں سے علیحدہ کر کے درتھر "کلبنا شریع کیا اور ٹھیک ایک مہینہ میں ختم کیا۔ سال کے آخر میں یہ انسان چھپ کر شایع ہو گیا۔

”درتھر“ کا قصہ

درتھر ایک نہایت تیز حس رکھنے والا نوجوان ہے جو شاید گوٹے کا ہم عمر ہے۔ بلا کا ذہین ہے قابلیت بھی ایسی ہے کہ جس کام میں لگا دیا جاتا اسکو اچھے طرح پورا کر لیا مگر پہلو میں ایسا حسن پرست دل ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ

الفراق اے ہجو نگین، الوداع اے عقل و دین

طبیعت میں طوفان کا سا جوش ہے اور قدرت نے ایسا رنگیں تخیل عطا کیا ہے کہ عارض گل و شفق کی سرخی کو اپنے ہی خون دل کی لالی سمجھتا ہے۔ مناظر قدرت کے نظارہ سے بقدر تخیل بھر ابرو جاتا ہے۔ پابندیوں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں اسکے لئے بلائے جان ہیں۔ آزادی کا دم بھرتا ہے اس وجہ سے لو کہی وغیرہ میں اس کا جی نہیں لگتا ایک دوسرا نوجوان نہیں لازم بھی ہو گیا مگر آخر استغفار دیکر علیحدہ ہو گیا انسان میں کہیں اس کے باپ کا ذکر نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد اُسکی ماں نے کسی دوسرے قصید میں جا کر سکونت اختیار کر لی ہے۔ درتھر کو بچپن میں نہایت مرست و شادمانی کے عالم میں گذرا البتہ استاد کی قہجی کبھی نہ گوارا ساعت ضرور میرا کر دیتی تھی۔ دادی جان پر یوں کے قصے سنایا کرتی تھیں قصہ کے سامنے پہاڑ اور دریا کا منظر کافی دلچسپ تھا۔ محمد کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود خوب ہوتا مگر کھیل کی حد عبور کے دودرخت تھے جن سے آگے وہ نہیں بڑھتا تھا اور اسی حد پر کھڑے ہو کر تخیل کے زور سے پہاڑوں کے اندر یعنی مناظر کی میر اور دریا پر سفر کرتا بچپن کے آخری زمانہ میں کسی لڑکی سے ملاقات ہوئی جو اس سے عمر میں بڑی تھی۔ اُس کی ہم نشینی سے درتھر کی تمام خفیہ قوتیں میدان ہونے لگیں اور

اُس کو اپنے دل کی گہرائی کا احساس ہونے لگا لیکیں اُس کی صحبت دیر پائا بت نہیں ہوئی کیونکہ وہ کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئی وہ پھر پھر غم و الم کا شکار ہو کر تہائی کی زندگی بسر کرنے لگا اور اس دوران میں پھر ایک بار کیلیو لڑا سے ملاقات ہوئی جو خود در پھر بد عاشق ہو گئی مگر در پھر اُس سے کسی طرح دور رہی رہا۔ یہ زمانہ بہر حال لطف سے گزرتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بچپن کی مصمصانہ اور بے فکری کی زندگی نے نکل کر شباب کی خار دار وادی میں قدم رکھتا ہے جس کا ہر جلوہ نظر فریب اور جس کا ہر رخ جگر درز ہے یعنی کا خوشگوار مینہ ہے وادیاں اور مغزار دل کو لکھاتے ہیں۔ ہمارے طراوت گذری پیدا کرتی ہے۔ نفا میں تنگی کو مصروفِ رقص دیکھ کر بے اختیار پرواز کی خواہش ہوتی ہے سرشاری اور بے خودی کا عالم ہے۔ ہنگامہ کسی نو بہار ناز کی طلب میں محسوس ہے کہ آخروں کی مراد پوری ہوتی ہے یعنی جون میں ایک محفل رقص کے موقع پر ایک حیدر شاد سے ملاقات ہوئی ہے اس کی نگاہ مباحازہ سے در پھر کا دل بے اختیار چلے گیا اور دل کے ساتھ صبر و قرار بھی رخصت ہو گیا۔ در پھر اسی روز سے برابر شاد کے مکان پر جاتا ہے اور اس کے پاس بیٹھ کر باتوں میں اُس سے دل بہلاتا ہے۔ گو اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ شاد ایک شخص البرٹ سے منسوب ہے مگر در پھر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ گذرتے ہیں کہ جولائی کے آخر میں شاد کا ملنگ البرٹ آتا ہے حالانکہ البرٹ ایک سیرت اور نفا میں جوش سے خالی ہے مگر اس کی آمد ہی سے در پھر کی حرارت عشق سر ہلنے لگتی ہے اور اب اس کی طبیعت میں نودہ لگی کسی روانی باقی ہے جو اندوہ و المانہ شیطانی۔ وہ معاملہ کی نزاکت کو سمجھتا ہے مگر تب بھی کچھ نہیں کرتا نہ نظر قدرت کی دلفریباں اب اس کے دل میں کوئی شوق نہیں پیدا کرتیں یعنی توجہ جذبہ منظر قدرت کی طرف سے اس کے دل میں محبت پیدا کر کے اس کو مسرت و شادمانی سے بخود کر دیتا اور بدست کی ساری نعمتوں کو اُس کے سامنے پیش کرتا تھا اُس ناپ ایلک قابلِ رواشت درود میں کی ہر شے اختیار کر لی ہے اُس نا امید زندگی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ البرٹ سے خود کشی پر بحث کرتا ہے۔ پھر آگے چلکر اُس کے سامنے سے سارے حمایت اٹھ جاتے ہیں اور تبرک کا گدھا حتمی پھیلا ہے ہوئے بھیاں گل ملازمین دکھائی دیتا ہے اور وہ زندگی کے فانی ہونے پر بحث کرتا ہے ان باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا داغ اب تندرست نہیں رہا۔ اس کے دوست و اہل کرم کو جب در پھر کے ان خیالات سے آگاہی ہوتی ہے تو وہ در پھر کو بار بار دہان سے چلے آنے کی تاکید کرتا ہے مگر در پھر کوئی نہ کوئی بہانہ دھونڈھ کر کرک جاتا ہے بالآخر اسے ستمبر کو در پھر چلا آتا ہے یہاں دل بابت تم ہوتا ہے۔ دوسرے باب کے شروع ہی میں ہم کو علم ہوتا ہے کہ در پھر کسی سفارتخانہ میں نشی کے عہدہ پر مامور ہو گیا ہے کام میں مشغول رہنے سے اُس کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا ہے اور کام بھی وہی لگا کر کرتا ہے مگر سیرت ان بن ہو گئی کیونکہ سیرت پڑے مزاج کا آدمی ہے اور کاغذات و غیرو میں زبردستی ناخود و غیرہ کی باندی کراتا ہے دوران ملازمت میں اُس کو دہان کے اُرداسے لئے کا موقع ملتا ہے اور ان کے اس کا طریق کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر جس میں منصب کی لالچ کا نمایاں حصہ ہے اُس کو غصہ بھی آتا ہے اور انہیں بھی اسی طرح سال ختم ہو جاتا ہے۔ فروری میں اُس کو شاد کا اد البرٹ کی شادی کا حال معلوم ہوتا ہے اور وہ اُن کو مبارکباد دیتا ہے۔ مارچ میں طبقہ امراء میں اُس کا ایک دوست کاؤٹھ مل اُس کو دعوہ کرتا ہے جس دن در پھر کاؤٹھ کے یہاں جاتا ہے اتفاق سے اُسی روز کاؤٹھ کے یہاں اُمرار کے مجمع کا دن ہے اُمرار کو منصبدار درجہ کا بہت خیال ہے۔ وہ کسی کم درجہ کے آدمی سے ملنا اپنی ہینک سمجھتے ہیں۔ در پھر وہاں بھولے سے ٹھہر جاتا ہے اور ایک جانی چالی

لوہی صبا میں کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس وقت جواب سے احتراز کرتی ہے آخر درخت پر کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیے درخت اس پر بہت برہم ہوتا ہے اور اسی غصہ کی حالت میں گھر آتا ہے اور اسی مہینہ میں منعفا دیدیتا ہے عشی میں ایک پرنس کے ساتھ سیر و تفریح کی خاطر اس کی دعوت پر اس کے یہاں جاتا ہے مگر اصل مطلب اس سے فوج میں داخلہ کی سفارش کرنا ہے پرنس اس خیال کی مخالفت کرتا ہے جس سے درخت اس خیال سے باز آ جاتا ہے جون کے آخر میں پھر وحشت دل مسکو شارٹ کی طرف لیجاتی ہے البتہ اُس کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن اب وہ زمیں پر ہی نہ وہ آسمان، نہ وہ دل رہا اور نہ وہ حوصلہ۔ ہر چیز اُسے بیگانہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس کو کسی چیز سے لطف نہیں ملتا کیونکہ زندگی کا سارا آرام جو غم کی افزائش اور آنسوؤں کے گرم تپوں میں نہاں تھا چلا گیا۔ اب وہ گریہ سہی رہا نہ وہ آہِ چشمی رہی گو شارٹ اب البرٹ کی دفاشاریویں چلی ہے مگر زندگی غلامت کے وہ آزادی کے مزے ابھی تک دماغ سے محسوس ہوئے۔ شارٹ اپنی اور درخت کی طبیعت کی ہم آہنگی محسوس کرتی ہے اور درخت کی شادی اپنے کسی دوست کے ساتھ کر کے درخت کو اپنے نزدیک ہی رکھنا چاہتی ہے۔ درخت وہاں کچھ دن اور رہ جاتا ہے مگر اس کا دل نہ تو مقصد کی تڑپ سے معمور ہے اور نہ امید کی چمک سے اسے عزم میں استقامت ہے مستقبل کا وہ خیال کہ کتاب ہے تو لرز جاتا ہے۔ ان افکار کے هجوم میں اُس کو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے لیکن اس گہری تاریکی میں ایک دلچسپ چیز جو ”ذیل سحر“ کا کام دے سکتی ہے اور وہ مذہب ہے۔ وہ مذہب کی طرف جھکتا ہے مگر وہاں بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی فطرت کے مسیبا ناطر مثلاً طوفان و سیلاب سے اُس کو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جاڑے کی ٹھنڈی اور تاریک طوفانی راتوں میں وہ تما سیر کو نکل جاتا ہے لیکن وحشت کسی طرح کم نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ اب آسکا وقت قریب آتا جاتا ہے اور پھر اسی اضطراب میں وہ موت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ٹھان لیتا ہے مگر مرنے سے پہلے اس درد مند عشق کی ایک خواہش ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شارٹ کے دیدار سے پھر آنکھیں منور ہو جائیں آخر البرٹ کی عدم موجودگی میں کس سے ایک دن قبل شام کو وہ شارٹ کے یہاں جاتا ہے اور اوسیان کا ترجمہ پڑھتا ہے اوپر سے پڑھتے دونوں بیتاب ہو کر روتے ہیں پھر دونوں اسی بیقراری کے عالم میں ہم آغوش ہوتے ہیں اور درخت شارٹ کے عفت تاب بچوں پر صدمہ بوسہ شوق دیتا ہے۔ شارٹ فوراً اپنے کو درخت کی اس بے راہ روی سے چھڑا کر پاس والے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ درخت مایوسی اور نامرادی کے عالم میں بکارتا ہے مگر وہاں جواب نہ دے کر واپس چلا آتا ہے اور دوسرے روز البرٹ سے ہسپتال منگو اگر ٹھیک ۱۲ بجے رات کو خود کشی کر لیتا ہے۔

یہ سوال کر رہی ہے۔ کس کے گھر جائیگا سیلاب نہا میرے بعد؟
 درخت کی موت ایک ایسی شریف النفس ہستی کی موت ہے جس پر صاحبانِ دل جتنا ماتم کریں کم ہے۔ درخت میں صحیح جذبہ عشق کے ساتھ انتہا درجہ کی غیرت اور جماعی ہے۔ وہ اپنے نفس کی عزت کرتا ہے اور کسی قسم کی بے عزتی برداشت نہیں کرتا۔ وہ مکر و دلدل پر رحم کرتا ہے اور ظالموں اور بدناموں کا جانی دشمن ہے۔ وہ قدرت کا شیدائی اور حسن کا بہنثار ہے۔ مگر اُس کی سیرت کا سب سے بڑا نقص اُس کی قوتِ ارادی کی کمزوری اس کی تلون مزاجی اور کبابی ہے لیکن ہم ان باتوں کے باوجود اس سے محبت کرتے ہیں اور اُس کی کمزوریوں پر پردہ لگاتے

ہیں کیونکہ اس کا دل اتنا آزادک اور حساس واقع ہوا ہے کہ عشق کی ناکامی اسکی طبیعت کا فطری سوز و گداز اور سوسائٹی کی بد اطواری اسکو تو بد چینی ہے لہذا نہ کی ابتدا ہی سے ہم کو درتھر کے المناک نتیجہ کا کچھ گچھ گمان گذرنے لگتا ہے اور جب وہ آگے چل کر مغموم رہنے لگتا ہے اور خود کشی پر بحث کرتا ہے تو یہ گمان یقین سے بدل جاتا ہے اور اسوقت معلوم ہوتا ہے کہ اسکی قسمت کا راز اسکی سیرت میں پوشیدہ ہے۔ درتھر ہر چیز کو تحلیل کی نظر سے دیکھتا ہے وہ تحلیل کا عاشق اور جذبات کا بندہ ہے آخر میں وہ خارجی ماحول سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور اس کی فطرت تاریک و متضام خیالات کا گہوارہ اور رنج و الم کا مسکن بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے لئے یہ دنیا بالکل ناموزوں جگہ ہے اور ایسا آدمی یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ ہاں اگر تحلیل کے ساتھ عمل بھی ہوتا تو درتھر کو اپنے ماحول کی مشکلات کا احساس ہوتا اور تب شاید اس کی جان بچ جاتی۔ خالی تحلیل زندگی کے لئے سخت خطرناک ہے کیونکہ ایسا تحلیل قوی کو مضحک کر کے زندگی کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر زندگی قائم رکھنا ہے تو تحلیل کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ عمل کے اس فقدان سے ”درتھر“ تحریک طوفان و بیجاں سے ایک علیحدہ چیز بن گئی ہے اور چونکہ اس میں اس تحریک کا انفعالی اثر ہے اس لئے ہم اس کو دو بابت کا منظر کر سکتے ہیں جہاں عمل کے بجائے سراسر جذبات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ پنپولس نے ”درتھر“ پر راسخ زنی کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”درتھر کی طبعی افسردگی اسکی خود کشی کا باعث ہوئی حالانکہ اس کی خود کشی کی وجہ اس کے ناکام عشق کو ہونا چاہئے تھا۔ پھر اس کی افسردگی میں اس کے مقابلہ کی ناکامی کو بھی دخل ہے“ یعنی پنپولس اس کو خلاف فطرت قرار دیتا ہے۔ ہر ڈر کا اعراض تھا کہ یہ آرٹ کا نقص ہے گوٹے نے ان دونوں اعتراضوں کو صحیح مان لیا اور خاموش ہو گیا لیکن جارج ہنری ملز کا خیال ہے کہ گوٹے نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح اور عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ درتھر کا آخری حصہ پر شکم کی داستان کا چرہ ہے اور جب اصلی واقعہ یہی ہے کہ برنڈلم کو عشق میں اور قاصد کے حصول دونوں میں ناکامی ہوئی تو پھر نتیجہ خلاف فطرت کیسے ہو سکتا ہے۔

درتھر کے بعد ہم جس شخص سے روشناس ہوتے ہیں وہ درتھر کی محبوبہ شارلٹ ہے۔ شارلٹ کسی حد تک خیال پرستی کی شکار تو ضرور ہے مگر گھر کے کاروبار اور بچوں کی دیکھ بھال سے اس میں یہ جذبہ درتھر کے جنون تک نہیں پہنچتا۔ وہ اپنے شوہر کی وفا شعار بیوی بھی ہے اور درتھر سے اس کو طبعی مناسبت بھی ہے مگر وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتا جابتی جس سے درتھر کو کسی قسم کی بیجا محبت ہو۔ شارلٹ کا شوہر البرٹ فی الواقع کیرسٹر کی شبیہ ہے مگر فقیریں کیرسٹر سے بہت مختلف ہے وہ ایک تین خشک مزاج سرکاری ملازم ہے۔ ہر چیز کو عقل کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گو اس میں اور اسکی بیوی کی سیرت میں بڑا فرق ہے مگر وہ اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا ہے۔ ان تینوں شخصوں کے علاوہ اور بہت سے اشخاص سے ہماری پر لطف ملاقات ہوتی ہے جن کی سیرت کے متقد و پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

”درتھر“ کی شہرت

”درتھر“ شائع ہوئی تو لوگوں نے اسکا نہایت پر جوش استقبال کیا کیونکہ اٹھارہویں صدی کی ساری جذباتی خصوصیت اس میں صاف

جھلکتی تھی اور یہ گوئے کا طرہ کمال تھا کہ اس نے درخت پر کو اس عہد کا ایک ایسا مکمل آئینہ بنا دیا جس میں شخص اپنے جذبات کی صحیح تصویر دیکھ سکتا تھا اس عہد کی خاص خصوصیت خیال پرستی ہے جو ایک روحانی بیماری کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ جذبات کی آگ کو بجائے عمل کے آسٹوں سے بجھانے کی کوشش کیا جاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ بے اختیار ہمو کر پھوڑ کر تھے۔ لب لہجہ میں بیقراری اور دھندلا کا قبضہ ہو گیا تھا ایسی راز پر عقلیت کی قلت نے مذہب میں انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ مسیحیت پر سخت عقلی تنقیدیں اب ہر جہت تھیں جس سے شک و متذہب کی عام روحانی وابستگی اور یہ مذہب کے علاوہ فلسفہ اخلاق و سیاست عرض زندگی کے تمام شعبوں پر حادی ہو گئی لوگ قدیم روایات پر بیدردی سے نکتہ چینی کرنے لگے۔ "ترقی" کی آواز لوگوں کو پریشان کرنے لگی۔ آزادی فکر و آزادی عمل کی ہر طرف پکار مچی۔ اس جنگ میں سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہونے لگا اور اس برہمی کا سب سے بڑا شکار شاہی دیہات کی مقدس رسم ہوئی خیالات کے اس جوش میں خانگی زندگی کی دیوار بھی بھی محفوظ نہ رہ سکیں یعنی بہت سے زندہ دل ایسے تھے جو خدای کی بابرک رسم کو بے پشت ڈال کر بجائے اپنے ہمسایوں کے ان کی بیویوں سے کھلم کھلا محبت کرتے تھے۔ عرض یہ سارا آتشگیر مادہ یوں ہی تیار ہو رہا تھا کہ گوئے نے "درخت کی چنگاری" اس میں ڈال دی اور اس چنگاری کا پٹا تھا کہ سارا مادہ چشمزدن میں اڑ گیا۔ گوئے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب کا نہایت زبردست اثر پڑا کیونکہ اس نے اس عہد کی خصوصیتوں کو چھیڑ دیا جس طرح ایک دیاسلائی دکھانے سے بارود سے بھری ہوئی سرنگ اڑ جاتی ہے اسی طرح میری تصنیف سے زبردست دھماکا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے عہد کے نوجوانوں نے اپنی زندگی کو کھوکھلا کر کے بارود کی سرنگ کی طرح بنالیا تھا اور زور بھی اس لئے زیادہ تھا کہ اس میں اس عہد کے تمام بجا مطالبات، آنا آسودہ خواہشات اور خیالی تکالیف کا ہر جوش طریقہ سے ذکر کیا گیا تھا۔ عوام سے اس بات کی خواہش کرنا بالکل فضول ہے کہ وہ دنیا کو فنی کی نظر سے دیکھیں۔ واقعہ اس کا صرف نفس مضمون دیکھنا گیا۔ میرے بعض دوستوں نے بھی اس کو اسی نظر سے دیکھا اس کے ساتھ ساتھ وہ پرانے توصیف بھی ظاہر ہوا کہ ہر چھپی کتاب میں کوئی اخلاقی سبق ضرور ہونا چاہئے، لیکن زندگی کی اصلی تصویر میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی کیونکہ زندگی نہ تو مراقب ہے اور نہ مذمت کرتی ہے بلکہ احساس اور عمل کو قدرتی نتائج کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا سبق ہے۔" کا ملائی کا خیال ہے کہ "اس عہد کے اثرات کو تمام لوگ محسوس کرتے تھے مگر ان اثرات میں آواز صرف گوئے نے پیدا کی اور گوئے کی شہرت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اپنے دل میں اس نے وہ چیز محسوس کی جو اس عہد کے ہزاروں دلوں میں چھپ رہی تھی اور اپنی خدا داد تخلیقی قوت سے جو شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کا حصہ تھا، اس نے اس احساس کو ایک صورت میں شکل کر کے اس کا نام رکھا اور اس کی جائے سکونت بھی تیار کر دی۔ اپنے اس کارنامہ سے وہ اپنے عہد کی زبان بن گیا۔" درخت کے شہرت کی ایک جدا اور بھی تھی یعنی یروشلیم کی خود کشی کا واقعہ بھی نازد تھا اس کی موت کی تفصیلات سے عام و خاص دونوں لوگوں میں سخت چھینی پیدا ہو گئی تھی اور جب "درخت" شائع ہوئی جس میں یروشلیم کے واقعہ کو فنی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا تھا تو لوگ بے اختیار "درخت" کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ لکھا جاتا ہے کہ جرمن زبان میں آج تک "درخت" جیسی شہرت و مقبولیت اور کسی

تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی اور نہ کسی ملک کی کسی ادبی تصنیف نے بھی آج تک اتنی جلدی اتنی عظیم الشان شہرت پائی۔ لوگوں کے پرچون استقبال کی نوبت یہاں تک پہنچ کر تو جو انوں نے درتھو کی طرف پلٹنا نہیں شروع کر دی درکنوں نے بھلا نام نہانی طور پر یہ طرح زندہ دلان بن کر خود کشی بھی کر لی۔ کتنی بیویاں اپنے خشک مزاج شوہروں سے عاجز آ کر کسی رنگیں مزاج درتھو کی دلنواز صحبتوں سے لطف اٹھانے کی آرزوئیں کرنے لگیں۔ ادب میں بھی درتھو بہت بڑی طرح سہاوت کر گئی۔ درتھو اور شارٹ پر نگلیں لکھی گئیں جنھیں عوام سڑکوں پر کاتے پھرتے تھے۔ خیر جرم میں تو یہ سب ہوتا رہا مگر یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی شہرت بہت جلد ہو گئی۔ فرانس میں اس کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور انگلستان میں اس کا پہلا ترجمہ فرانسیسی سے شائع ہوا۔ تھوڑے دنوں میں گوئے یورپی ادب کی ایک نہایت ممتاز اور قابل احترام ہیسی تسلیم کیا جانے لگا، اور دونوں وہ صرف ”درتھو کے مصنف“ کی حیثیت سے مشہور رہا۔ لیکن ”درتھو“ کو صرف اٹھارہویں صدی کی خیالی پرستی کا آئینہ ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ ”درتھو“ ایک ایسے زخمی دل کی پکار ہے جو خیالی پرستی کا عہد ختم ہو جانے کے بعد بھی آج ہماری توجہ کو کاوش واضطراب کے ساتھ اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ کون ہے جسکی آہوں سے افسانہ سوز و گداز نہ ٹھکا ہو اور کون ہے جو حادثات زمانہ کے میر جم ہاتھوں سے محفوظ رہا ہو جب تک میلہ انسان میں برنج والم کا داغ اور درد کی خلش موجود ہے اور جب تک دل کے کلبے اٹکھوں کی راہ بندہ نکلنے کے لئے تیار رہیں۔ درتھو ایک زندہ اور غیر فانی پرستی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔

الف ۸

”درتھو“ کا طرز بیان

گوئے نے جو طرز تحریر اختیار کیا وہ ”درتھو“ کے لئے خاص طور پر بنوڑا تھا کیونکہ کسی فرد کی نفسی تصویروں سے ابھی اور کسی طرز میں نہیں پیش کیا جاسکتی۔ اس طرز کا سرانجام کرنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت پڑے گی۔ سترہویں صدی کے آخر میں انگلستان میں تھوڑے طرف طبقہ امرار کا ایک آلہ تفریح بن گیا تھا۔ عوام اور اوسط درجہ کے لوگوں کو اس میں مطلق بارش تھا۔ تھوڑے ہی مضامین اس کی ترقی کے لئے نہایت ناماز کار ثابت ہوئی کیونکہ عوام کا داخلہ بند کر کے اس نے تخیل و جذبات پر بھی بندش کر دی۔ اس بندش سے لوگ کسی ایسے ذریعہ کے تلاش کرنے لگے جو ان کے تخیل و جذبات کی خواہش اظہار کو پوری کرے۔ بالآخر اس خواہش کا ظہور افسانوں میں ہوا۔ تھوڑے ہی تخیل اور تخیل و جذبات کی خواہش اظہار نے افسانہ نویسی کی بنیاد ڈالی اور یہ بنا رہ روز استوار ہو کر ایک شاندار عمارت میں بدل گئی۔

اسی زمانہ کے ایک مصنف ریچرڈ سن (۱۷۹۱-۱۸۸۹) نے فوراً لوگوں کی اس اندرونی خواہش کو بھانپ لیا۔ ریچرڈ سن اوائل میں ایک چھاپہ خانہ میں ملازم تھا اور چونکہ پڑھا لکھا تھا اس لئے نو عمری ہی کے زمانہ سے نوجوان لڑکیاں اس کے پاس آ کر اپنے دوستوں کو مشیہ خط و لکھوایا کرتی تھیں خطوط لکھتے لکھتے اُس کو عورتوں کے جذبات و حیات سے کما حقہ واقفیت ہو گئی۔ خیر ایک افسانوں کی بنیاد اسکا یہی تجربہ ہے۔ ۱۵ برس کی عمر میں اُس نے اپنا پہلا افسانہ پائیل شائع کیا اور سات برس بعد اسکا شکار

کلیں لیا شائع ہوا۔ ان افسانوں کا طرز یہ ہے کہ ایک دو یا تین لڑکی خطوط کے ذریعہ سے اپنے کسی عزیز یا دوست کو آپ بیتی سناتی ہے اور اُس آپ بیتی میں وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کا افسانہ عشقی، پھر اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کا حال نہایت سوز و گداز کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ افسانہ خرمیں کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے۔ ریچرڈسن چونکہ طبقہ عوام خاص کا واسطہ درجہ کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھا اسلئے ان افسانوں میں اس نے انھیں کے نازک اور غمگین جذبات کی تصویر کشی کی رنگ آمیزی کے بعد بڑی استادانہ سی کھینچی ہے اس کے ناولوں کو یورپ میں بڑی شہرت ہوئی۔ فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے۔ مشہور فرانسیسی مصنف روسو کے افسانہ ”نیا یونان“ کا طرز ریچرڈسن ہی کے افسانوں کا ہے۔ جرمنی میں گیلٹ نے جولیا پٹرنگ میں ادب کا پروفیسر تھا ریچرڈسن کے ناولوں کا ترجمہ شائع کیا گوٹے خود گیلٹ کے لکچر میں من شام ہو چکا تھا اُس نے ان ترجموں کو مع روسو کے افسانہ کے شوق سے پڑھا اور جب دفتر لکھنے بیٹھا تو اُس نے ریچرڈسن کے طرز کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ریچرڈسن کے ناولوں کی سب سے بڑی خرابی اُن کی طوالت و ضخامت ہے۔ ایک اٹھویں کئی بار دہرایا گیا ہے۔ پھر واقعات کی رفتار بہت سست ہے۔ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکت جاتی ہے گوٹے نے ان خامیوں سے احتراز کیا اور ریچرڈسن کا صحائفہ دو واعظانہ انداز بیان بھی ترک کر دیا۔

افسانہ لکھنے کے تین طرز ہو سکتے ہیں۔ پہلا طرز تو وہ ہے جس میں افسانہ نویس آپ کے سامنے قصہ کو ابتدا سے لیکر انتہا تک بیان کر جاتا ہے گو اُس کی شخصیت ”میں یا ہم“ میں ظاہر نہیں ہوتی تاہم آپ برابر محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص پس پردہ افسانہ سناتا ہے۔ آپ افسانہ سننے میں مگر آپ افسانہ نویس کے واقعات پر کوئی تکتہ جینی نہیں کر سکتے۔ وہ واقعات کے معاملہ میں بالکل آزاد ہے۔ آپ کو پوچھنے کا مطلق حق نہیں کہ اُس کو واقعات کہاں سے ملے۔ وہ جو قصہ اور جس کا قصہ چاہے سنائے۔ یہ موجودہ دور کے افسانوں کا طرز ہے اور اس طرز کے مشہور افسانہ نگاروں میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ افسانہ نویس کا دوسرا طرز وہ ہے جس میں ساری داستان مصنف کسی نامور فرد داستان کی زبان سے ادا کرتا ہے۔ اُس میں داستان کے سارے جزوری اور غیر جزوری اجزاء اس ایک فرد کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں اور قصہ کی روانی اسی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی رہتی ہے۔ مصنف کی شخصیت بالکل پردہ میں ہوتی ہے۔ یہ طرز اب پرانا ہو چکا ہے۔ قصہ حاتم طائی اور باغ و بہار اسی طرز کی یادگار ہیں۔ داستان گوئی کا ایک تیسرا طرز بھی ہے یعنی افسانہ کا یہ دو یا خاص فرد خطوط کے ذریعہ سے اپنے واقعات و حیات کا اظہار کرتا ہے۔ گرد ویں اس طرز کا کوئی افسانہ نہیں۔ یہ خاص ریچرڈسن کی ایجاد ہے اور اس ایجاد کی وجہ اُس کی وہی عشقیہ خطوط نویس کا تجربہ ہے۔ اُس نے اول دو طرزوں کی خصوصیتوں کو ملا کر اپنے خاص طرز کی بنیاد ڈالی یعنی اس رفتار میں طرز میں واقعات پوری آزادی کے ساتھ ایک فرد کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ واقعات کی کئی حافی کلفتوں کی خبر دوسرے کو نہیں ہو سکتی ہے جس پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔ خواہ انسان کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ کرے لیکن دوسرے کے حیات و جذبات سے پوری آگاہی مشکل ہے۔ درتھر کی روح کی بقرا اسی اور تکلیف کوئی دوسرا نہیں بیان کر سکتا تھا اسلئے لازم تھا کہ خود ہی بیان کرے اور یہ بیان کسی دوسرے پر ظاہر ہونا چاہئے جہاں ہمارے خط کی شکل اختیار کر لے گا۔

ان خطوں کے لئے ایک مکتوب الیہ کی ضرورت ہے جو کاتب کا ایسا دلی دوست ہو جس سے کاتب اپنا تمام حال بیان کر سکتا ہو۔
 میں دہلم کی شخصیت بالکل ایسی ہے۔ وہ درخشاں دوست ہے مگر اس کی طبیعت دسترخویز کی طبیعت سے مختلف ہے۔ وہ زیادہ حقیقت پسند واقع
 ہوا ہے۔ وہ درخشاں ذہنی کیفیت دور سے دیکھ رہا ہے اور موقع بہ موقع اسکو مشورہ بھی دیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اب وہ درخشاں جنوں
 بہت تیز ہو گیا ہے تو اس کو شاد رکھنے کے پاس سے پلٹ آنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ وہ درخشاں کی تاکید پر چلا جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے
 کہ دہلم اصل میں گوتے کا دوست مرک ہے جس کو اس نے وزیر سے خطوط لکھے تھے اور ”درخشاں“ کے خطوط ایک حد تک مرک کے خطوط کا طرف
 شدہ چرچے ہیں مگر ان دونوں باتوں کو تسلیم کرنے کی کوئی شہادت نہیں کیونکہ سوائے دو ایک معمولی خطوں کے وزیر کے زمانہ کا گوتے کا کوئی بھی
 خط دستیاب نہیں ہوا۔ اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دہلم کو مرک سے کوئی تعلق نہیں اور ”درخشاں کے خطوط بالکل گوتے کے دماغ کا نتیجہ ہیں جن کو گوتے
 اپنی غیر معمولی تخلیقی قوت سے پیکر دس کے رنگ میں ایجا کیا۔ خطوں کا یہ سلسلہ آخر تک چلا جاتا ہے لیکن جب ”درخشاں کے احساسات قریب
 قریب جواب دیکھتے ہیں اور اس میں اتنی طاقت نہیں رہتی کہ دہلم سے باقاعدہ خط و کتابت کرے تو گوتے خود لکھنے لگتا ہے۔
 ان خطوں کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انکو پڑھ کر ہر دردمند دل بچپن ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں صرف واقعات کی تفصیل ہی نہیں ہے بلکہ
 حسن کی بے مہری و بے اتفاقی اور عشق کی نامرادی و ناکامی کی داستان بھی ہے۔ ان میں نفس انسانی کی جو تحلیل کی گئی ہے وہ شہو مہسنوں کی
 ضمیمہ ادبی کارناموں میں بھی نہیں مل سکتی۔ ایک ایک خط گویا دل کا ایک ٹکڑا ہے جو صفحہ کا غدیہ اس طرح چھٹا دیا گیا ہے کہ اس میں سے کبھی انتظار
 و تمنائے کا کبھی یاس و حیرانہ کے نظریے چمکتے ہیں۔ معاملات و جذبات پر قوت و تخیل کے زور سے ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ذرا سی تفصیل
 نہایت دلچسپ ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز پر خرد بین کا عمل ہو رہا ہے اگر لکھ جگہ بہاڑیاں اور دادیاں آنکھیں ہار میں دکھائی
 گئی ہیں جہاں چڑیوں کے چیمچ اور کیڑوں کی سریلی آواز سے سارا منظر ایک نغمہ زار نظر آتا ہے تو دوسری جگہ خزاں کی زردی، چارے کی آڑ برف
 باری، بارش کا سیلابا دہری کی ٹوک وغیرہ دل کی بے قراری کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ غرض مناظر قدرت کا ہر رنگ ایک ایک کر کے نہ صرف
 سامنے آتا ہے بلکہ انکا اثر جذبات پر بھی پڑتا ہے۔ ہمارے موسم میں ہر طرف رقص و سرود خوشی و شادمانی کا سماں دکھایا گیا ہے لیکن جب دھمکی
 ٹارکک طوفانی راتیں نہایت ہولناک صورت اختیار کر لیتی ہیں تو درخشاں کا دل بھی یاس و الم کا مسکن بن جاتا ہے اور یہی جیساں کہ خارجی
 مناظر روح پر اثر ڈال کر خطرناک انجام کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

ان خطوں کے اندر بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سیر بخت اور دلگاہا رہتی رنج و الم کی حالت میں اپنا افسانہ دل پر جوش
 طریقہ سے سن رہی ہے۔ تشبیہات و استعارات اغراق سے بالکل پاک ہیں۔ البتہ کہیں کہیں کٹے کٹے جملے نظر آتے ہیں
 جو خیالات کے ہجوم کا پتہ دیتے ہیں لیکن ان خطوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ”ان کی دلچسپی ہے۔ پڑھنے والا
 کبھی شروع کر کے چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ

دلچسپ تر و واقعہ مانیت قصہ تاریخ روزگار سر اپا نوشتہ ایم

۱۶۹۸۵
الف ۵۵

گوئے کا فلسفہ

خاندان سنی پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصور ارسا گوئے کے فلسفہ کے متعلق بھی لکھ دیا جائے تاکہ ناظرین کو اس کی جھلک اندازہ ہو جائے گوئے کی حقیقت کو شعلیت کو رسمی فلسفہ کے بھی شکس نہیں ہوئی کیونکہ رسمی فلسفہ انسان کو مجاہد حقیقت کے مجاہد کی طرف لہاتا ہے۔ اسے رسمی فلسفہ سے نفرت بھی تھی اس لئے کہ فلسفیوں کے مذہب میں شکل مذہب علم کا پلازمہ ہے اور گوئے شکل تدریب سے ہمیشہ بھٹکتا رہا لیکن اس مسئلے سے جو فلسفہ کی جان میں مثلاً کائنات کی حقیقت، انسان کا اس سے تعلق اور زندگی کا مقصد وغیرہ وغیرہ وہ برابر لپچپ لپتا رہا۔ وہ شاعر کا ناگزیر لیکر آیا تھا جس پر فطرت خود اپنا راز نکشف کرتی ہے اس لئے اس کو رسمی فلسفہ میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ ان مسائل کو شاعری کی حد تک سے دیکھتا تھا اور شاعری ہی کے زیر سے حقیقت کی اس بلندی پر پہنچا جہاں فلسفہ کی ساری دراز و دریاں کوتاہ ہو کر بچھے رہ جاتی ہیں۔

اسٹارس برگ میں وہ مشہور اطالوی فلسفی گیو رڈالو برنولڈ (۱۶۰۰-۱۶۸۷ء) سے روشناس ہوا جو وحدت الوجود کا قائل تھا۔ برنولڈ کا خیال تھا کہ کائنات ایک لامحدود حقیقت واحد کی ظہر ہے اور یہ لامحدود حقیقت زندگی کی تمام شرائین میں جاری و ساری ہے۔ برنولڈ کی تعانیف میں اس نے پختہ ذوق کے مطابق جو کل کا مطالعہ کیا تو مشوق نے مطالعہ کے میدان میں قدم اور بھی آگے بڑھایا تا آنکہ اس نے اسپنوزا کی تعانیفات بھی دیکھیں اسپنوزا کا قول ہے کہ اس کائنات کی روح رواں ایک عالم الہی حقیقت ہے اور اگر انسان اپنی فطرت سمجھ پر عمل کرے تو وہ اس حقیقت کا قرب حاصل کر سکتا ہے گوئے ان دونوں فلسفیوں کے خیالات سے بہت متاثر ہوا اور اس کا عقیدہ بھی بڑی حد تک ان دونوں سے ملتا جلتا ہے۔ گوئے کا خیال ہے کہ کائنات اور زندگی میں ایک آویزش و کشاکش جاری ہے اور یہ کشاکش سلسلہ بہ سلسلہ کائنات و زندگی کے تمام شعبوں میں موجود ہے انسان اس عظیم الشان کائنات کے سامنے اپنے کو مجبور رہتا ہے لیکن اسکی برابری خواہش رہتی ہے کہ کسی طرح اس کشاکش سے آزادی حاصل کیجائے لیکن روح کو آزادی اس وقت مل سکتی ہے جب روح کی تمام خفہ قوتوں کو بیدار کر کے ایک نظام عمل کے مطابق اس کشاکش پر فتح پانے کی مسلسل دستاورد و جدوجہد کیجے مگر کائنات پر فتح آخر کس قسم کی ہوگی؟ یہ فتح روحانی ہوگی لیکن اگر تمام نظام کائنات کو روح کی گہرائیوں میں پھیلایا جائے تو گوہار روح کی فتح ہوگی اور روح کھٹکا سے آزاد ہوگی بعض لوگ کائنات سے مرعوب ہو کر اور اکثر بدول ہو کر آزادی روح کی خاطر سنسان جنگلوں پہاڑوں اور غاروں میں جا کر زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ انکے خیال میں ترک دنیا سے روح کو آزادی ملتی ہے۔ آزادی روح ان کے خیال میں نام ہے ترک خواہشات کا نظام ہے کہ یہ فتح کا صورت آزادی روح کی جستجو نہیں بلکہ اعتراف شکست کا کھلا اعلان ہے اور اگر کسی طرح یہ فتح کبھی ہوتی ہے تو ہم غالب کی زبان میں یہ ہاں ہوس کی فتح سے تعبیر کر سکتے ہیں گوئے کی مسیح انسانیت کی خوب کم ہوتی ہے لیکن جو لوگ انسان ہوتے ہیں وہ اسی دنیا میں رہ کر روح کی آزادی کی کوشش کرتے ہیں اور اسکے لیے برابر جدوجہد کرتے ہیں گوئے ایک بلند پایہ انسان تھا اس لئے اس نے مؤثر انداز طریق اختیار کیا اسکا خیال ہے کہ روح کو فتح و کامرانی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان زندگی کے میدان میں کائنات کے مقابل میں ہم کرگی اعلیٰ اور تراز جوش و جدوجہد کھائے۔ روح کی خواہش آزادی اور جدوجہد میں مطابق بیکار کے کیلئے عمل کی کسوٹی اور روحانی تربیت کی ضرورت ہے تاہم تعبیر میں ہمیں ہو کہ کلاس جگہ کامیابی بقدر رسمی و کلاسی ہے پھر یہ نظام کیلچر ہے، یہ خود انسان کی فطرت ہے۔ ہر انسان کی فطرت کا کھانا ہے اور اس میں قوی کی انتہائی گنجائش ہے مگر ہر شخص کی فطرت دوسرے شخص سے کچھ کچھ مختلف ہوتی ہے اسلئے ہر شخص کا ادنیٰ فرض یہ ہے کہ اپنی فطرت کو معلوم کرے تاکہ اسکی روحانی ارتقاء کی ترسیل

بہاؤی طے ہو سکیں جس طرح ایک بیج ضرورت کے ترسے ایک تیار و درخت بن جاتا ہے اسی طرح انسان اگر اپنی فطرت پر عمل کرے تو وہ روحانی ترقی کے انتہائی طرح پہنچ سکتا ہے لیکن اس روحانی صلاح پہنچنے کے بعد بھی انسان انسان ہی رہے گا ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک تیار و درخت باوجود بڑھ جانے کے بچے سے علیحدہ نہیں ہو سکتا انسان اپنی فطرت میں بدل سکتا لیکن اگر اس روحانی صلاح پہنچ کر اپنی فطرت بدلنے کی کوشش کرے تو وہ خدا بننے کی کوشش کی تو وہ اپنی مع سے ہاتھ دھو بیٹھ کر کہے کہ انسان روح کا نہیں ہے اس کی سرشت ناقص اور محدود ہے اس کی قوت محدود ہے اگر وہ باوجود ناقص اور کمزوری کے اسلاف کے دلائل میں نفی اُحد سے جا کر طبعاً اپنی آئندہ مہمت ہے۔ دیکھ کر ہمارا دل درمیانوں اور چیلوں کی پرازدہ دیکھ کر قہر کی آواز دے گا کہ اے آدمی! تو کا نیکو خیر خواہ ہے مگر آرزو خیر نہیں کہو نہ تو خدا سے روح ملے نہ تیرے حال کی کمی ہے اور اس حقیقت اعظم سے روشناس ہو جاتی ہے۔

کائنات زندگی کی نشا کش کے علاوہ خورد زندگی میں طرح کی قومیں نکلتی ہیں۔ ایک طوفانی قوت ہے اور دوسری نظم و ترتیب کی قوت اور آواز ملنے کی تند تیز طوفان کی طرح بننے کی کوشش کرتی ہے اور تمام کا دلوں کو اپنے ساتھ سہا سہا لیا کرتی ہے۔ طوفانی قوت دراصل انسان کی بہت قوت تخلیق کا منبع ہے لیکن اگر اس کو کمال تک پہنچا دیا جائے تو سخت خطر کا ایضاً پہلے اس نے فوجی کلاس پیدا کر دی کہ اس کو فوجی نظم و ترتیب دے تاکہ اس کو ایک ایسے اسٹرپر لگایا جاسکے جو تمدن انسانی کیلئے مضبوط ہو گئے اپنی ابتدائی زندگی میں اس نے بہت طوفانی قوت کا حامل محتاج بن گیا تھا تو اس نے خود مختار بننے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اعلیٰ کے سفر سے اس میں تین تہائی کمی ہو جاتی ہے اور وہ اس کو کچھ سا تھکاتے تو اس نے فوجی نظم و ترتیب کا کائنات کوئی ایسی طرح نہیں سمجھا جس میں ہر شے کی گنجائش نہ ہو بلکہ کائنات میں چمک موجود ہے بشودہ ممالکی قوت پر اپنا کام کر رہی ہے اور ہر خطہ میں اپنی پیر کر رہی ہے کائنات کو وہ ایک محدود واحد قوت کا مظہر سمجھتا ہے جس کی ہستی ممکنات علیحدہ نہیں بلکہ اس کی گہرائی میں ہر لمحہ طرح و رنگ کے بے شمار ہیں یہی وہی قوت ہے جو کائنات سے تعبیر کرنا آسان ہے لیکن ہر جزو پر عمل کیا جاساں تو ہر جزو تباہ کر دیتا ہے نہ صرف اس جزو کی تعظیم اور زندگی کے ہر جزو کی پرورش کرتا ہے لیکن ہر جزو باوجود اس کے کل میں شامل ہے اور کل سے اس کا ہر اعضاء اپنی ہر ذریعہ حافی انفرادی حقیقت لکھتا ہے جسے ہم خود کی کہہ سکتے ہیں اور جزو سے اس حقیقت اعظم کا بلکہ دوسرے اجزاء کے مقابلہ میں اور خود کل کے مقابلہ میں ایک جگہ ملتا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ گوشتے انسان کو مختار مطلق سمجھتا ہے نیز ایسا نہیں کیا کہ انسان اپنی فطرت کے صحیح طور پر استعمال کرنے میں یقیناً آزاد ہے اور یہی آزادی ہے جو اس کی ترقی کی ضابطہ ہے لیکن وہ کائنات کے ہر جزو میں خودی کا مظہر ہو گا کہ انسان ہی حاضر قوت و قوت ہے جس میں اس کا عرصہ طبعیت بڑا جزو خود ہے کہ اگر انسان ہی وہ ہستی ہے جو اپنی خودی کے ذریعے اپنی دنیا پیدا کر سکتی ہے اور زمان و مکان کے حلقہ سے علیحدہ اور دلی حال کر سکتی ہے اپنی فطرت پر عمل کرنا اور دوسروں کو ان کی فطرت پر عمل کی آزادی دینا بھی گوشتے کے خیال میں شرم کی صحیح روح ہے۔ وہ مذہب کے رسم و رواج کا مجموعہ نہیں سمجھتا اور اسی لئے اس میں نقص نام کو نہ تھا لیکن جہاں تک روح کا تعلق ہے وہ مذہب کا خدائی اور پرستار تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں خدا پر ایمان لکھتا ہوں لیکن خدا پر ایمان رکھنے کے معنی میں کہ تمام مظاہر میں صرف اسی کی ذات کو تسلیم کیا جائے اور دنیا میں کچھ عبادت ہی ہے۔

انسان کو حقیقت کا علم ہے ہو سکتا ہے جگوٹے کا خیال ہے کہ حقیقی علم صرف مشاہدہ و ترتیب و استقرار سے حاصل ہو سکتا کیونکہ ہر چیز میں سرسری نظری میں اور عقل نہایت ناکافی ہے بلکہ بیشتر کھڑا و غلط ثابت ہو جاتی ہے فائوٹ میں ایک جگہ وہ قیطان کی زبان کہتا ہے کہ نظری علم بالکل نفع دینے کیلئے تیار نہیں اور اس کے مقابلہ میں زندگی کا درخت بڑا بھرا ہوتا ہے جو حقیقت زندگی کے گہر میں موجود کیونکہ ہر طرح اس صانعِ انزل کی تخلیقی قوت کا مظہر ہوتا ہے اس لئے اگر ہم غلطی نہ کریں اس کی قوت کو ہم حقیقت کہیں گے کہ اس کا گہر لیکن ہر گز اس کا گہر نہ لکھنا چاہئے مگر اس احساس کیلئے ضرورت ہے کہ انسان غور و فکر کی عادت پیدا کرے زندگی کا مشاہدہ کرے اور روح کو اس صانعِ اعظم کی تخلیقی قوت سے قریب کرے مگر انسان آخر غور و فکر و مشاہدہ کے بعد کس طرح عسلم حاصل کر سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ انسان کا غلط ہے کہ وہ کسی چیز کے علم میں اپنی طبیعت کے مطابق نہیں بلکہ باہر سے حاصل کر دیتا ہے مثلاً زہر کو لیجئے چونکہ زہر حیات انسانی کے لئے مضر ہے اس لئے اس کو خوب

کما جاتا ہے۔ گوئیے کتاب کے علم میں نفع و نقصان کا پہلو داخل کرنا صحیح علم کی راہ میں ایک بڑی درست سنگ راہ ہے اس کے خیال میں نوشہرہ عارف
 دونوں کی حیثیت ایک ہے اور اسی حیثیت سے دونوں کو دیکھنے کے لئے ”الصفات بیگانہ“ کی ضرورت ہے۔ فاؤسٹ میں وہ ایک جگہ شیطان کے قلم
 سے لکھتا ہے کہ ”تم کو دیوتاؤں کی طرح نیکی و بری دونوں کا علم حاصل کرنا چاہئے“ یعنی دونوں کو ایک نظر سے دیکھنے کے بعد تم کو ہی بصیرت
 حاصل ہو سکتی ہے جو دیوتاؤں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس مقام پر نفع و نقصان، رنج و راحت، نزد و دور، اور ظلم و ظور کی کوئی تیز نہیں رہ جاتی۔
 ڈاکٹر اقبال نے پیام مشرق میں سر دو انجم کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے بعض بند اس مفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہیں مثلاً

جلوہ گردش و در

بجگہ نمود را

رزم نمود و بود را

کشش وجود را

عالم دیر و زود را ، می گزیم دی رویم

انجمن میں تو یہ بیگانگی ممکن ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ہم سے بہت دور ہے لیکن انسان میں یہ بیگانگی کیسے پیدا ہو سکتی؟ گوئیے کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے اندر ایک
 ”غیرت اور خارجیت“ پیدا کر لیں تو ہم بھی ستارہ کی بے بسی پر پہنچ کر حقیقت سے واقف ہو سکتے ہیں مگر غالب اس ”خارجیت“ کو ایک خط میں
 یوں ادا کرتے ہیں کہ ”آپ اپنا تماشا ٹی بن گیا ہوں ، رنج و لذت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کا پناہ خانہ تصور کر لیا ہے۔“ اس طرح آپ اپنا
 تماشا ٹی بن جانے سے روح اور خارجی ماحول میں جو مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ علم کی جان اور صحیح تخلیق کا منبع ہے۔

اس سلسل میں فن اور فطرت کی بحث بھی سامنے آتی ہے یعنی فن کو آیا فطرت سے علمی و یا عین فطرت ہونا چاہیے۔ فن نام ہے اس اندرونی
 تخلیقی قوت کے اظہار کا جو ہر صاحب فن میں فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ چونکہ ایک صاحب فن فطرت کا ایک جزو ہے اس لئے جو کچھ اس سے
 ظہور میں آتا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہوتا ہے لیکن ہر صاحب فن کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی روحانی قوتوں کا اندازہ کرے اور اس سے
 واقف ہوئے کہ جو عمارت وہ کھڑی کرنا چاہتا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہو اور یہی سچی تخلیق ہے جو روح کو مجاز و حقیقت اور کیف و کم کے
 جھگڑوں سے بلند کرتی ہے اصل صاحب فن وہ ہے جو ان جھگڑوں سے گذر کر صالحہ اعظم کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔

اس طرح تمام نظام کائنات وحدت و کثرت سکون و حرکت، جدائی و استحکام، انسان و کائنات کے پردوں میں نہ صرف
 ہم آہنگی بلکہ ایک روحانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اعتماد خیال تھا کہ اس ترجمہ کو گوئیے کی مدد سالہ برسی کے موقع پر مایج ۱۹۳۲ء میں شائع کرتا اور اس ارادہ سے میں نے
 ۱۹۳۱ء کے اواخر سے کام لیا شروع کر دیا تھا مگر تھوڑے دنوں کے بعد واقعات نے کچھ ایسی کڑی دہلی کہ مجھ کو دوسری طرف متوجہ ہو کر قلم اٹھانے سے
 لکھ دینا پڑا۔ اس عرصہ میں وقت گزرتا جاتا تھا اور میں کچھ نہ کر سکتا تھا بالآخر بچہ ایسی خوشگوار صورت پیش آئی کہ میں نے قلم اٹھایا اور اس کام کو
 ختم کر دیا مگر جب خواہش یہ کام موقع پر انجام نہ پاسکا تاہم جو کچھ ہوا مناظرین تھی دیر کے بعد بھی اگر اسکو ہی موقع کے سلسل میں منسلک سمجھیں تو کیا اچھا ہو۔
 یہ لک لاٹبر بری۔ الہ آباد

دسمبر ۱۹۳۲ء

ریاض الحسن

نوجوان و تھر کی داستانِ غم

نوجوان ورتھر کی داستان غم

باب اول

خامہ ہمارا دم گرم من ست آتش از نے درستان می زخم

۴۴

وہاں سے چلے آنے پر میں کتنا خوش ہوں۔ میرے دوست! انسان کا دل بھی کیا چیز ہے۔ تم مجھ کو کتنے عزیز ہو اور تمھاری جدائی ناقابل برداشت ہے۔ بھلا میں تم سے چھوٹا کس طرح خوش ہو سکتا ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ اور یوں تو قدرت نے مجھ پر ستم توڑنے کے لئے معلوم نہیں کتنی چیزیں محبت کے لائق پیدا کی ہیں! ہاے غریب لیونورا! مگر میرا اس میں کیا قصور؟ کیا میں اس کی اس وقت کی محبت کا ملزم قرار دیا جاسکتا ہوں جب میں اس کی بہن کے حسن و لنوا میں محو تھا۔ نہیں ہرگز نہیں! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ تاہم کچھ نہ کچھ حصہ میرے سر بھی ہے اس لئے کہ میں نے اس کے جذبہ محبت کو شہ دی ہے اور اس کے اظہار محبت پر جو فی الحقیقت مسرت انگیز ہونے کے بجائے مفرح تھا، شادماں ہو کر اس میں اور اضافہ کر دیا۔ کیا مجھے ایسا فعل سرزد نہیں ہوا؟۔ لیکن آخر تمہیں بتاؤ کہ آدمی بھی کیا چیز ہے جو خود اپنا گلہ شکوہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ میرے شفیق دوست! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں اپنی حالت درست کروں گا اور اپنی معمولی سے معمولی گزشتہ مصیبتوں کو یاد کر کے جیسا کہ میری عادت رہی ہے، اپنے اوقات خواب نہ کروں گا۔ میں اب ماضی کو بھول کر صرف حال سے لطف اندوز ہوں گا۔ تم بالکل صحیح کہتے ہو کہ آج دنیا میں رنج و مصیبت کا کہیں نام نہ ہوتا اگر انسان (لیکن خدا جانے انسان کیوں الیا بنایا گیا ہے، اپنے تخیل کے زور سے اپنے گزشتہ آلام و مصائب کو یاد کرنے کے بجائے اپنی موجودہ حالت کو نہایت خستہ پیشانی سے برداشت کرتا۔

براہ ہمد بانی میری والدہ سے جا کر کہو کہ میں ان کے کام کی انجام دہی میں اپنی حسب قابلیت مشغول ہوں اور میں ان تمام باتوں کے متعلق مفصل طور پر ان کے پاس بہت جلد لکھنے والا ہوں

بچی صاحبہ سے حال میں ملاقات ہوئی تھی بجائے بد مزاج اور ترش رو ہونے کے جیسا کہ لوگوں نے اُن کو مشہور کر رکھا ہے وہ نہایت با سلیقہ اور خوش باش ہیں وہ زمرہ دل بھی ہیں اور خلیق بھی اور سینہ میں ایک نیک دل رکھتی ہیں میں نے اُن کو اپنی والدہ کی اُن غلطیوں سے آگاہ کر دیا ہے جن سے اب تک وہ واقف نہیں تھیں انھوں نے خود مجھ سے اپنا ارادہ و منشا ظاہر کیا اور ان شرائط کا بھی ذکر کیا جن پر وہ اپنے حصہ سے دست بردار ہونے اور ہم لوگوں کی طلب سے کہیں زیادہ دینے پر تیار ہیں۔ فی الحال میں اس امر کے متعلق زیادہ لکھنا نہیں چاہتا البتہ والدہ کو اتنا یقین بخور دلا دو کہ کام بہتر طریقہ پر انجام پا رہے ہیں۔ میرے دوست مجھے اس موقع پر پھر معلوم ہوا کہ دنیا میں نہایت مفید پرواز سی اور کینہ پروری کے لاپرواہی اور غلط فہمی سے زیادہ نقصانات اور تکلیفیں ہوتی ہیں۔ بہر حال ان دو اوّل الذکر چیزوں کا ظہور کم ہوتا ہے۔

میں اپنی موجودہ حالت میں خوش ہوں۔ اس ارضی جنت میں تنہائی میرے دماغ کے لئے ایک علاج شافی ہے۔ موسم بہار کی تازگی میرے اکثر شک کرنے والے دل کو مسرت اور روح کو فرحت بخشی ہے جس درخت کو دیکھو پھولوں سے لہا ہوا ہے۔ اس بہشت نما میں بس یہی خوش ہوتی ہے کسی طرح تلی نگر اس معطر فضا میں پرواز کروں اور اپنی ہستی کو ٹھکانے لگاؤں۔ لیکن خود قلعہ نہایت ناگوار ہے۔ البتہ اس کے آس پاس کے مصافات مناظر قدرت کی بے شمار دستکاریاں اور حسن آرائیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اسی وجہ سے کاؤنٹم نے پہاڑیوں کے اس ناتمام سلسلہ میں جس کی کڑیاں ایک دوسرے کو نہایت دلفریب طریقہ سے کاٹی اور وادیاں بناتی چلی گئی ہیں، ایک ڈھلوان پہاڑی پر ایک باغ لگایا تھا۔ سرسری طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغ معمولی ہے اور اسکا نقشہ کسی علمی یا فنی حیثیت سے نہیں تیار ہوا بلکہ کسی اہل دل نے اس باغ کی ترتیب محض لطف اور تفریح کے خیال سے دی ہے۔ میں اس کے متوفی ملک پر ایک اُجڑے ہوئے تاب خانہ میں جو اُس کی محبوب جگہ تھی اور آج میری ہے لٹھ آنسو رو بھی چکا ہوں تھوڑے عرصہ میں میں اس باغ کا مالک ہو جاؤں گا اس لئے کہ گزشتہ چند دنوں سے باغبان پر میرا تصرف ہو گیا ہے اور اس سے اسکو کوئی نقصان نہیں۔

میری روح میں موسم بہار کی ابتدائی صبحوں کی طرح، چمکا میں خوب لطف اٹھاتا ہوں، عجیب طرح کا آرام و سکون ہے میں تنہا ہوں اور اس جگہ تنہائی اور خاموشی سے مجھے زندگی کا بہترین لطف ملتا ہے۔ شاید اس قسم کی اکیلی جگہیں مجھے ہی جیسے لوگوں کے آرام و سکون کے لئے بنائی گئی ہیں میں اتنا خوش ہوں اور اپنی خاموش زندگی کے لطیف احساس میں اتنا گم ہوں کہ میں اپنی تمام اہلیت اور استعداد بھول بیٹھا ہوں۔ اس حالت میں کوئی تصویر نہیں بنا سکتا ہوں۔ تاہم میں اپنے کو ایک زبردست مصور اور نقاش تصور کرتا ہوں۔ جب تمام میدان میں ایک خفیف سا دھواں اٹھتا ہے اور جب آفتاب کی شعاعیں ٹھیک دوپہر کے وقت میرے گھنے درخت کے بالائی حصہ پر پرتی ہیں اور کچھ پتیوں سے چھن کر اندر بھی آتی ہیں تو اس وقت میں چشمہ کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا ہوں اور لیٹ کر ہزاروں کیڑوں کو ٹرڈوں کی ہستی کو محسوس کرتا ہوں۔ جب گھاس کی پتیوں میں اس چھوٹی دنیا کا ترنم سکرے شکار کیڑوں اور کوڑوں پر وقف تماشہ ہوتا ہوں تو اس وقت میں اپنے نہایت خالص دل میں اس مجلی ہستی کی چمک پاتا ہوں جس نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا اور جس کی عالمگیر محبت ہماری زندگی کا سکون اور جس کی ابدی رحمت ہماری حیات کا ستون ہے۔ میرے دوست! اس حالت میں میری آنکھیں بند ہوتی ہیں اور میرا دل دنیا و مافیہا کا مسکن بنا ہوا ایک ننوتہ کے حالت تصور کے مانند تمام احساسات اور رابطہ کا مرکز ہوتا ہے پھر میری یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش میں صفحہ کا غدا پر ان تصورات و اثرات کے اظہار پر اسی سوز و گداز کے ساتھ قدرت رکھتا کہ وہ میری روح کا ٹھیک اسی طرح آئینہ ہوتے جیسے میرا سینہ اس ہستی بے پایاں کا گنجینہ ہے لیکن اس معاملہ میں میری استطاعت کا کیا ذکر؟ میں تو صرف اس کی عظمت اور بزرگی کے تصور ہی سے بے قابو ہوا جاتا ہوں

شاید اس جگہ پر فریب ارواح کی آمد و رفت ہے یا یہ خود میرے فرش سے عرش تک جانے والے تخیل کی جولانی ہے جس کے اثر سے میرے ارد گرد کی ہر چیز بہشت کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ مکان کے سامنے ایک پتھر ہے جس پر میں لمبے سینا اور اس کی ہمیشہ کے مانند بہت فریفتہ ہو گیا ہوں پہاڑی

سے اترتے ہوئے ایک محراب ملتا ہے جہاں سے کوئی بیس قدم اور نیچے ایک مرمرین چٹان سے بلور کی طرح صاف شفاف پانی برابر اُبلتا رہتا ہے۔ اُس کے اوپر ایک چھوٹی سی دیوار ہے۔ چاروں طرف صفحہ صاف کا جھرمٹ سایہ کئے ہوئے ہے جس سے ٹھنڈک بھی کافی ہے۔ ان سب باتوں سے منظر نہایت خوشگوار اور پسندیدہ ہو گیا ہے تقریباً روزانہ میں وہاں جاتا ہوں اور کم سے کم ایک گھنٹہ ضرور وہاں بیٹھتا ہوں۔ نوھر لڑکیاں قصبہ سے پانی بھر لے آتی ہیں جو اُن کا معصوم اور ضروری مشغلہ ہے۔ اگلے زمانہ میں شاید باخشاہی کی لڑکیاں بھی پانی بھر کر تکیں اور جب میں وہاں آرام کرتا ہوں تو اسی نسبت سے عہد قدیم کا سارا بطریق تمدن میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور تخیل میرے سامنے وہ نقشہ پیش کرتا ہے جب خاندان کے بزرگ اشخاص چشموں کے کنارے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے حریفوں سے صلح کرتے یا اپنے حلیفوں سے رشتہ اتحاد و دوستی کو اور مضبوط کرتے تھے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چشموں پر کوئی نہ کوئی نیک فرشتہ ضرور مامور رہتا ہو گا۔ میرے دوست! جس نے تخیل کی آنکھوں سے یہ تماشا نہیں دیکھا اُس نے گویا موسم گرما میں ایک شیریں چشمہ کے کنارے سیر کے بعد ٹھنڈی ہوا کا لطف ہی نہیں اٹھایا۔

۱۳ ارمی

تم مجھے کتابوں کی لالچ دیتے ہو۔ میں تو اب ان سے تنگ آ گیا ہوں۔ خدا کے واسطے میرے پاس کوئی کتاب نہ بچھو۔ میں اب از سر نو راہ نمائی نہیں چاہتا اور نہ کسی اضطرابی اور التہابی کیفیت سے دوچار ہونا چاہتا اسلئے کہ میرے قلب کی گہرائیوں میں خود ایک جوش اور ایک ہیجانی کیفیت برپا ہے اور اس میں نغمہ اور شعر کی مدد سے میں کمی کا خواہشمند ہوں۔ ہومر کی تصنیفات سے البتہ سکون ملتا ہے بیشتر اوقات میں نے اپنی رگوں میں خون کی روانی کو کم کرنے اور بار بار قلب کے ناگہاں اور پر جوش جذبات کو روکنے کی کوشش کی ہے لیکن تم تو جانتے ہو کہ میرا دل کتنا متلون اور انقلاب پذیر ہے، مگر ان تمام باتوں کی قصر بجات کی چنداں ضرورت نہیں اور تم نے تو اکثر پریشان ہو کر میرے چہرہ کی کیفیت

۱۵ ہومر۔ قدیم ایشیائی یونان کا مشہور شاعر اپنی دو نظموں (اوڈیسی اور ایلیڈ) کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان میں اوڈیسیوس کے سفر دل اور تراوی کے محاورہ کا حال ہے۔ ان سے تاریخی دور سے پہلے یونان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا پتہ چلتا ہے، جب لوگوں کی زندگی قدرت سے ہم آہنگ نظر آتی تھی، تہذیب و تمدن کی خرابیوں سے انسان کو سوں دور تھا، زندگی پر تکلف ہونے کے بجائے سادہ تھی۔ گوٹے ہیمناس سالکی کا طبع ہلکا اور بے جہ سے ہو کر اُن کا لکھا ہوا

انتہائی رنج سے انتہائی خوشی میں، اور معمولی دلگیری سے تند جذباتی میں بسرعت بدلتے دیکھا ہے میرا دل گویا ایک بیمار بچہ کی طرح ہے اور اسی لئے میں اس کی ہر بات پوری کرتا ہوں لیکن بھائی یہ قصہ ہمارے تمہارے درمیان کلہے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ اس معاملہ میں بہت سے لوگ مجھ پر آوازے کیسے گئے۔

۱۵ مئی

مجھے اب یہاں کے سب لوگ خاص کر بچے بخوبی جان گئے ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ پہلی دفعہ جب میں نے لوگوں سے باتیں کیں اور پھر دوستانہ لہجہ میں اُن کے روزمرہ کے مختلف مشغلوں کو پوچھا تو کچھ لوگ سمجھے کہ اس سے شاید مجھ کو ان کی ذلت مقصود ہے اور یہ سمجھ کر وہ نہایت ترش روئی سے منہ پھیر کر چلے گئے۔ لیکن اس واقعہ کا میرے دل پر کوئی برا اثر نہیں ہوا بلکہ میں اپنے عقیدہ میں جیسا کہ میں نے بار بار تجربہ کیا ہے اور بھی پختہ ہو گیا یعنی ایسے لوگ جنکو بڑائی کا دعویٰ ہوتا ہے اپنے کچھوٹوں سے نہایت سرد مہری کے ساتھ دور رکھنا چاہتے ہیں اور اُن کو اس طرح کا خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ چھوٹوں کے پاس آئیں جائیں یا اُن سے ملیں ملائیں تو اُن کے رتبہ میں کمی آجائے گی بالکل یہی حال اُن کا ہلوں اور بے وقوفوں کا ہے جو اپنے آپ کو عقل کا پتلا سمجھتے ہیں اور چھوٹوں سے اگر وہ صرف اس لئے ملتے ہیں کہ چھوٹے لوگ اُن ”عقل مندوں“ کی صحبت میں اپنی بدتمیزی اور گستاخی کا احساس کریں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہم لوگ نہ تو برابر ہیں اور نہ برابر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عام لوگوں سے صرف اس لئے الگ تھلگ رہتے ہیں تاکہ اُن کی عزت ہو۔ وہ میرے خیال میں بزدل اور کمزور ہیں اور اپنی کمزوری اپنے دشمنوں کے سامنے شکست کے ڈر سے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پچھلی دفعہ جب میں اس چشمہ کے پاس گیا تھا تو میں نے وہاں ایک جوان کو کرنی دیکھی جو بے نیچے کے زینہ پر اپنا گھڑا رکھے ہوئے کسی ایسے شخص کے انتظار میں کھڑی تھی جو اُس کا گھڑا سر پر اٹھاوے۔ میں نے یہ دیکھتے ہی آگے بڑھ کر کہا کہ میں تمہارا گھڑا اٹھاؤں؟ یہ سنتے ہی وہ خراگائی اور بولی ”نہیں، نہیں، رہنے دیجئے“ میں نے جواب دیا کہ کوئی ہرج نہیں“ اور یہ

کہہ کر میں نے اُسکا کھڑا اٹھوا دیا۔ پھر وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔

۷۱ مئی

یہاں میری بہنوں سے جان پہچان ہو گئی ہے لیکن کوئی سو سائٹی نہیں۔ معلوم نہیں کہ مجھ میں کیا خاص بات ہے جو لوگوں کو میری طرف کھینچتی ہے۔ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے محبت کا بیج بکھارتے ہیں مگر مجھ کو افسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے اخلاص و محبت کے بڑاؤ کا بدلہ خاطر خواہ نہیں دے سکتا ممکن ہے تم مجھ سے سوال کرو کہ یہ لوگ کیسے ہیں؟ میرے دوست بس سمجھو کہ ایسے لوگ ہر جگہ مل سکتے ہیں، کوئی خاص فرق نہیں۔ انسان کی نسل ہر جگہ یکساں ہے۔ روزی کمانے کے لئے ان لوگوں کی بڑی تعداد محنت و مشقت میں اپنا زیادہ وقت گزاری ہے اور جو کچھ وقت بچتا ہے اُس میں ان لوگوں کو اتنی کوفت ہوتی ہے کہ اس سے نجات پانے کے لئے وہ پھر ہر طرح کی محنت کرتے ہیں۔ انسان کی تنگ و دو کا بس یہی حال ہے۔ لیکن یہ لوگ خوش مزاج اور نیک نہاد ہیں، ان کی صحبت میں اگر میں کبھی کبھی اپنے کو بالکل بھول کر ان معصومانہ تفریحوں سے لطف اٹھاتا ہوں تو کسائیہ میں ممنوع نہیں مثلاً بے تکلف دوستوں کی صحبت میں ایک صاف میز کے گرد آزادی اور اخلاص سے باتیں کرنا یا موقع سے کوئی محفل رقص یا سیر و تفریح کی خاطر سیر و سیاحت کا انتظام کرنا وغیرہ تو میری طبیعت پر ان باتوں کا اچھا اثر پڑتا ہے مگر تناظر و روبرو ہوتا ہے کہ میں اپنے تمام اُن اوصاف کو یک قلم بھول جاتا ہوں جو ہنوز میرے قلب کی گہرائیوں میں عدم استعمال سے بیکار ہوتے جاتے ہیں اور میں ان کو ابھی احتیاط سے پردہ میں رکھنے پر مجبور ہوں۔ افسوس! اس خیال سے میری روح پڑمردہ ہو جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ غلط فہمی کے ہم شکار ہیں۔

افسوس! آج میرے جوانی کے زمانہ کی ایک سچی دوست دنیا سے چل بسی۔ ہاے میں نے اسے جانا ہی کیوں! آج میں اپنے کو مخاطب کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ”اور تھر تم جو خواب دیکھ رہے ہو اس کی تعبیر یہاں آسمان کے نیچے ملنی مشکل ہے“ لیکن وہ میری رہ چکی ہے اور مجھے نانا ہے کہ کبھی میں بھی اُس دل کا مالک رہ چکا ہوں جس کی موجودگی میری تمام خفیہ استعداد کو بیدار اور میری روحانی قوتوں میں کافی اضافہ کر دیتی تھی۔ میری اس سے ملاقات بھی کیا ملاقات ہوتی؟

گویا میری وہ ساری مخفی قوتیں بیدار ہو جاتیں جن کی وجہ سے میرا دل قدرت سے ہم آغوش ہوتا
 ہماری صحبتیں لطیف جذبات اور ایسی تیز طبع کی دائمی یادگار ہوتیں جن کا بے شکاپن بھی خداداد
 الہیت کا نمونہ ہوتا۔ افسوس مجھ سے جتنے سال وہ بڑی تھی اسی حساب سے اُس کو مجھ سے پہلے قبر کے گوشہ
 میں آرام کرنا پڑا۔ میں اس کی خوش مزاجی اور علوئے استقلال کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

فقوڑا عرصہ ہوا کہ میری ملاقات مسٹر سے ہوئی جو ایک پسندیدہ صاف گو اور ہنس مکھ نوجوان
 ہیں۔ ابھی حال ہی میں یونیورسٹی سے تعلیم ختم کر کے آئے ہیں۔ باوجود اپنی اعلیٰ تعلیم کے وہ اپنے
 کو کسی بڑی شخصیت کا مالک نہیں سمجھتے ہاں اتنا ضرور ہے کہ اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی وسعت
 معلومات پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طلب علم میں کافی محنت
 کی ہے اور مختصر یہ کہ خاصی معلومات بھی رکھتے ہیں۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ میں کچھ یونانی زبان سمجھتا
 ہوں اور معصوری بھی جانتا ہوں (یہ دونوں چیزیں اس ملک میں نہایت غیر معمولی خیال کجباتی ہیں) تو
 وہ فوراً مجھ سے ملنے آئے اور اپنا تمام ادبی ذخیرہ بالخصوص لیکر ووڈ ٹنک اور دی پائلرز سے لیکر تک
 تک دکھانے لگے۔ بعد ازاں انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے نظریہ سکرز کے حصہ اول کا بھی مطالعہ

طے چارس بالٹا اٹھارہویں صدی کے وسط میں فرانس کا ایک مصنف تھا جس نے اپنی کتاب رفقوں لطیفہ اصول کی
 لغز میں ”مطبوعہ ۱۶۴۶ء“ میں فنون لطیفہ کا مقصد فطرت کا چربہ اتارنا قرار دیا اور ادب کو پرکھنے کیلئے نئے قوانین مرتب کئے
 تھے ووڈ۔ اٹھارہویں صدی کا مصنف ہے جو ادب میں دلچسپی لیتا تھا۔

۱۷۷۵ء دی پائلرز۔ یہ اٹھارہویں صدی کا مصنف ہے جس کی تصنیفات قدیم فنون لطیفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۷۸۵ء جہان جاو ششم و نکلمن۔ (۱۷۸۵ء - ۱۷۱۷ء) قدیم فن تعمیر و تراثی پر جرمنی کا مشہور مصنف۔ اٹھارہویں صدی
 میں فنون لطیفہ کا بہترین ماہر سمجھا جاتا تھا۔ یونان اور روم کی قدیم عمارتوں اور مرہن مجسموں کی روح اور اصول
 کو واضح طور پر بیان کرنے کا اہم کام اُس نے اپنے ذمہ لیا اور کمال دانائی کے ساتھ اُس میں کامیاب ہوا۔ اس کا
 خیال ہے کہ ان مجسموں میں ”شاندار سادگی اور خاموش عظمت“ کا اخلاقی نصب العین موجود ہے۔ روم کا سفر کرنے
 کے بعد اُس نے اپنی معلومات میں اچھا خاصہ اضافہ کیا۔ اس کی مشہور ترین تصنیف ”قدیم فنون لطیفہ کی تاریخ“
 ۱۷۹۵ء میں شائع ہوئی اور شائع ہونے ہی تمام یورپ میں قدم منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ۱۷۹۵ء میں غیر ٹریٹ
 میں ایک ڈاکو کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

۱۷۹۵ء سکرز۔ اٹھارہویں صدی جرمنی کا مصنف ہے جس نے غنائی ڈراما کے متعلق نظریہ پیش کیا کہ فنون سرود کی ہم آہنگی
 ہر نامزدی اور مقصدی فنون لطیفہ کے تمام جز کو ہم آہنگ بنا جائے۔ تیسویں صدی میں واکر کے خیال ابھی بہت پہلی نظر کے منقول اور ان

کیا ہے اور انطیقات کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے لئے جو مضمون چیلنے نے لکھا تھا وہ میرے پاس قلمی صورت میں موجود ہے میں ان سب باتوں کو سنتا رہا اور خاموش رہا۔

ان کے علاوہ میں ایک دوسرے لائق شخص سے بھی واقف ہو گیا ہوں جو اس ضلع کالج ہے وہ ایک صاف گو اور بے دھڑک آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اپنے بچوں میں بیٹھ کر اُس کو جو مسرت ہوتی ہے وہ شاید اور کہیں نہیں ہوتی۔ اس کی نوا دلا دیں ہیں۔ اور بڑی لڑکی کا ذکر تو بہت سننے میں آیا ہے اور اس کی تعریف بھی ہوتی ہے۔ اس جج نے طے کے لئے مجھے بلایا بھی ہے اور پہلی فرصت میں جانے کا ارادہ بھی لکھتا ہوں۔ وہ شاہی شکار گاہ کے ایک مکان میں اُٹھ کر آ گیا ہے۔ جو یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کا پیدل راستہ ہے۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اُس کو اس مکان میں رہنے کی اجازت ملی ہے اس لئے کہ شہر میں اس کی سکونت اور دربار میں قیام سے اس کو اسکی مرحومہ بیوی کی یاد چھین کرتی تھی۔

ساتھ ہی ساتھ چند یہودہ قسم کے گنواروں سے بھی ملاقات ہو گئی ہے یا یوں کہو کہ اُنہوں نے مجھ سے زبردستی ملاقات پیدا کر لی ہے۔ ان کی ہر چیز ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی باتیں چیز ان کا ادائے دوستی ہے۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ میرے خیال میں اس خط سے تم کو مسرت ہوگی اس لئے کہ سارا خط اچھی خاصی داستان ہے۔

۲۲ مئی

اکثر لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ انسان کی زندگی محض ایک خواب ہے۔ جب میں انسان کے مستفسرانہ جوہر اور شوق جستجو کو تنگ دائرہ کے اندر بند دیکھتا ہوں یا معلوم کرتا ہوں کہ انسان کی ساری قوتیں صرف ضروریات کی فراہمی اور آسائش کی تلاش میں صرف ہوتی ہیں جنکا مصرف سوائے اسکی ذلیل اور ناگفتہ بہ ہستی کو طول دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں یا

۱۸۱۲-۱۸۲۹) جرمنی کا مشہور مصنف جس نے یونان اور بحر پر بہت سی کتابیں لکھیں۔
۱۸۶۳ء میں گٹنگن یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ بعد کو بہت سی دوسری یونیورسٹیوں نے پروفیسری کیلئے بلایا مگر اس نے انکار کر دیا دیناے ادب میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یونانی علم الامنام اور اساطیر پر تنقیدی نظر ڈالی اور ان میں ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی اسکی تصنیفات میں جو مرہنڈار۔ ویل۔ تاریخ اور فنون لطیفہ سبھی شامل ہیں۔

جب دیکھتا ہوں کہ کسی موضوع پر بھاری ساری تلاش اور تجسس کا نتیجہ آخر کار ایک خاموش توکل میں گم ہو جاتا ہے حالانکہ اس وقت ہم اپنے کو قید خانہ کی دیواروں پر خوش آئند نقش و نگار اور چمکدار تصویریں بنا کر خوش کر لیتے ہیں تو میرے دوست! جب میں ان تمام چیزوں پر غور کرتا ہوں تو میری زبان نہیں کھلتی۔ میں خود اپنا جائزہ لینے لگتا ہوں اور اس تلاش میں تم جلتے ہو کہ مجھے کیا ملتا ہے؟ ایک دنیا جو عبارت نبوتی ہے چند تخیلات، چند مبہم خواہشات اور چند خیالی مناظر کی جو اعتقاد اور حقیقت کے مقابلہ میں بالکل مجہول اور نامعلوم ہے اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہر چیز تنگ کی طرح بہتی ہے اور تب میں مسکرا کر اپنی خواب آسا کیفیت کو چھوڑ دیتا ہوں اور معمولی دنیا میں آجاتا ہوں۔

تمام علماء اور عقلا اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کے ارادہ میں جو چیز حرکت پیدا کرتی ہے بچے اُس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن بڑے لوگوں کو تو دیکھو وہ بھی بچوں کی طرح اس کائنات میں سرگرداں و پریشان پھرتے ہیں ان کو اس کا مطلق علم نہیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے ان کے اعمال بھی مقاصد کے دماغ سے پاک ہوتے ہیں اور بچوں کی طرح ان کی رہنمائی بھی بسکٹ، مٹھائی اور چھڑی سے ہوتی ہے لیکن اسکو تسلیم کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں حالانکہ میرے خیال میں اس سے زیادہ ظاہر اور باہر چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے تم اس کے جواب میں کہو کہ ہم میں سب سے زیادہ مسرور اور خوش باش وہی لوگ ہیں جو بچوں کی طرح کل کی فکر کرنے کے بجائے کھلونوں سے دل بہلاتے ہیں، گڑیوں کو کپڑے پہناتے اور اتارتے ہیں اور مٹھائی کی الماری پر جس کو انا جان نے بند کر دیا ہے برابر نگاہ دکھتے ہیں جب کوئی مٹھائی مل جاتی ہے تو بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور پھر دوسری مٹھائی کے لئے روتے اور چلاتے ہیں۔ ہاں یہ لوگ بے شک خوش ہیں مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جو قابل رشک ہیں۔ وہ اپنے معمولی اشغال کو اور اکثر اپنے جذبات کو بے چوڑے القاب و آداب سے زینت دیتے ہیں اور لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اعلیٰ کمالات صرف نام لوگوں کی فلاح و بہبود اور شان و شوکت کیلئے

حاصل کئے گئے ہیں۔ لیکن جو شخص نہایت خاکساری سے ان تمام فضولیات کا دل سے اقرار کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایک خوشحال آدمی کس شوق سے اپنے باغ کو بہشت کا نمونہ بنانے کی فکر کرتا ہے یا ایک غریب کس صبر اور استقلال کے ساتھ اپنے تمام بار کا ضامن ہوتا ہے اور کس طرح ہر شخص کی یکساں طور پر یہی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب ماہتا جسے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے؛ ہاں تو ایسا شخص مطمئن ہوتا ہے اور اپنے دل کے اندر اپنی دنیا پیدا کر کے اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ میں بھی ایک انسان ہوں اور انسانوں میں میرا شمار ہے۔ گو اس کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے تاہم وہ اپنے سینہ میں آرزوئے آزادی کی پرورش کرتا ہے اور اس قید و بند سے نکلنے کی برابر فکر میں لگا رہتا ہے۔

۲۴ مئی

تم میرے تفریح کرنے کے پُرانے طریقہ سے خوب واقف ہو یعنی میں کسی تنہا مقام میں ایک جمونپڑا ڈھونڈ نکالتا ہوں اور باوجود ہر قسم کی دقتوں کے اس میں جا کر رہتا ہوں یہاں بھی میں نے ایک ایسا ہی مقام ڈھونڈ نکالا ہے اور اس کی دپھپھیاں میں تم سے کیا بیان کروں! قصبہ سے تین میل کے فاصلہ پر والہاٹم کا قصبہ ہے جو ایک خوشنما پہاڑی کے دامن میں آباد ہے۔ قصبہ سے باہر جانے والے راستہ سے تمام وادی بخوبی نظر آتی ہے اور وہیں ایک بڑھیا چاے۔ شراب اور قہوہ بیچتی ہے۔ بڑھیا باوجود اپنی زیادتی عمر کے خوش طبع معلوم ہوتی ہے پاس ہی گر جاگھر کے سامنے دلیوں کے درخت ہیں جو اپنی لابی شاخوں سے ایک مٹھی سبزہ زار پر سایہ کئے ہوئے کھڑے ہیں۔ چاروں طرف کسانوں کے جمونپڑے کھیلان اور کھیت ہیں۔ ایسی اکیلی اور خاموش جگہ شاید ہی میں نے پہلے کبھی دیکھی ہو۔ اکثر اسی سبزہ زار پر اس بڑھیا کی دوکان سے کرسی منگو کر بیٹھتا ہوں اور قہوہ پی کر ہوم کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ سمجھو کہ بس بالکل اتفاقی طور سے میں نے ایک روز شام کو اس جگہ کا پتہ چلایا۔ ہر طرف سکون کے ساتھ دیرانی ہی دیرانی برستی تھی۔ کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ صرف ایک چار برس کا بچہ اپنی گود میں ایک چھ ہینہ کی بچی لئے بیٹھا تھا اور اس کو کبھی

لوریاں دے کر اور کبھی اپنے ہاتھوں سے، جو اُس کے لئے آرام کرسی کے ہتھے کا کام دے رہے تھے اپنے سینے سے لپٹا کر ہلارہا تھا۔ مگر بچہ باوجود خوش ہونے کے بالکل خاموش تھا۔ اس بچہ کے اس لاف پیار نے میرے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں بھی پاس ہی ایک جگہ جا کر بیٹھ گیا اور ان دونوں محبت کرنے والے بچوں کی تصویر بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اس تصویر میں میں نے اُس پاس کی چیزوں کی مثلاً جھڑیاں، کھلیان کے دروازے اور گاڑی کے ٹوٹے ہوئے پہیوں کی تصویریں بالکل اصل کے مطابق بنا ڈالیں اور ایک گھنٹہ کے بعد دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں نے ایک نہایت عمدہ اور صحیح تصویر بغیر اپنی طرف سے کچھ گھٹائے بڑھائے تیار کر لی ہے۔ اس واقعہ سے قدرت کے چربہ آتارنے کے میرے پرانے عقیدہ میں اور بھی تقویت ہو گئی۔ صحیفہ قدرت ایک لامتناہی شے ہے اور بڑے سے بڑے معلوم کی تعلیم و تربیت کے لئے کافی ہے مگر قواعد وغیرہ کی موافقت میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اور اسی طرح سوسائٹی کے قوانین کی پابندی کے لئے بھی الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ جس مصور کا کمال قواعد کی پابندی کر کے بڑھا ہے اس سے کم سے کم اتنا تو ہو گا کہ وہ اپنی تصویر اگر اچھی نہیں تو بُری بھی نہیں بنائے گا۔ ٹھیک اسی طرح جو شخص قوانین کی پیروی کرتا اور سوسائٹی کے شعور اور ادب کو تسلیم کرتا ہے وہ زائد پیش اور ناقابلِ برداشت ہمسایہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اصول و قواعد کے متعلق تم جو چاہو کہو۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ قدرتی جذبات کو بدل دیتے اور فطری طرزِ اظہار کو پلٹ دیتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہ کہو کہ یہ مشکل ہے اور قواعد و قوانین زوائد کو کاٹ چھانٹ کر ال کو آراستہ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، چھا اس مسئلہ کو صاف اور واضح کرنے کے لئے آؤ ذرا مسلکِ عشق و محبت پر غور کریں۔ مان لو ایک شخص کسی عورت پر دل و جان سے فریفتہ ہے اُس کا ہر لمحہ اس محشوقہ کی صحبت سے منور ہر آن اُس کی چشم سحر کار کا مفتوں۔ وہ عاشق جاننا ز اپنی صحت، اپنا ذوق و شوق، اپنا مال و دولت عرض سب کچھ اُس کے حسن و لستان پر قربان کرتا ہے اور اُس کو یقین دلاتا ہے کہ میری زندگی کی سانس اگر ہے تو تو ہے، میرے کاشانہ دل کا دیا اگر ہے تو تو ہے۔ اسی دوران میں ایک دنیا دار اور قابلِ احترام شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو کوئی حاکم ہے وہ اس عاشقِ ناز

سے مخاطب ہو کر یوں کہتا ہے کہ میرے نوجوان دوست محبت بے شک ایک قدرتی جذبہ ہے مگر اُس کو جائز حدود کے اندر رکھنا چاہئے۔ اپنے اوقات کو تقسیم کرو اور اُس میں سے کچھ حصہ اپنے کاروبار پر اور فرصت کا بقیہ حصہ اپنی محبوبہ پر صرف کرو۔ ساتھ ہی اپنی آمدنی کا حساب کتاب کرو اور جو کچھ رقم فاضل ہو اُس میں سے اپنی محبوبہ کے لئے تحفہ تحائف خریدو لیکن یہ یاد رہے کہ ایسا ہمیشہ نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً کرنا چاہئے یعنی اُس کی سالگرہ کے دن یا اور کسی خاص موقع پر، اگر وہ نوجوان عاشق اہل علاج پر عمل کرنے لگے تو سمجھو کہ وہ سوسائٹی کا ایک کارآمد فرد ہے اور میں تو کسی حکمران سے اس کو نوکری دینے کی سفارش بھی کروں گا۔ مگر اس کی محبت کا جلنے ہو کیا حال ہوگا، وہ بالکل برباد اور خستہ حال ہو جائے گی اور اگر کہیں وہ مصور ہو تو اس کی ساری خدا داد اہلیت اور قابلیت خاک میں مل جائے گی۔ میرے دوستو۔ خدا داد اہلیت اور قابلیت کا دریا ہمیشہ اتنے زور شور سے نہیں اُبلتا کہ تمھاری روحوں کو بھی بہا لیجائے بات یہ ہے کہ اس کے دونوں ساحلوں پر تنگ نظر اور ٹھنڈے دماغ والوں نے بڑے بڑے مضبوط پشتے باندھ دیے ہیں اور اُن کے کنارے مکانات بنائے ہیں، باغات لگائے ہیں اور اسی لئے وہ دریا کی بڑھتی ہوئی موجوں کو خوفناک سمجھتے ہیں۔ اکثر طغیانی کے خیال سے کانپا ہتے ہیں اور ہمیشہ اپنے مکانات اور باغات وغیرہ کی خیر منانے میں علی طور بھروسہ کرتے ہیں۔

۲۷ مئی

میں خوشی میں آپ سے باہر ہو کر شاید تشبیہ اور استعارہ میں پھنس گیا اور اپنے جوش اور دلولہ میں کہاں سے کہاں پہنچا کہ مجھ کو ان بچوں کا قصہ ختم کرنے کی بھی سذھ نہ رہی میں نے اپنے پچھلے خط میں مختصراً اپنی مصوری کے متعلق کچھ لکھا تھا تو میں اس میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ دو گھنٹہ اسی جگہ بیٹھا رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی اُس وقت ایک جوان عورت ایک نوکری لئے تیز قدم بڑھاتی ہوئی بچوں کے پاس آئی جواب تک اسی جگہ بیٹھے تھے اور دور ہی سے کہنے لگی کہ ”فلپ تم بڑے اچھے لڑکے ہو“ اُس نے پھر مجھ کو سلام کیا اور میں بھی جواب دے کر اُٹھا اور اُنھ کو اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا آپ ہی ان خوبصورت بچوں کی

ماں ہیں۔ اُس نے کہا ”ہاں“ یہ کہہ کر بڑے کو اُس نے ایک روٹی کا ٹکڑا دیا اور چھوٹے کو گود میں لے کر مادانہ شفقت اور محبت سے پیار کرنے لگی اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ میں اس بچی کو فلپ کے سپرد کر کے اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ روٹی، شکر اور ہانڈی وغیرہ خریدنے بازار چلی گئی تھی۔

ٹوکری پر سے ڈھکنا ہٹ جانے سے میں نے یہ سب چیزیں اُس کی ٹوکری میں دیکھیں پھر بولی کہ میں ہانس (جو اس کی چھوٹی بچی کا نام تھا، کے لئے آج رات کو کچھ شور با تیار کروں گی اس لئے کہ کل رات کو بڑے لڑکے نے شرارت سے فلپ سے لڑائی کر کے ہانڈی توڑ ڈالی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ کا بڑا لڑکا کہاں ہے۔ وہ شاید یہ کہنے والی ہی تھی کہ اُسکا لڑکا دو مادہ قازوں کو چراگاہ سے ہنکا کر مکان لیجا رہا ہے کہ اتنے میں وہ خود ہی آگیا اور آتے ہی اُس نے فلپ کو بید کی ایک شاخ دی۔ میں کچھ دیر تک اُس عورت سے باتیں کرتا رہا اور اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ ایک مدرسہ کے معلم کی لڑکی ہے اور اُسکا شوہر اپنے کسی عزیز کی موت پر اپنا ترکہ حاصل کرنے سوئٹزرلینڈ گیا ہے۔ پھر کہنے لگی ”لوگ میرے شوہر کو فریب دے کر سارا مال ہڑپ کر لینا چاہتے تھے اور خط تک کا جواب نہیں دیتے تھے اسلئے ابکی وہ خود گیا ہے۔ اس کے جانے کے بعد البتہ مجھے اُس کی کوئی اطلاع نہیں ملی خدا کرے وہ صحیح سلامت اپنے سفر سے واپس آئے“ میں کسی قدر افسوس کے ساتھ اُس عورت سے رخصت ہوا اور رخصت ہوتے وقت میں نے ہر لڑکے کو ایک ایک کر کے گھونچا اور سب سے چھوٹے کو ایک کرپوزر زائڈ شور با اور روٹی خریدنے کیلئے دیا۔ پھر ہم لوگ جدا ہو گئے۔

ماں میرے شفیق دوست! جب میں آپ سے باہر ہوتا ہوں تو اُس وقت میرے متلاطم جذبات میں سکون پیدا کرنے کیلئے مجھے اس عورت سے بہتر اور کوئی ہستی نہیں معلوم ہوتی۔ اپنی محبت و مہربانی کے دائرہ میں وہ کتنی مسرت آمیز بے فکری سے زندگی بسر کرتی ہے اور اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پوری کرتی ہے۔ دن کا دن ختم ہو جاتا ہے مگر اُس کے دل میں نہ تو کوئی اضطراب پیدا

۱۳

ہو تلپے اور نہ موسم خزاں کے زرد زرد بچھڑے اس میں کوئی پہچان اٹھتا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ کہ ان زرد پتیوں کے گرنے سے بس اس کو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اب جاڑا آ رہا ہے۔
 اس شام کے بعد اس جگہ میں کئی مرتبہ گیا ہوں۔ بچے مجھ سے بہت کچھ ہل ہل گئے ہیں قبوہ پیتے وقت شکر میں سے بھی میں اُن کا حصہ لگاتا ہوں اور رات کے وقت وہ سب میری روٹی مکھن اور دودھ میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ ہر اُلو اُر کو میں اُن بچوں کو ایک کر لیوڑ ضرور دیتا ہوں اور جس روز شام کو گر جا کی عبادت کے بعد وہاں نہیں جاتا تو اُس دن کے لئے میں نے اُس عورت سے کہہ رکھا ہے کہ وہ میری طرف سے ان بچوں کو کچھ دیدے۔ بچے مجھ سے اتنا مانوس ہو گئے ہیں کہ جو کچھ وہ سنتے ہیں مجھ سے ضرور اُکر کہتے ہیں۔ جب قصبہ کے اور لڑکے جمع ہوتے ہیں تو اُن بچوں کی سادگی اور خوش مزاجی سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اُن کی ماں برابر ان سبھوں کو یہ کہہ کر کپڑے جایا کرتی ہے کہیں مجھے تکلیف نہ ہونے پائے۔ مگر میں نے بڑی مشکل سے اس کو سمجھا بھجا کر راضی کر لیا ہے کہ بچوں سے بدستور سابق کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔

۳۰ مئی

میں نے حال میں جو کچھ مصوری کے متعلق لکھا ہے وہ حرف بحرف شاعری کے لئے بھی صحیح ہے ہمارے لئے یہ جاننا از بس ضروری ہے کہ کون سی چیزیں اچھی ہیں اور انکا اظہار کس طرح کیا جائے۔ یعنی بہت کچھ مضمون تھوڑے لفظوں میں کیونکر ادا کیا جائے۔ آج ایک واقعہ پیش آیا جسکا اگر لفظ بہ لفظ ذکر کیا جائے تو بددی زندگی کی ایک نہایت عمدہ داستان تیار ہو جائے گی لیکن شاعری قدرتی نظر اور چرواہوں کی زندگی کے ذکر سے کیا فائدہ؟ کیا ہم فن کی مدد لئے بغیر قدرت سے براہ راست لطف نہیں اٹھا سکتے؟

اگر تم اتنے دیا چہ سے کسی عظیم الشان چیز کی اُمید باندھو گے تو تم کو مالو سی ہوگی کیونکہ اسکا تعلق تو ایک کسان کے خوفِ طبع لڑکے سے ہے جس سے مجھے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے میں اپنے قصہ کو جیسا کہ میرا دستور ہے نہایت بھونڈے طریقے سے سناؤں گا اور تم بھی اپنے دوستوں کے مطابق مجھکو ڈر ولیدہ بیان اور آشفٹہ مزاج تصور کرو گے۔ خیر یہ والہائیم ہی ہے اور

ہمیشہ والہا تم ہی رہے گا جو ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کرتا ہے۔

مکان کے باہر نیمبو کے درختوں کے نیچے کچھ لوگ قبوہ بیٹے جمع ہوئے تھے۔ اس مجمع سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے میں کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے وہاں سے دوڑ ہی رہا۔ اتنے میں قریب کے مکان سے ایک کسان نکل کر آیا اور اسی بل کے کچھ حصہ کی مرمت کرنے لگا جس کی تصویر میں نے اُتاری تھی۔ وہ کافی قبول صورت تھا اور میں نے اس سے باتیں بھی کیں اس کے حالات وغیرہ پوچھے۔ بعد کو اُس سے کافی ملاقات بڑھ گئی اور جیسا کہ اس قسم کے لوگوں میں میرا دستور رہا ہے میں فوراً اُس کا راز دار ہو گیا۔ اُس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا کہ میں ایک جوان بیوہ کا لڑکا تھا جو مجھ سے نہایت محبت کا برتاؤ کرتی تھی۔ اُس نے اپنی مالکہ کا اتنا حال بیان کیا اور اُس کی اتنی تعریفیں کیں کہ مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہے۔ پھر کہنے لگا کہ ”اُس کے عنفوان شباب کا زمانہ گزر چکا ہے، اس کے متوفی شوہر نے اُس کے ساتھ ایسا بُرا برتاؤ کیا کہ وہ اب کسی طرح شادی کرنے پر راضی نہیں“ اس کے بیان سے یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس بیوہ کا حسن اُس کی آنکھوں میں سایا ہوا ہے۔ اُس کی بڑی تمنا یہی تھی کہ اپنے سابق شوہر کی تلخ یا دِ سٹانے کے لئے وہ اسی کو اپنا رفیق بنالے اچھا اس کے عشق کی گرویدگی اور صداقت کے اظہار کے لئے میں اسی کے الفاظ کیوں نہ استعمال کروں لیکن اس کے چہرہ کی ساخت، اُس کی آواز کی شیرینی اور اُس کی آنکھوں کا قدرتی جوش بیان کرنے کے لئے میرے خیال میں ایک بڑے شاعرانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ اسکی ہر حرکت اور ادا کا اظہار الفاظ سے بعید ہے اور میری کوشش خواہ کتنی بلیغ کیوں نہ ہو اس منظر کا خاطر خواہ نقشہ نہیں پیش کر سکتی۔ اس کے اس اندیشہ سے کہ شاید میں اس کے اور اس کی معشوقہ کے تعلقات میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو جاؤں یا اُس کی معشوقہ کے موجودہ رویہ کو ناپائیدار ٹھہراؤں میرے دل پر بڑا اثر پڑا۔ جس فسوں کاری سے اُس نے اسکی شکل و صورت، قد و قامت و جنوں نے جوانی کی رعنائی نہ رکھنے کے باوجود اُس کو کمند محبت میں گرفتار کر لیا، کا حال بیان کیا وہ بالکل ناقابل اظہار ہے۔ اس لئے میں اُس کو خلیل

پر چھوڑتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی بھر میں ایسا پاک اور سچا عشق اور ایسی خوشنظمی محبت نہ دیکھی ہے نہ سنی ہے اور نہ اس کا کبھی خیال کیا ہے۔ لکن مجھ پر الزام نہ لگاؤ اگر میں کہوں کہ اس معصوم اور بچے عشق کا تصور میری روح میں سرایت کر گیا ہے یا وفاداری اور محبت کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے یا خود میرا دل اس شعلہ سے جل کر اندر ہی اندر بھڑک رہا ہے۔

میرے جی میں آتا ہے کہ میں بھی ایک دفعہ اس مجسمہ حسن کو جا کر دیکھ آؤں۔ پھر خیال آتا ہے کہ کیوں جاؤں اسلئے کہ ہر تیر ہی ہے کہ اس کو اُس کے عاشق کی آنکھوں سے دیکھوں۔ ممکن ہے کہ اُسکی دلربائی دیکھنے سے اتنی نہ ہو جتنی کہ اس وقت میری آنکھوں سے معلوم ہوتی ہے اور جب یہ معاملہ ہے تو میں کاہنے کو ایسی دلربا تصویر کا نقش اپنے دماغ سے مٹاؤں؟

۱۶ جون

میں نے اس طرف بہت دنوں سے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بھائی تم تو ہر معاملہ کی تہ تک پہنچنے کا دعویٰ کرتے ہو اور پھر بھی اس قسم کے سوالات کہتے ہو۔ اس لحاظ سے تو تم کو سمجھ جانا چاہئے تھا کہ میں اچھا ہوں۔ مختصر یہ کہ میں نے یہاں ایک ایسی ہستی سے ملاقات پیدا کر لی ہے جس نے میرا دل موہ لیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی ملاقاتیں مجھے ایک ایسی چیز ملی ہے جس کا مجھے خود بھی علم نہیں۔ تمہارے پاس براہِ پاس قسم کا خط لکھتے رہنا کہ میں نے کسی طرح ایک زندہ دل اور لطیف طبع خاتون سے ملاقات پیدا کی، یقیناً بڑا مشکل کام ہوگا، لیکن میں خوش ہوں اور قانع بھی اور واقعات کے لحاظ سے شاید اسی لئے ایک خراب واقعہ نگار ہوں۔

اسے کوئی فرشتہ کہنا حاقق ہوگی حالانکہ ہر شخص اپنی محبوبہ کو فرشتہ سے کم نہیں سمجھتا لیکن پھر بھی میں تم سے اس کے کمالات نہ تو اچھی طرح بیاں کر سکتا ہوں اور نہ اُس کے اسباب پر بحث کر سکتا ہوں۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اُس نے میرے تمام حواس کو تسخیر

کر لیا ہے۔ اس میں انتہائی سادہ دلی کے ساتھ عقل، نرمی کے ساتھ عزم، اور دماغی سکون کے ساتھ متحرک زندگی کے عناصر اس درجہ موجود ہیں کہ تعریف محال ہے لیکن اس قسم کے چلتے ہوئے فقرے عام طور پر خیالات کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے ہیں جن میں اصلیت کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ اچھا میں اُس کی صحیح سیرت پھر کبھی بیان کر دینگا اچھا لو ابھی بیان کئے دیتا ہوں ورنہ پھر موقع شاید ہی ملے اس لئے کہ جب سے خط لکھنے بیٹھا ہوں تین دفعہ قلم پھینکتے پھینکتے اور گھوڑا منگا کر اُس کے یہاں جاتے جاتے رک گیا حالانکہ میں نے قسم کھالی تھی کہ آج صبح وہاں نہیں جاؤں گا مگر یقین مانو کہ ہر لحظہ میں گھر کی طرف اٹھ کر دیکھتا رہا کہ آفتاب کتنا بلند ہوا۔

اس کشاکش میں آخر میں ہی مغلوب رہا اور وہاں گیا اور وہاں سے ابھی واپس آنے کے بعد یہ خط تم کو کھانے کے وقت لکھ رہا ہوں۔ اُس کو اُس کے بچوں اور آٹھ بھائیوں اور بہنوں کے درمیان دیکھ کر مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن اگر میں یہ سب لکھتا جاؤں تو خط کبھی ختم ہی نہیں ہوگا اور نہ تم کچھ سمجھو گے۔ اچھا لو سنو اب میں ذرا تفصیل سے روشنی دالوں گا تاکہ تم کو کچھ اندازہ ہو جائے۔

کچھ دنوں قبل میں تمہیں لکھ چکا ہوں کہ میری ملاقات ایک صاحب مسمیٰ سے ہوئی ہے جو یہاں ضلع کے جج ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک دفعہ اپنے گھر بلانے کی دعوت بھی دی تھی جہاں وہ عزت گزینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں بہر حال وہاں جانا بھول گیا اور شاید نہ جاتا اگر اتفاق سے ایک خزانہ کا پتہ چلتا جو اس اکیلی جگہ میں چھپا ہوا ہے۔ میرے چند اہباب نے تجویز پیش کی کہ ایک محفل رقص ہونی چاہئے۔ میں نے بھی اس میں شرکت کی فوراً منظور ہوئی دے دی اور اس تقریب کی خاطر پاس پڑوس کی ایک خوبصورت اور پسندیدہ مگر معمولی لڑکی کو اپنی رفیقہ منتخب کر لیا۔ بعد کو ہم دونوں میں قرار پایا کہ میں ایک گاڑی کرایہ کر لوں اور اپنی رفیقہ اور اُس کی چچی کو ساتھ لیکر شارلٹ کے مکان پر سوار ہو کر جاؤں اور پھر اُس کو بھی لے کر محفل رقص میں جاؤں۔ جب ہم اس

شکار گاہ والے مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے تو میری رفیقہ نے کہا کہ تم سے ایک نہایت خوبصورت اور دلربا لڑکی سے ملاقات ہوگی۔ پھر فوراً ہی اُس کی چچی بولی کہ دیکھنا کہیں تم اسپر عاشق نہ ہو جاؤ۔

میں نے یو چھپا کہ آخر اس میں بات کیا ہے۔ اس پر اُس نے جواب دیا کہ وہ لڑکی پہلے ہی سے ایک بڑے آدمی سے منسوب ہے جو اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی جائیداد کے تمام معاملات طے کرنے کہیں گیا ہے اور اب تو وہ اچھی خاصی موروثی جائیداد کا مالک ہو گا۔ اس خبر سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔

جب ہم دروازہ کے پاس پہنچے تو سورج پہاڑی کی چوٹیوں کے پیچھے ابلہ بارہا تھا ہوا کچھ تیزی سے چل رہی تھی اور کالے بادل بھی اُفق پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس پر عورتوں کو طوفان وغیرہ کی آمد سے اندیشہ ہو گیا لیکن میں نے موسم کا اگر سمجھنے والا بن کر اُن کو تسلی دی اور انکے اندیشہ کو کم کیا۔ حالانکہ اُس وقت میں خود ڈر رہا تھا کہ اگر کہیں طوفان آیا تو ہمارا سارا لطف کر کرا ہو جائیگا۔

میں گاڑی سے باہر نکلا اور میرے اُترتے ہی ایک خادمہ دروازہ پر آئی اور کہنے لگی کہ ذرا ایک منٹ کے لئے ٹھہر جائیے میری مالکہ آپ لوگوں کے استقبال کے لئے تشریف لا رہی ہیں۔ بہر حال میں صحن میں سے ہوتا ہوا ایک عمدہ مکان کے سامنے آیا اور سامنے والی سڑک پر سے چڑھ کر اندر گیا اور جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا دیکھا وہاں ایک ایسا روح پرور اور دل نواز منظر نظر آیا جو میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ دو برس سے لے کر گیارہ برس تک کے چھ بیچے بڑے کمرے کے اندر دوڑتے اور دوڑ کر ایک اوسط قد کی حسین عورت کے ارد گرد جو سفید کپڑوں پر لال نینے لگائے ہوئے تھے جمع ہو جاتے اور روٹی کے ٹکڑے پا کر زور سے خوشی میں چلاتے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک روٹی تھی جسکو کاٹ کر اور کھمن لگا کر وہ بچوں کو بھوک اور عمر کے لحاظ سے بانٹ رہی تھی۔ یہ کام وہ اتنی خوش اسلوبی سے کرتی تھی کہ ہر کچھ باری باری ہاتھ پھیلاتا اور روٹی کا ٹکڑا لے لیتا۔ تھوڑی دیر بعد بعض

بچے تو رات کا کھانا کھانے چلے گئے اور صبح جو کم شرارتی تھے اُس اجنبی کی محاذی دیکھنے باہر
 چلے گئے جس میں شارلٹ جانے والی تھی۔ اتنے میں شارلٹ بولی کہ میری وجہ سے آپ نے جو یہاں
 تکلیف فرمائی ہے میں اسکی معافی چاہتی ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ خواتین کو میرے انتظار میں دیر ہوئی
 وجہ یہ ہوئی کہ کپڑا بدلنے اور دیگر امور خانہ داری میں اتنا مشغول ہو گئی کہ بچوں کو کھانا دینا بھول
 گئی اور بچے بھی ایسے ہیں کہ میرے بغیر کسی اور کے ہاتھ سے کھاتے بھی نہیں۔ میں نے اس
 کے جواب میں آہستہ سے کوئی بے معنی تعریف کا فقرہ کہہ دیا جو مجھے اب یاد نہیں مگر ہاں اتنا
 جانتا ہوں کہ اُس کی شیریں آواز سن کر اور اُس کی دلربا اداؤں کو دیکھ کر میرا دل بے
 اختیار ہاتھ سے جاتا رہا اور قبل اسس کے کہ میری بخودی اور بقراری کو چہن آئے
 وہ دوسرے کمرہ میں اپنا دوستانہ اور ہلکا لینے چلی گئی۔ جب وہ کمرہ میں تھی تو میں سب سے
 چھوٹے بچہ کے پاس گیا جو بہت خوبصورت تھا۔ اسی پر دوسرے بچے کنکھیوں سے مجھے
 دیکھنے لگے۔ چھوٹا بچہ مجھے دیکھ کر پیچھے ہٹا مگر اتنے میں شارلٹ آگئی اور کہنے لگی ”لوٹس اپنے
 عم زاد سے کیوں نہیں ہاتھ ملاتے“ بچہ نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور میں نے بھی خوب جی بھر
 اُس کو پیار کیا۔ بعد ازاں بچہ کو شارلٹ کی گود میں دے کر میں نے پوچھا کہ کیا مجھے آپ سے رشتہ داری
 کا فخر حاصل ہے؟ فوراً اُس نے اپنے ہونٹوں کی محراب نما مسکراہٹ سے جواب دیا کہ ”میرے تو
 بہت سے بھائی ہیں اور اگر آپ ان میں سے ناقابلِ ثبات ہوں تو مجھے افسوس ہو گا۔“ رخصت
 ہوتے وقت اُس نے اپنی بہن صوفی سے جو گیارہ برس کی تھی بچوں کی نگرانی کی تاکید کی
 اور کہا کہ جب ابا جان میرے علم کے واپس آئیں تو مکان چلی جانا۔ اور بچوں سے بھی کہہ دیا کہ صوفی
 کے حکم کی تعمیل میرے حکم کی طرح کریں۔ بعض بچوں نے وعدہ بھی کر لیا۔ مگر چھ برس کی ایک
 خوبصورت بچی اس پیمان پر کچھ مضطرب نظر آئی اور شارلٹ سے کہنے لگی کہ ”صوفی تمہارے
 بلا نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کو ہم تمہاری طرح پیار کر سکتے ہیں“ اس عرصہ میں دو لڑکے
 گاڑی کے اوپر والے حصہ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور میری درخواست پر اس شرط پر ان کو چھلکے
 آخری حصہ تک جانے کی اجازت دی گئی کہ وہ بالکل خاموشی سے مضبوط پکڑ کر بیٹھے رہیں۔

ہم لوگ روانہ ہونے کے لئے گاڑی میں بمشکل بیٹھے ہی تھے اور عورتوں نے ابھی ایک دوسرے کی مزاج پر ہی اور ایک دوسرے کی پوشاک اور قص میں ملنے والے لوگوں کے متعلق کوئی بات بھی نہیں کی تھی کہ شارلٹ نے گاڑی رکوا دی اور اپنے بھائیوں کو اتروا دیا۔ ان دونوں نے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اتر گئے۔ بڑے نے تو ایک پندرہ سال کے نوجوان کی طرح نرمی اور چھوٹے نے محبت اور بے پروائی دکھائی۔ اس نے بچوں کو پیار کہلایا اور پھر گاڑی چلی۔

میری رفیقہ کی چچی نے شارلٹ سے پوچھا کہ کیا آپ میری بھیجی ہوئی کتاب ختم کر چکیں؟ شارلٹ نے کہا کہ ”میں نے ابھی شاید اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ وہ مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ آپ اسے لے سکتی ہیں۔ مجھے اس کتاب سے پہلے والی کتاب کی طرح کوئی خاص لطف نہیں آیا“

جب اُس نے میرے پوچھنے پر کتاب کا نام بتایا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی مجھے تو اس کے ہر قول میں باریک بینی اور نکتہ سنجی کا پہلو معلوم ہوتا تھا اور جب اس کا فقرہ سامعین اچھی طرح سمجھ لیتے تو اس کے چہرہ پر ایک طرح کی چمک اور خدا داد قابلیت کا ایک نیا انداز ہوتا۔ اس کے بعد وہ یوں گویا ہوئی کہ جب میری عمر اس سے کم تھی تو مجھے دنیا میں رو مانت سے زیادہ اچھی اور کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ فرصت اور چھٹی کے وقت کسی گوشہ میں بیٹھ کر جب میں کسی خیالی لیونٹورا کا افسانہ الم و نشاط پڑھتی تو میری خوشیوں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی میں اس سے انکار نہیں کرتی کہ اب بھی مجھ پر ایسی کتابوں کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ مگر میں پڑھتی بھی کم ہوں اور چاہتی ہوں کہ جو پڑھوں وہ بالکل میرے مزاج کے موافق ہو۔ میں اُن مصنفین کی تصنیفات کو زیادہ پسند کرتی ہوں جو اپنی کتابوں میں خود میری جیسی زندگی کے مناظر پیش کرتے ہیں جہاں میں اپنے احباب کو بالکل فطری ماحول میں پاتی ہوں اور جہاں کی

۱۷ لیونٹورا۔ یہ پندرہویں اور سولہویں صدی کی ایک جرمن گیت ہے جس میں ایک لڑکی کے واردات عشق کا افسانہ ہے۔ برگر (۱۷۴۲-۱۷۴۷) نے اس کو نظم کیا۔ یہ نظم پہلی بار سنہ ۱۷۴۷ء میں شائع ہوئی اور بہت مشہور ہوئی۔ جرمنی کے رومانی شعراء میں برگر کا درجہ بہت بلند ہے۔ شقیہ مضامین کو بڑے سوز و گداز کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ کچھ دنوں میں گٹنگن کی یونیورسٹی میں پروفیسر بھی تھا۔ اپنے جذبات کی فراوانی کی وجہ سے ”طوفان اور یجان“ کے دور میں پھنس کر گیا اپنی ابا جاشاد زندگی کی وجہ سے اپنے بہتے قیوم دوستوں کو سکھاتا تھا اور بالآخر انتہائی مغالطہ غریب بن گیا۔

زندگی میری مکانی اور خانگی زندگی سے بالکل مشابہ اور اسی طرح دلچسپ اور پُر اثر ہوتی ہے اور جو بہشت کا نمونہ بنے بغیر میرے لئے اطمینان اور مسرت کا مرکز اور منبع ہے۔

آخری فقرہ کے اثر کو میں نے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش دیر تک چل سکی جب اُس نے دیکھا کہ آف دیکفیلڈ پر اور دوسری کتابوں پر جبکا نام بتانا ضروری نہیں معلوم ہوتا تھا خوبصورتی سے معفانہ اور ناقدانہ اظہار خیال کیا تو میں اپنے کو بالکل نہ روک سکا اور کمال شوق میں اس طرح نفس مضمون پر اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا کہ تقوڑی دیر کے بعد جب شارلٹ نے ان دونوں عورتوں سے گفتگو شروع کی تو مجھے ان کی موجودگی کا دوبارہ احساس ہوا اور انکو متعجبانہ انداز میں بت بنا بیٹھا ہوا دیکھا کیا۔ اس پر وہ بدمعھی محض کو بار بار چہرے پر ہمو کر دیکھتی جاتی مگر میں نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔

بعد ازاں ہم لوگوں نے رقص، لطف اور تفریح پر بات چیت شروع کی۔ شارلٹ نے کہا کہ اگر رقص کا پسند کرنا معیوب ہے تو مجھکو اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا باک نہیں اس لئے کہ رقص سے بڑھ کر مجھے اور کوئی تفریح مرغوب نہیں۔ اگر میری طبیعت اُچاٹ ہوتی ہے تو میں پیالہ پر وہ راگ بجاتی ہوں جس پر میں نے اکثر رقص کیا ہے اور تب میری طبیعت ہل جاتی ہے اور تمام غم غلط ہو جاتا ہے۔

تم چونکہ مجھے خوب جانتے ہو اس لئے تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے کہ دوران گفتگو میں میرا

لے انگلستان کے مشہور مصنف اولیور گولڈ اسمتھ (۱۷۷۸-۱۷۶۸) کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۷۶۸ء میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو مصنف نے ایک پادری کی خانگی زندگی کے حالات قصہ کے رنگ میں لکھے ہیں۔ مگر حقیقت اس میں انگلستان کی اٹھارہویں صدی کے اوسط درجہ کے لوگوں کی ذہنی اور معاشرتی تصویر تجلیں اور جذبات کی رنگ آمیزی کے بعد پیش کی گئی ہے اور سادہ اور قدرتی زندگی کو تہذیب کی خلاف فطرت زندگی کے مقابلہ میں سراہا گیا ہے۔ مگر انداز بیان میں روسو کے جوش و خروش کا کہیں نام نہیں۔ آخر میں نیکی اور خدا پرستی کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ صرف نیکی ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان دنیا کی برائیوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ گوئیٹے نے اس ناول کی سادگی اور اسلوب فطرت کے درس کا بہت اثر قبول کیا اور اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں اس قصہ کو تمام ناولوں سے برتر بتایا ہے۔

تازہ نظر بابر اُس کی مست اور سیاہ آنکھوں میں پیوست ہو تازہ اور میری روح اُس کے لبہاں
 تادک اور رخسار صد لہن پر لصدق ہوتی رہی اور میں اُس کی خیریں کلاہی میں اتنا محو ہو گیا
 کہ اُس کے الفاظ کا بھی خیال نہ رہا۔ اسی حالت میں میں دنیا و مافیہا سے اس طرح بیگانہ
 ہو کر گاڑی سے اُترا جیسے کوئی مدہوش خواب یا سرمست شراب ہوا اور اُن فتنہ کو بھی سُن نہ
 سکا جو سامنے والے روشن کمرہ سے بلند ہو رہا تھا۔ سٹر اندر ان اوز کوئی جھان۔ نہ نے
 (میں نام سے زیادہ واقف نہیں) جو اس بڑھی چچی اور شارلٹ کے رفیق رقص تھے، ہم
 لوگوں کا گاڑی کے پاس استقبال کیا اور اپنی اپنی رفیقہ کو ہمراہ لے گئے۔ میں بھی پیچھے
 پیچھے اُن لوگوں کے ساتھ ہویا۔

سُست قدم والے رقص سے ابتدا ہوئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی عورتوں کے ساتھ
 رقص کیا اور جوان میں نہایت بد صورت تھیں وہ جلد ہی اساتذہ نہیں چھوڑتی تھیں شارلٹ
 اور اس کے ہمراہی نے انگریزی طرز کا ایک دیہاتی رقص شروع کیا اور جب ان دونوں
 نے رقص کرتے کرتے میری طرف رخ کیا تو اس وقت میرا دل مارے خوشی کے اتنا آچھل رہا تھا
 کہ تم اسکا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کاش تم شارلٹ کو رقص کرتے دیکھتے جب وہ رقص کرتی ہے
 تو معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات رقص میں مصروف ہے، اُسکی زندگی گو یا سراپا رقص ہے۔
 ہاں، وہ رقص کرتے وقت دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر معلوم ہوتی ہے۔ آف! اُسکا جسم کتنا
 سڈول ہلکا اور خوبصورت ہے میں نے جب اُس سے اپنے ساتھ رقص کرنے کی درخواست کی
 تو وہ ایک دوسرے شخص کے ساتھ دوبارہ مصروف رقص تھی تاہم تیسری بار ہم آغوش ہو کر
 رقص کرنے کے لئے اپنی ہمراہی کا فخر مجھے بخشنے پر وہ نہایت آزادی سے راضی ہو گئی۔ ساتھ ہی
 اُس نے اپنے دل فریب ہونٹوں کو ہلا کر جس پر ایک نہایت سحر طراز مسکراہٹ کھیل رہی تھی
 کہا کہ مجھے تو جرمن طریقے کا رقص دینی ہم آغوش ہو کر رقص کرنا، بہت پسند ہے اور
 اس طرف رواج بھی یہی ہے کہ نو جوان عورتوں اور مردوں کے جوڑ جرم نالچ ناپتے
 ہیں لیکن میرے ساتھی کو اس میں بالکل لطف نہیں آتا اور اگر میں یہ رقص ختم کر دوں تو شاید

اسکو ایک طرح کا آرام ملے۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ آپ جس خالتوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں اس کا مجھ پر حال ہے۔ شاید اسکو اس قسم کے ناچ کا طریقہ معلوم نہیں لیکن لگ بھگ طرز کے دیہاتی رقص کے وقت میں دیکھ رہی تھی کہ آپ جرمن ناچ خوب ناچتے ہیں۔ اچھا آئیے ہم آپ جرمن ناچ ناچیں۔ اس کی اطلاع آپ اپنے ساتھی کو اور میں اپنے ساتھی کو دیدوں تاکہ دونوں جوڑوں کو آسانی ہو۔

ہم لوگ اس تبادلہ پر راضی ہو گئے اور ہمارے ساتھیوں نے بھی اس تبادلہ کو منظور کر لیا۔ اول تو ہم دونوں اپنے بازوؤں کو ہر قسم کا چکر دیکر خوش ہوتے رہے لیکن اتنے ہی میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اٹھانے کی ادا بھی کتنی پیاری اور لکش تھی۔ جب ہم آغوش ہو کر رقص کا وقت آیا اور ہر جوڑ بڑے زوروں کے ساتھ ناچنے لگا تو بعضوں کی نا تجربہ کاری سے محفل میں برہمی پھیل گئی مگر ہم دونوں بڑی صفائی سے اس ریلے سے بچے رہے اور جب ہنگامہ اور بد وضع ناچنے والوں نے اپنا رقص ختم کر دیا تو ہم دونوں نے از سر نو رقص شروع کیا۔ اسوقت وہاں صرف ایک جوڑ موجود تھا جس میں سے کیا بتاؤں کہ اسوقت میرے بدن میں کس بلا کی جستی تھی، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رگوں میں خون کے ساتھ کسی نے پارہ ملا دیا ہے یا میں کوئی بالا از انسانیت ہستی تھا۔ جو اپنی آغوش میں دنیا کی خوبصورت ترین ہستی کو لئے ہوئے ہے اور رقص میں بھی میں باد صبا جیسی شوخیاں دکھا کر دنیا سے بیگانہ ہو جاتا۔

اب میں تم سے اپنے دل کی ایک بات کہتا ہوں یعنی ایسی خوبصورت ہستی کے ساتھ حقوڑی دیر جو رقص ہوئے کے بعد جی تو یہی چاہتا ہے۔ خواہ اس آرزو میں مجھے کتنی ہی سزا کیوں نہ بھگتنی پڑے کہ اب وہ کسی غیر کے ساتھ نہ تو لطف صحبت اٹھائے اور نہ رقص کرے۔ ہاں تو تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ ہم دونوں حقوڑی دیر تک اپنی سالن درست کرنے کے لئے کمرہ میں ٹپٹے رہے بعد ازاں جب شارلٹ بیٹھ گئی تو میں نے غیبو کی کچھ قاشیں جو میں اپنے ساتھ لایا تھا اس لئے کہ وہاں ان کا ملنا مشکل تھا پیش کیں۔ لیکن ہر قاش جو وہ اپنے

کسی ہم نشین کو دیتی میرے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی۔ وہ اپنی طریقہ کے تیسرے رقص میں ہمارا غم دوسرا تھا اور جب ہم دونوں رقص ختم کر کے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے وہاں سے اُسوقت کتنے مضطربانہ اور االمانہ انداز سے میں نے اُس کے بازوؤں اور سر بھری ہانکوں کو دیکھا تھا جو محبت اور فطرت کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں، تو ایک خاتون جس کا چہرہ باوجود جوانی کی بہار ختم ہو جانے کے حسین تھا سامنے سے گزری اور شارلٹ کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اپنی انگلیوں کو جارحانہ انداز میں بلند کر کے ایک خاص پر معنی لہجہ میں کہا ”البرٹ! البرٹ“ فوراً ہی میں نے شارلٹ سے اپنی جسارت کی معافی مانگ کر پوچھا کہ یہ البرٹ کون ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اتنے میں سیڑھیوں پر میرا اور اُسکا ہاتھ ایک عورت کے درمیان آجانے سے چھوٹ گیا اور جب ہم دونوں پھر اُترنے لگے آئے تو اُسوقت اُس کے چہرے پر حزن اور فکر کے اثرات تھے۔ اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف ٹیکنے کے لئے بڑھایا اور کہنے لگی کہ ”آپ سے میں کیا چھپاؤں کہ البرٹ کون ہے۔ البرٹ آدمی اچھا ہے اور میرا منگیترا ہے۔“ اس فقرہ میں کوئی خاص بات نہ تھی اسلئے کہ گلاڑی میں مجھے یہ خبر معلوم ہو چکی تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اُسوقت تک میں البرٹ کو شارلٹ کے سلسلہ سے نہیں جانتا تھا۔ کون شارلٹ؟ وہی شارلٹ جس کا میں اتنی معمولی ملاقات میں گرویدہ ہو گیا۔ بس اتنا میرے لئے کافی تھا۔ میرے حواس بالکل پریشان ہو گئے جس سے تمام لوگوں میں برہمی پھیل گئی اور اگر شارلٹ مجھے کھینچ کر ٹھیک نہ کرتی تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔

جب ہم آگ رقص میں مصروف تھے تو اُس وقت آسمان پر بجلی چمک رہی تھی۔ میں پہلے کہہ چکا تھا کہ موسم گرما کے لئے بجلی کا چمکنا کوئی خاص بات نہیں۔ یہ تو اس موسم میں ہوتا ہی رہتا ہے مگر اب بجلی کی چمک زیادہ پریشان کن ہو گئی اور گرج کی آواز تو اتنی زیادہ ہو گئی کہ سارنگی کے ہر تار سے اس کی صداے بازگشت نکلتی۔ یہ رعد و برق کی تیزی آخر کار اتنی بڑھی کہ تین عورتیں رقص چھوڑ کر چلی گئیں اور ان کے ساتھ انکے ہمراہی بھی فہر ہو گئے۔

اور بعد کو تو انتشار کی کیفیت عام ہو گئی، جس کو دیکھتے پریشانی اور خوف کی صورت بنا ہوا
 پناہ کی جگہ تلاش کر رہا ہے۔ اتنے میں باجہ بننا بھی بند ہو گیا۔ ہم لوگ جب عیش و نشاط کے
 عالم میں ہوتے ہیں تو خدا سی تکلیف اور ہراس کا اثر ہماری طبائع پر بہت زیادہ شاید اس وجہ سے
 پڑتا ہے کہ حالت صفا اور مقابلہ میں چیزوں کا پرتو صاف اور واضح ہو جاتا ہے یا پھر اس لئے
 کہ طبائع کی کیفیت اس وقت زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے اور ذرا سا اثر بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے
 یہی وجہ ہے کہ اس خاص حالت میں عورتیں اکثر چیخ اٹھتی ہیں۔ ایک عورت دریا کی طرف
 اپنی پیٹھ کئے ہوئے نہایت ہمت کے ساتھ اپنے کانوں میں اٹھکی دیئے ہوئے بیٹھی تھی اور
 دوسری اُس کے زانو پر اپنا سر رکھ کر دبی جاتی تھی اور تیسری تو اپنی چھوٹی ہن کو لے کر
 دونوں کے درمیان گھسی جاتی تھی اور اسی عرصہ میں اُسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو
 بھی جاری تھے۔ کچھ فوراً مکان واپس چلی گئیں اور بعض تو اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھیں کہ
 اس خوف و ہراس کے عالم میں ان کے بعض بے تیز ہمارا ہیوں نے اُن لبہائے لعلین کے
 بے دھڑک بوسے بھی لے لئے جن کی فریاد زمین سے آسمان تک جا رہی تھی مگر ان کو خبر
 تک نہیں ہوئی۔ مردوں میں سے کچھ لوگ خاموشی سے سگار پینے نیچے چلے گئے اور کچھ مکان کی
 مالکہ کی تجویز پر عمل کر کے ایک دوسرے کمرہ میں جا کر بند ہو گئے جس کے درپوں کے پردے
 وغیرہ گرا دیئے گئے۔ جیسے ہی کہ ہم لوگ کمرہ میں داخل ہوئے شارلٹ نے کرسیاں کھینچ
 کر ایک حلقہ میں ہم لوگوں کو بٹھا دیا اور کچھ کھیل شروع کرنے کی تجویز کی۔ کچھ لوگ منکھولے
 ہوئے اس امید میں کھڑے ہو گئے کہ اگر ہار جیت کا کھیل ہوگا تو دیکھنے میں لطف آنے کا
 اتنے میں شارلٹ نے کہا کہ آؤ گنتی کا کھیل کھیلیں یعنی میں داہنی طرف سے بائیں طرف چکر
 لگاتی ہوں اور آپ لوگ ایک ایک کر کے جلد جلد اپنا نمبر گنتے جائیں۔ جو صاحب کہیں گے
 یا غلطی کریں گے اُن کی گوشمالی ہوگی۔ گنتی ہزار تک ہوگی۔ اس تماشہ میں اچھا خاصہ لطف آیا
 شارلٹ نے ہاتھ اٹھا کر گردش شروع کی۔ پہلے چکر پر پہلے آدمی نے کہا ایک۔ دوسرے پر
 دوسرے نے دو۔ اور تیسرے پر تیسرے نے تین کہا اور پھر شارلٹ کی رفتار کچھ تیز ہو گئی

اتنے میں ایک صاحب نے غلطی کی اور وہیں اُن کی گوشمالی ہوئی اسس پر دوسرا شخص بجائے گئے کے ہنس پڑا۔ اسکا ہنسنا تھا کہ اُس کی بھی گوشمالی ہوئی۔ اسی طرح یہ قصہ ہوتا رہا میرے حصہ میں بھی دو گوشالیاں آئیں جو اوروں کے حصہ سے زیادہ سخت تھیں لیکن میں نے اُن سے خاصا لطف بٹھایا اجمعی گنتی ہزار تک نہیں پہنچنے پائی تھی کہ جلسہ میں ایک عام قہقہہ اور گڑبڑ کی کیفیت شروع ہو گئی اور کھیل بھی ختم ہو گیا اب لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے اسٹے کے طوفان بھی ختم ہو چکا تھا۔ شارلٹ بڑے کمرہ سے واپس جانے لگی تو میں بھی ساتھ ہو لیا رستہ میں اُس نے کہا کہ میری سخت گوشالیاں اور دھپوں سے لوگ خوف و ہراس بھول گئے اول اول میں بھی کچھ خوف زدہ تھی مگر میں نے جلسہ کی تفریح کے لئے جو ہمت کی تو میرا بھی ڈر جاتا رہا۔ بعد ازاں ہم لوگ کھڑکی کے پاس گئے گرج کی آواز دور دور سے اب بھی آتی تھی۔ سامنے تمام کھیتوں پر پانی کی ایک ہلکی دھار آسمان سے گر رہی تھی اور ہوا میں ایک ہنسا دلپسند اور تازگی بخش خوشبو پھیلی ہوئی تھی سامنے کا دلفریب منظر دیکھنے کے لئے شارلٹ کہنیوں پر اپنا چہرہ ٹیک کر آگے جھکی اور تمام منظر دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر میری طرف پکھا اُسوقت اُسکی آنکھیں پرہنم تھیں اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی ”کلوپ اسٹوک“! میں فوراً کلوپ اسٹوک کی اس غزل کو سمجھ گیا جسکا خیال اُس کے

۱۸۳۳-۱۸۳۴ء) تھا۔ اسی صدی کا مشہور جرمن شاعر جو جرمن شاعری میں جدید دور کا علم بردار ہے۔ کلوپ اسٹوک سے قبل جرمن ادب زیادہ تر فرانسیسیوں کی نقالی پر منحصر تھا اور شعرو سخن پر آمد کے بجائے آورد کا رنگ غالب تھا۔ شاعر کے لئے بس ردیف و قافیہ، بحر و وزن کا جاننا ضروری تھا اور اسی پر تمام شاعری کا دار و مدار چمکا جاتا تھا۔ کلوپ اسٹوک نے شاعری کو دل کے جذبات کا ترجمان بنا دیا اور اسی لئے اُس کے کلام میں خاصا زور ہے۔ اس کی مشہور نظم ”مسیح“ — اول بار ۱۸۳۳ء میں شائع ہوئی جس میں مذہبی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اُس نے قدیم جرمانی اور نارسی دشمالی یورپ کے قدیم باشندے نارس کہلاتے ہیں، طرزیں نظمیں لکھیں جس نے عوام میں قبول کی سند حال کی۔ بلحاظ وزن وہ اکثر نظموں میں قدیم رومی شاعر جوہرئس کی پیروی کرتا ہے۔ قدیم جرمانی اور نارسی طرز کی نظمیں لکھ کر اُس نے اپنے زمانہ کے مقررہ اصول کے بندگراں کو جس سے جرمن ادب دیا ہوا تھا کاٹ ڈالا۔ وہ ہمیشہ دل سے آزادی کا حامی رہا اور اس کی آزادی کی یہ روح ادب میں بھی ملتی ہے۔ جب انقلاب فرانس شروع ہوا تو اُس نے بنی نوع انسان کی آزادی کے حق میں بہت سی نظمیں لکھیں۔ اپنی ایک نظم میں

دل میں اسوقت تھا۔ میرے دل میں اسکے احساس سے درد پیدا ہوا اور بے اختیار ہونٹوں پر
میں اس کے نرم اور گورے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر جھک گیا اور اسکو اٹک شوق
کے چند قطرہں سے تر کیا۔ جب سر اٹھایا تو اس کی طرف غور سے دیکھ کر میں نے کہا کہ اے
کلوپ اسٹوک! افسوس تو نے ان آنکھوں میں دھار لٹ کی طرف اشارہ کر کے اپنے خیالی محبوب
کا جلوہ کیوں نہیں تلاش کیا؟ مگر مجھے تیرے نام سننے کی جس کو لوگ اکثر بدتمیزی سے یاد کرتے
ہیں کیا ضرورت! "

۱۹ جوں

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی رام کہانی کہاں چھوڑی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب میں بستر پر
سوئے گیا تو دیکھے تھے اور اگر تم اس وقت یہاں ہوتے تو میں تم کو لکھنے کے بجائے تم سے
باتیں کرتا اور صبح تک نہ خود سوتا اور نہ تم کو سونے دیتا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید رقص سے واپس آنے کے بعد کی کیفیت میں نے تم کو نہیں لکھی
اور آج تو میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے بہر حال اس روز کی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ تمام
خطہ زمین سرب ہو گیا تھا۔ آفتاب کا طلوع بھی کچھ کم دلچسپ اور دلاؤیز نہ تھا۔ درختوں کی پتیوں
سے پانی قطرہ قطرہ ہونٹ پر ٹپک رہا تھا۔ ہمارے تمام ساتھی سو رہے تھے۔ شارلٹ نے اول مجھ سے
پوچھا کہ "کیا آپ کا ارادہ سونے کا نہیں" اور پھر کہنے لگی کہ "میرے سونے کے لئے زیادہ آرام
نہ کیجئے" میں نے اس کی طرف نظر جا کر دیکھا اور کہا کہ "جب تک ان آنکھوں میں نیند نہیں
میرمی آنکھوں کو نیند حرام ہے" بہر حال ہم دونوں بڑی دیر تک جاگتے رہے اور باتیں کرتے

جو اس نے فرانس کی اسٹیشن جنرل پر لکھی ہے کہتا ہے کہ "میں ساڑھے برس کا بڑھا قبر میں پاؤں لٹکائے موت کے
انتظار میں بیٹھا ہوں لیکن اگر اپنے مرنے سے پہلے میں آزادی کی روح کو مسلط دیکھ لیتا تو میں اس دنیا سے خوش خوش
جاتا" انقلاب فرانس کی ایک حامی عورت ہنری شارلٹ کارڈے کی موت پر اس نے جو نوہ لکھا ہے اس کی چند سطروں
کا آزاد ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"آج یہ کس کی قبر میرے سامنے ہے۔ یہ قبر راس فوگولڈ کی ہے۔ اور اس نرم اور بھر پوری مٹی کے
نیچے۔ کارڈے سو رہی ہے۔ میں بچوں توڑوں گا۔ اور اپنے ہاتھ سے تجھ پر چڑھاؤں گا۔ کیونکہ تو نے
بقیہ صفحہ ۲۸

کہتے جب اُس کے کمرہ کے دروازہ تک آئے تو خادمہ نے دروازہ کھولا اور شارٹ نے اُس سے اپنے والد کی ہچکوں کی غرض سب کی خیریت دریافت کی۔ خادمہ نے کہا کہ سب بخیریت ہیں اور سو رہے ہیں۔

اس کے بعد میں اُسے چھوڑ کر دوسرے روز طے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ اس پر وہ راضی ہو گئی اور میں نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا۔ آفتاب اور ماہتاب برابر اپنی منور کرنوں سے دنیا کو روشن کرتے ہیں مگر اُس گھڑی سے مجھے ان کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام۔ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ گویا ساری دنیا میری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

۱۱ جون

میری زندگی کمال مسرت کے ساتھ اس طرح گزر رہی ہے جیسی کہ خدا اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے۔ بعد کو میری قسمت کی کوتاہیاں خواہ کچھ بھی ہوں لیکن مجھے یہ شکایت کرنے کا مطلق مجاز نہ ہو گا کہ میں صہبائے زندگی کے ایک جام دل فروز سے بھی لذت یاب نہیں ہوا۔

تم نے تو والہانہ دیکھا ہے۔ میں اب مستقل طور پر یہیں مقیم ہوں۔ شارٹ کا مکان یہاں سے قریب ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جب میں وہاں جاتا ہوں تو انسانی زندگی کی تمام مسرتوں سے فیضیاب ہوتا ہوں۔ جب میں نے والہانہ کو اپنی سیر و تفریح کا جولا نگاہ تجویز کیا تھا تو مجھے کیا خبر تھی کہ جنت جیسی فضا و کیفیت اتنی نزدیک ہے اکثر لمبی لمبی سیریں کرتے کرتے میں نے اس شکار گاہ کے مکان کو کبھی پہاڑی پہرے سے اور کبھی میدان میں سے دیکھا ہے جواب میری تمام آرزوؤں اور امیدوں کا آماجگہ ہے۔

میرے پیارے دلہنم میں نے اکثر انسان کی اُن خواہشات پر غور کیا ہے جو اس کو یہ سفر اپنے ملک پر اپنی جان قربان کر دینی۔

اسی خیال کو ایک جگہ علامہ اقبال یوں ادا کرتے ہیں

سرخاک شہید سے برگہاے لالی پاشم بہ کہ خوش با نعال ملت ساز نگار آمد

دنی پرچوں کے سراغ لگانے کی طرف لیجانی ہیں اور پھر اُس کو اپنے پرانے اور تنگ حلقہ کی طرف واپس بلا کر ادھ سم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے ماحول سے بیگانہ بنا دیتی ہیں میں اول اول جب یہاں آیا اور پہاڑی پر سے جب تمام وادی پر نظر ڈالی تو اُس منظر سے بہت متاثر ہوا۔ سامنے جو درختوں کا جھنڈ ہے اس کے سایہ میں بیٹھنا کتنا مسرت بخش ہے اور وہاں سے پہاڑی کی چٹانیں کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں! پھر وہاں سے پہاڑیوں اور وادیوں کا وہ خوشگوار سلسلہ! میرے خیال میں اگر کوئی شخص سیر کرتا ہوا ان وادیوں میں گم ہو جائے تو اُس کو بجائے تکلیف کے آرام ہوگا۔ میں ان وادیوں میں چکر لگاتا ہوا آیا مگر جس کی تلاش میں نکلا تھا وہ نہیں ملی۔ میرے عزیز: فاصلہ کی مثال بالکل زمانہ مستقبل کی سی ہے مگر ایک بات اور ہے یعنی ہماری روحوں پر مستقبل کی بے انتہا وسعت کا کچھ نہ کچھ دُفعندہ لا سا عکس ضرور پڑتا ہے لیکن ہمارے فہم و ہوش پر مثل ہماری بصیرت کے بالکل تائیک بدوہ پڑا ہوا ہے، تاہم ہماری یہی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شے ہماری روحوں کو ابدی مسرت کا نغمہ چھیڑ کر بیدار کر دے خواہ اُس میں ہم کو اپنی ہستی ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ ہاں تو وہ شخص بھی جس میں سفر کا شوق بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے کبھی نہ کبھی گھر لوٹ کر ضرور آتا ہے اور تب وہ اپنے سادہ جمو پڑے میں اپنی بیوی کی بغل میں اپنے بچوں کی محبت میں اور محنت الحیات میں ان تمام خوشیوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جن کی تلاش میں وہ دنیا کے صحراؤں اور جنگلوں میں سرگرداں اور پریشان پھرتا رہا۔

صبح کے وقت جب آفتاب اپنی ہلکی ہلکی سنہری کرنوں سے نیند کے ماتوں کو جگاتا ہے تو میں والہائے باغ میں جوتا ہوں اور اپنے کھانے کے لئے مٹر کی پھلیاں توڑ کر کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کو چھیلتا جاتا ہوں اور ساتھ ساتھ ہومر کا کلام بھی پڑھتا جاتا ہوں اور جب میں ان پھلی ہوئی پھلیوں کو پکانے کیلئے دیگچی کی تلاش کرتا ہوں، لیکن لاتا ہوں آگ جلاتا ہوں اور آگ کی دیکھ بھال کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹنی کو پی کے متاز عاشقوں

سہ یونان کے شہزادہ مگر فیرا ریخی میلر اڈیسیوس کی بیوی تھی۔ ہومر اپنی نظم اڈیسی میں اڈیسیوس کے

میں میری بھی شمار ہے جو اپنے ہاتھوں سے شکار کر کے خود اپنا کھانا تیار کرتے تھے۔ اس وقت دنیا کی تھیں زندگی کا وہ دور جس میں خاندان کے بڑے بوڑھے خاندان کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج میں اپنی سادہ زندگی میں بلکہ کسی شخص کے اُس وقت کی زندگی کی پیروی کر سکتا ہوں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ میرا دل اُن تمام معصومانہ کامیابیوں اور مسرتوں سے بھر پور ہے جو ایک کسان کو اپنے دستِ خزانہ پر اپنے ہاتھ سے اُگائے ہوئے پھلوں اور ترکاریوں کو دیکھ کر ہوتی ہے اور جو نہ صرف کھانے کے ذائقہ سے خوش ہوتا ہے بلکہ اُن دنوں کی خوش آئند صبح و شام کی یاد سے اپنے دل کو معمور پاتا ہے جب اُس نے بیج بویا اُس میں پانی دیا اور پھر پروان چڑھتے وقت اُس کی نگہبانی کرتا رہا۔

۲۹ رجوان

پرسوں شہر سے جب ڈاکٹر صاحب جج صاحب سے ملنے آئے تو اُس وقت میں شارلٹ کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بعض ایک دوسرے پر جھپٹتے اور کبھی اُچھلتے اور جب میں گدگداتا تو سب شور مچاتے۔ دیکھنے میں ڈاکٹر صاحب متین اور وضع کے پابند آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بات چیت کرتے وقت اپنے کپڑوں کی شکن اور جھاڑوت کرتے جاتے تھے۔ میرا بچوں کے ساتھ کھیلنا اُن کو سخت ناگوار ہوا یہاں تک کہ انھوں نے میرے اس فعل کو انسانیت سے خارج قرار دیا۔ میں اُن کے چہرہ کی کیفیت دیکھ کر ان کا انداز

سفر دل کا ذکر کرتا ہے مشہور ہے کہ اوڈیسیوس بیس برس تک بیرونی سفر میں مصروف رہا۔ اس عرصہ میں اُس کے شہر والوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ مر گیا اس کی خوبصورت بیوی یعنی لوی کی کوشا دی کا پیغام دینا شروع کیا اور جوں جوں دن زیادہ ہوتا جاتا تھا پیغام دینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پیغام دینے والوں میں شہر کے بڑے بڑے بہادر سپاہی تھے جو اپنی زندگی سیر و شکار میں بزمِ قدرت کا رکن بن کر گزارتے تھے۔ بالآخر یعنی لوی نے ان جھگڑوں سے تنگ آ کر ایک ترکیب سوچی اس نے ایک کپڑا بنا شروع کیا اور شرطیں لاری کجب وہ ٹکڑا ختم ہو جائیگا تو وہ شاوی کرے گی مگر جو کپڑا وہ دن کو بتی رات کو اُسے کھول دالتی جس سے اس کی شادی برابر ملتی رہی۔ بالآخر وہ دن آگیا جب اوڈیسیوس بحیرہِ رومنی گھر واپس آگیا اور اپنی لوی کو پیچہ عشاق سے نجات مل گئی۔

سمجھ گیا مگر بچوں کے ساتھ بدستور کھیلنا رہا اور ان کی عاقلاً نہ گفتگو پر خاموشی اختیار نہ کر کے بچوں کی تلاش کے پتوں کی عمارت جو گرتی جاتی تھی بناتا جاتا تھا۔ سنا ہے کہ جہانے کے بعد انھوں نے لوگوں سے کہا کہ بچے تو اول ہی سے خراب تھے مگر اب ور تھوران کو بالکل ستیا تھا کہ یہاں ہے۔

میرے پیارے دوست۔ جب میں بچوں کے ان اوصاف اور نیکیوں پر غور کرتا ہوں جو ایک دن بڑھ کر ان کو آدمی بنا دیں گی تو اس وقت بچوں سے زیادہ میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا یا جب میں بچوں کی ضد میں ان کی آئندہ سیرت کی استقامت مضبوطی اور شجاعت کی دھندلی تصویر دیکھتا ہوں یا ان کی تلون مزاجی کو دیکھتا ہوں جو ان کی آئندہ مذہبی کے رنج و غم سے ان کو باسانی نکال لے جائے گی اور ساتھ ہی ان کے سادگی و بھروسہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اُس معلم انسانیت کا یہ زہین قول فوراً یاد آ جاتا ہے کہ "اگر تم ان کی طرح نہ ہوئے تو....."۔ ہاں تو یہ بچے جو کسی طرح ہم سے کم نہیں بلکہ ہمارے برابر ہیں ہمارے لئے نمونہ ہونے چاہئیں حالانکہ ہم ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کی مرضی پر ان کو اختیار نہیں دیتے۔ تو کیا اُس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری بھی کوئی مرضی نہیں! آخر ان بچوں پر ہمارا یہ مالکانہ حق کہاں سے آیا؟ کیا ہم ان پر اس لئے حکمرانی کرتے ہیں کہ ہم زیادہ معزز اور تجر بہ کار ہیں۔ اے خدائے بزرگ و برتر! تو اپنے تخت جلال سے جھوٹے اور بڑے دونوں بچوں کو دیکھتا ہے۔ اور تیرے بیٹے نے مدت ہوئی دنیا کو متا دیا کہ تو کچھ خوش ہو تا ہے، آیا چھوٹے یا بڑے بچوں سے یہ گریہ لوگ نہ تو ان کو مانتے ہیں اور نہ ان کا پیغام سنتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو بس اپنے ہی رنگ میں رنگتے ہیں۔ اچھا۔ دلہلم و خفست۔ میں اس مضمون پر اب زیادہ خامہ فرسائی نہ کروں گا۔

یکم جولائی

شادی چند یوم کے لئے شہر میں ایک عورت کے یہاں عیادت کیلئے گئی ہے جو قریب لڑک ہے ڈاکٹر دل نے اُس سے مایوس العلاج ہو کر حجاب دیدیا ہے۔ اُس عورت کی خواہش

تھی کہ موت سے قبل اُس کی آنکھیں شارلٹ کے دیدار سے منور ہو جائیں واقعی یہ سب کچھ
 کی تسلی بخشی کرنے میں جو یہ طوی شارلٹ کو حاصل ہے اُس کا تھوڑا سا اثر میرے دل پر بھی
 پڑتا ہے جو اُس کی جدائی سے بیقرار ہے یعنی میرے زخم دل کے لئے وہ نہاں رہا ہے۔

پچھلے ہفتہ میں اس کے ساتھ قصبہ میں کے پادری سے ملے گیا تھا۔ قصبہ پہاڑیوں
 کے درمیاں یہاں سے تین میل پر واقع ہے۔ ہم لوگ چار بجے وہاں پہنچے۔ سب مل ملا کر
 ہم لوگ تین آدمی تھے یعنی شارلٹ کی چھوٹی بہن بھی ساتھ تھی۔ جب ہم لوگ پادری کے
 مکان کی چہار دیواری کے اندر پہنچے تو بڑے پادری صاحب کو دیکھا کہ وہ اخروٹ کے دو
 درختوں کے نیچے بیٹھے ہیں۔ شارلٹ کو دیکھتے ہی پادری صاحب اپنا بڑھاپا اور ساتھ
 ہی اپنا عصا بھول گئے اور بڑی گر محوشی سے استقبال کے لئے بڑھے۔ شارلٹ یہ دیکھ کر
 خود دوڑ پڑی اور جلدی سے پادری صاحب کے پاس پہنچ گئی اُن کو بٹھایا اور خود بھی اُن
 کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف سے سلام اور کچھ پیغام کہا۔ پھر اُس پادری کے
 چھوٹے مگر بد صورت اور گندے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی جو اس بڑھاپے میں اُس کی
 آنکھوں کے نور اور دل کا سرور تھے۔ ولیم! کاش تم شارلٹ کی اس توجہ کو دیکھتے
 جو اُس نے بڑھے پادری کے ساتھ برتی۔ اس کا اتنا خیال مد نظر تھا کہ کبھی اس کے بہرین
 کی وجہ سے زور سے بولتی اور کبھی اُس کے اُن بچوں اور لڑکوں کا ذکر کرتی جن کے بھی دنیا
 میں کھیلنے اور کودنے کے دن تھے مگر اہل کے بے رحم اور عالمگیر ہاتھوں نے اُن کو دنیا
 جاودانی میں پہنچا دیا۔ پھر کارلسباڈ کے قدرتی اور مفید چشموں کا ذکر چھیڑ کر کہتی کہ ابھی
 گری میں وہاں جانے کا قصد رکھتی ہوں اور آخر میں اُس کی صحت کے متعلق رائے زنی
 کر کے کہتی کہ ما شاء اللہ اب آپ کی صحت بہ نسبت پہلے کے بہتر ہے۔

شارلٹ اور پادری صاحب کی گفتگو کے دوران میں میں پادری صاحب کی نیک دل
 میم صاحبہ سے باتیں کرتا رہا۔ پادری صاحب بہت خوش و خرم نظر آتے تھے جب میں نے
 اُس کے اخروٹ کے درختوں کی خوبصورتی اور آرام دہ سایہ کی تعریف کی تو انھوں نے

درختوں کی تاریخ بتانی شروع کی اور کہنے لگے کہ "یہ تو نہیں معلوم کہ بڑے درخت کو کس نے لگایا ہے کوئی کہتا ہے کہ فلاں پادری نے لگایا ہے کوئی کہتا ہے دوسرے نے لگایا لیکن پیچھے والا چھوٹا درخت تو بالکل میری بیوی کا ہم عمر ہے اور آئندہ اکتوبر میں ٹھیک پچاس برس کا ہو گا گا۔ میرے سسر نے صبح کو یہ درخت لگایا اور شام کو میری بیوی پیدا ہوئی۔ مجھ سے قبل میرا سسر یہاں رہتا تھا اور وہ ان درختوں کا بڑا شائق تھا۔ مجھے بھی ان سے کافی محبت ہو گئی ہے آج سے ستائیس برس قبل جب میں یہاں بطور طالب علم آیا تھا تو اُس وقت اس درخت کے نیچے میں نے اپنی موجودہ بیوی کو ایک لٹھے پر بیٹھے کچھ کاڑھنے اور پھول بناتے دیکھا تھا۔ اتنے میں شارلٹ نے پوچھا کہ آپ کی لڑکی کہاں ہے؟ پادری صاحب نے جواب دیا کہ مسٹر اسمتھ کے ساتھ میدان میں گھاس کا گٹھا بنتا دیکھنے گئی ہے۔

قصہ کو پھر سے شروع کر کے اُس نے وہ تمام باتیں بتائیں کہ کس طرح اس نے اپنے آئندہ خسر اور بیوی کی نظروں میں نیک نامی حاصل کی اور کس طرح وہ اول پادری کا نائب ہوا اور بعد کو اُس کا جانشین۔ ابھی وہ اپنی حکایت ختم نہ کر پاتا تھا کہ اس کی لڑکی مسٹر اسمتھ کے ساتھ باغ میں ہوتی ہوئی واپس آئی اور محبت اور پیار سے شارلٹ کو سلام کیا۔ مجھ پر اُس کی شکل و شبہات کا کافی اثر پڑا۔ اسکا چہرہ کچھ سالو والا ہے۔ جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ شوخ طبع اور خوش مذاق ایسی ہے کہ ایک آدمی کانٹوں وغیرہ کی سیر و تقریر میں غلطیوں کے لئے اس کے ساتھ اپنا وقت نہایت عمدگی سے گزار سکتا ہے۔ اسکا عاشق جیسا کہ مسٹر اسمتھ معلوم ہوتے ہیں دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن کم گوئی کا یہاں تک پابند ہے کہ شارلٹ کی پیہم کوششوں کے باوجود اُس نے ہم لوگوں کی گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی اس لئے کہ مسٹر اسمتھ کی خاموشی کسی نالائق کی بنا پر نہ تھی بلکہ ان کی طبیعت کی افتادہ ہی کچھ ایسی بگڑی ہوئی تھی۔ جب ہم لوگ بعد کو ٹہلنے نکلے تو یہ راز آشکار ہو گیا۔ رستہ میں جب میں پادری صاحب کی لڑکی فریڈریکا کے ساتھ ہنس بول رہا تھا تو اُن کو میرا یہ فعل سخت ناگوار گذرا۔ یوں تو اُن کے چہرہ پر ہر وقت کوئی نہ کوئی فکر کے آثار ضرور رہتے ہیں مگر اس وقت تو صاف طور پر چہرے پر جبین نظر

آتے تھے۔ شارلٹ نے اُن کے تیور دیکھ کر میری آستین کھینچی اور مجھ سے کہا کہ ”کیا حرکت کر رہے ہو اور فریڈریکا سے آخر کتنی باتیں کرو گے؟“ جب میں لوگوں کو خاص کر جوانی کی سار میں جو عیش و نشاط کا زمانہ ہے ایک دوسرے کو ایذا پہنچاتے دیکھتا ہوں یا اپنی مسرتوں کے چند دنوں کو بے کار جھگڑوں میں بے دردی سے ضائع کرتے اور اُن غلطیوں پر اس وقت پچھتاتے دیکھتا ہوں جب تدبیر کا دروازہ بند ہو چکتا ہے تو مجھے اس سے زیادہ شاید ہی کسی اور چیز سے صدمہ اور رنج ہوتا ہو۔ رستہ بھر یہی خیال میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا اور ہم لوگ شام کو جب سیر سے لوٹ کر بادی کے مکان پر آئے اور میز کے کنارے کھانا کھانے بیٹھے تو ہماری گفتگو کا رخ بدل کر انسانی زندگی کے مصائب و آلام، انبساط و جشن پر آیا۔ اُس وقت پھر میں نے ہر ممکن طریقہ سے کچ طبعی اور بد مزاجی کے خلاف جو کچھ مجھ سے ہو سکا کہا اور واضح کر دیا کہ ہم لوگوں کی عام عادت یہ ہے کہ ہم برابر اس امر کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ہم لوگوں کی زندگی میں ہنسنے اور خوش ہونے کے دن بہت کم ہوتے ہیں حالانکہ ہماری مصیبت اور رنج کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں لیکن اگر ہم اپنی طبیعتوں کو اس انداز پر ڈھال لیں کہ جب خدا کی طرف سے ہم پر کوئی رحمت نازل ہو تو اس کا شکر بھیجیں تو یقیناً مصیبت کے وقت بھی دل میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے گی جس سے دل کو بجائے کمزوری کے استقامت ہوگی۔ اس پر پادری صاحب کی بیوی نے کہا کہ ”ہم اپنے مزاج پر ہمیشہ قدرت نہیں رکھ سکتے اس کا دار و مدار ہماری تندرستی اور جسمانی حالت پر ہے جب جسم صحت کی حالت میں نہیں ہے تو دماغ بھلا کیسے تندرست رہ سکتا ہے؟“ میں نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ بیشک اس قسم کی جسمانی حالت بیماری سے کم نہیں اور اس کے علاج کی ضرورت ہے۔“ شارلٹ یہ سُن کر بول اُمٹھی کہ ”اچھا پھر آپ ہی کوئی علاج بتائیے“ اور پھر کہنے لگی کہ ”میرے خیال میں اس کا دار و مدار بہت کچھ اپنی ذات پر ہے۔ کم سے کم میرے ساتھ تو یہی معاملہ ہے مثلاً جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو میں باغ میں جا کر گاتی ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فوراً میری طبیعت دوبہ اصلاح ہو جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”بس بس بالکل یہی میرا مطلب ہے۔ بد مزاجی کی مثال کاہلی سے دیکھتی

ہے۔ کابلی انسان کی فطرت میں داخل ہے لیکن اگر ایک دفعہ بھی ہم اپنی کابلی پر غالب آ جاتے ہیں تو ہم ہمیشہ مستعد اور خوش باش رہتے ہیں اور حرکت میں جس سے پہلے ہم بھاگتے تھے، خاصا لطیف لٹنے لگتا ہے۔“ فریڈریک میری بالوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی لیکن اس نوجوان نے یہ اعتراض کیا کہ ہم لوگ اپنی طبائع پر قادر نہیں ہیں اور اپنے جذبات پر تو ہم کو کسی طرح قابو لے ہی نہیں سکتا۔“ میں نے اُس کو جواب دیا کہ جناب سوال خراب قسم کے جذبات کا ہے جس سے ہر شخص تو عہدہ برا ہونا چاہتا ہے۔ مگر کسی کو بھی اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ جذبات پر قابو پانے کے لئے ہمارے پاس کون سی طاقت ہے اور اُس کا کیا اثر ہے۔ بیماروں کو دیکھو! کس سختی کے ساتھ ڈاکٹروں کی رائے پر صرف اس اُمید پر عمل کرتے ہیں اور کتنی کڑوی کڑوی دوائیں حلق کے پار اتار جاتے ہیں کہ اُن کو صحت ہو جائے گی۔“ میں نے دوسری طرف پھر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑھا پادری میری بالوں کو بڑے شوق سے سن رہا تھا اس لئے میں نے اپنی آواز ذرا اور بلند کر دی اور اس سے یوں براہ راست مخاطب ہوا کہ ”جناب گناہوں کے خلاف اب تک سیکڑوں وعظ بیان کئے جا چکے ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ آیا کسی نے آج تک بد تمیزی اور بد مزاجی کے خلاف بھی کوئی وعظ کہا ہے۔“ اس پر پادری صاحب نے جواب دیا کہ ”یہ مسئلہ ان لوگوں کی توجہ کا محتاج ہے جو شہروں میں وعظ کہتے ہیں۔ گانوں کے دیہاتی بھلا کیا جانیں کہ بد تمیزی اور کج طبعی کیا چیز ہے لیکن اس کے متعلق اگر کبھی کبھی ذکر دیا جائے تو وہ میری بیوی، نوکر اور بیچ صاحب کے لئے مفید ہو گا۔“ اس پر ہم سب ہنس پڑے اور پادری صاحب بھی اتنا ہنسنے کہ اُن کو کھانسی آنے لگی جس سے ہماری گفتگو کچھ دیر کے لئے ملتوی ہو گئی۔

مسٹر اسمتھ نے پھر اس مضمون زیر بحث کو یوں شروع کیا کہ آپ لوگوں نے اس بد مزاجی کو ایک جرم قرار دے رکھا ہے جو میری رائے میں نہایت سخت لفظ ہے میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں! جو چیز ہمارے لئے اور دوسروں کے لئے مفید ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسکو جرم کہا جائے کیا آپ کے خیال میں یہ کافی نہیں کہ جب ہم میں ایک دوسرے کو خوش کرنے کی صلاحیت نہیں تو اس صورت میں کیا ہم اوروں کو بھی اس مسرت سے بے بہرہ کر دیں جس سے

ہم سب لطف اٹھانے کی خواہش رکھتے ہیں کیا آپ مجھے کوئی ایسا تند مزاج آدمی بتا سکتے ہیں جو اپنے ہمسایوں کو تکلیف دینے بغیر اپنی تمام بد مزاجی کا بار صرف اپنے ہی سر رکھتا ہو؟ نہیں کبھی نہیں بتا سکتے! بد مزاجی اور تند خوئی قبیحہ ہے اپنے احساسِ نالافتی اور بے ہنری کا اور صلہ ہے اپنی بیزاری اور تنگ دلی کا جو حاقتِ آمیز تکبر اور حسد سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم کو لوگوں کی مسرت ایک آنکھ نہیں بھاتی تا آنکہ ان کی مسرت خود ہمارے ہی دستِ کرم سے نہ ملی ہو، شارٹ نے میری طرف دیکھا اور میری گرمیِ کلام اور حرارتِ تقریر کو سن کر مسکرائی لیکن فریڈریک کی آنکھوں کو پرہم دیکھ کر میں نے اپنا سلسلہ تقریر جاری رکھا اور اس طرح گویا ہوا ”خلاص بدبخت پر اپنا قہہ بازار کرے جو اپنی تمام قولوں کو صرف اس لئے استعمال کرتا ہے کہ دوسرے انسان قدرتی خوشیوں اور مسرتوں سے محروم رہیں۔ تمام دنیا کے احسانات اور برکات کبھی بھی ان خوشیوں اور مسرتوں کا معاوضہ نہیں ہو سکتے جن کو ایک ظالم ہاتھ فنا کر دیتا ہے۔“

میرا دل جوش و اثر سے لبریز تھا اور بہت سی پھپھلی باتوں کے سہے ہوئے نقشِ دلِ باغ میں تازہ ہو رہے تھے جس سے میری آنکھیں بھی پرہم ہو گئیں۔ اسی حالت میں میں بول اٹھا کہ ہم کو روز اپنے دل میں ایسی بات کہنا چاہئے کہ جس سے ہم دوستوں کی مسرت میں غل نہ ہوں اور کم سے کم اتنا تو ضرور ہو کہ ان کی خوشیوں میں شریک ہو کر ان کو بڑھائیں لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے یعنی جب ان کی روحوں میں جذبات نے بے قراری اور غم نے التهاب برپا کر رکھا ہو اور جب مصائب و آلام نے ان کے دلوں کو پارہ پارہ کر دیا ہو تو کیا آپ اس وقت ان کے زخمی دلوں پر مرہم بھی نہیں لگا سکتے؟ اور جب کسی مہلک بیماری کا غلبہ ایسے شخص پر ہوتا ہے جس کی قبر آپ لوگوں نے اپنی حرکتوں سے قبل از وقت کھود دی ہے اور جب وہ اس نامرادی اور مایوسی کے عالم میں آپ کے سامنے پڑا ہوا اپنی بیمار اور کم بین آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور اس وقت موت کا پسینہ اُس کے ماتھے پر نکل آیا ہو تو آپ سب لوگوں کی حالت اُس کے سامنے ایک مغضوب مجرم کی سی ہوتی ہے۔ آپ اپنے تمام ساز و سامان اور دولت و حشمت کے باوجود اُس کی جان نہیں بچا سکتے۔ شاید آپ اپنے گناہوں کا اُس وقت اثر کر رہے ہیں

جب تو بہ کا دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ اس وقت اپنی بدبختی اور کم مانگی کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ ماتم کرتے ہیں جب آپ کی ہر ممکن امداد، ہر ممکن کوشش، اُس مرلیض جان کے اُس سہل نیجاں کے لئے ایک لمحہ ایک دقیقہ کا سکون بھی ہم نہیں پہنچا سکتی، ان الفاظ کے ادا کرتے وقت بالکل اسی قسم کا ایک منظر جہاں میں پہلا کبھی موجود تھا میری آنکھوں کے سامنے اپنی پوری سخی اور درد کے ساتھ دفعتاً پھرنے لگا۔ اس یاد سے متاثر ہو کر میں نے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پر رکھا اور مجمع احباب سے فوراً الگ ہو گیا۔ شارلٹ نے میری یہ حالت دیکھ کر جو مجھ سے گھر جانے کو کہا تو میں اُس کی آواز پر چونک پڑا اور ہوش میں آیا۔ واپسی میں رشتہ بھر بڑی نرمی اور محبت سے وہ مجھے سمجھاتی رہی اور کہنے لگی کہ ”ہر چیز میں تمھاری پر جوش و بے سنگی اور دلچسپی سے تمھاری زندگی پر برا اثر پڑے گا اور رشتہ حیات کوتاہ ہو جائے گا۔ آئندہ سے احتیاط لازم ہے“ میں نے کہا کہ ”ہاں اسے میری روح! آئندہ سے میں اپنی صحت کی ضرورت نہیں گہری کر دوں گا اور زندگی بس تمھارے ہی لئے گزار دوں گا“

ہر روزانی

شارلٹ اب تک اپنے قریب المرگ دوست کے ہمراہ ہے اور اب تک ویسی ہی حسین اور روح پرور ہے۔ اس کی ہر بات، ہر ادا درد مندوں کا علاج اور دکھے ہوئے دلوں کا مرہم ہے وہ جہاں کہیں ہوتی ہے وہاں مسرت اور شادمانی کے پھول جھپٹتے ہیں۔ کل وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے ساتھ باہر گئی تھی۔ مجھے خبر لگی تو میں بھی باہر نکل گیا اور اس سے ملاقات ہوئی۔ ہم لوگ بڑی دیر تک ساتھ ٹہلتے رہے۔ واپسی میں اپنے محبوب چشمہ کے کنارے آرام لینے کے لئے رکے۔ شارلٹ اُس کی نیچی دیوار پر بیٹھ گئی اور ہم لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ میں چاروں طرف دیکھ کر اُن گھڑیوں کو یاد کرنے لگا جو میں نے یہاں آزادی کے ساتھ کسی کی چشم فسوں ساز کا قاتل اور کسی کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوئے بغیر گزاری تھیں۔ اسی عالم خیال میں میں نے اس چشمہ سے خطاب کر کے کہا کہ اے میرے محبوب چشمہ! ایک زمانہ تھا

میں بیابان محبت یا دمی گرم زمانے کا جبکہ دل عہد وفا ثابتہ دام دلستا نے را۔ غالب

کہ میں تیرے پاس آکر تیری ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھاتا اور تیری تازگی بخش لہروں سے دل بہلاتا تھا۔ لیکن اسے میرے دلنواز چشمے اب مہینوں گزر جاتے ہیں اور مجھ کو ادھر سے گزرنا بھی پڑتا ہے مگر کیا بات ہے کہ تیرے دیدار سے آنکھیں محروم رہتی ہیں۔

میں نے اپنی نظر نیچی کی تو دیکھا کہ شارلٹ کی بہن جین سیڑھیوں پر سے پانی کا گلاس بھر کر لا رہی ہے۔ پھر میں شارلٹ کی طرف جو متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا دل بے اختیار اُس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ اتنے میں جین آگئی اور میرے اُس سے گلاس لینا چاہا مگر جین نے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ پہلے شارلٹ کو پانی لینے دو۔ بچی کے اس محبت بھرے اور سادہ الفاظ نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اُس کو گود میں لے کر خوب پیار کیا اس سے وہ بیچاری ڈر گئی اور روکنے لگی۔ اس کے رونے پر شارلٹ بولی کہ اُسے رہنے دو اور نہ چیخو۔ یہ ایسی ہی رویا کرتی ہے اس فقرہ پر میں کچھ سراسیمہ ہوا پھر شارلٹ اُس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کے پاس لے گئی اور اُس کو تسلی دے کر کہنے لگی کہ کوئی بات نہیں ہے۔ یہ پانی ہے منہ دھو لو۔ جاؤ۔ میں کھڑا اون دونوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور جب میں نے بچی کو اپنے کالوں کو اپنے بھیگے ہاتھوں سے اس خیال میں کہ میری بد صورت ڈاڑھی سے جو گندگی لگ گئی ہے وہ دور ہو جائیگی خوب رگڑ رگڑ کر دھوئے دیکھا گویا زیادہ رگڑنا جیسا کہ شارلٹ کا بھی خیال ہے معمولی دھونے سے بہتر ہے تو ولہلم اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی پتسمہ کی رسم میں نہایت مودبانہ طریقہ پر شریک ہوں۔ اور جب شارلٹ چشمہ کے پاس سے آئی تو میرے جی میں آیا کہ میں اُس کے قدموں پر اُسی طرح گر پڑوں جیسے اگلے زمانہ میں لوگ اپنے کو کسی مشرقی پتسمہ کے قدموں پر ڈال دیتے تھے۔

شام کو میں نے سارا قصہ ایک ایسے آدمی کے سامنے شروع سے آخر تک بیان کیا جو میرے خیال میں صاحبِ دل تھا کیونکہ وہ سمجھدار تھا۔ مگر میں نے بھی کیا غلطی کی! اس کے خیال میں تو شارلٹ نے سخت غلطی کی یعنی بچوں کو سمجھانے بجھانے کے لئے جھوٹ بات کہی نہیں کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس قسم کی باتوں سے سیکڑوں طرح کی غلطیاں اور

وہم پر ستیاں شروع ہو جاتی ہیں جن سے بچوں کو بچانا چاہئے۔ اتفاق سے اُس وقت میں یہ خیال کر کے کہ ابھی ہفتہ بھر پہلے اس شخص کا ہپتسمہ ہوا ہے خاموش ہو گیا تاہم اپنے دعویٰ کی صداقت پر اڑا رہا۔ ہم لوگوں کو بچوں کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہئے جس طرح خدا ہم لوگوں پر رحم و کرم کی نگاہ رکھتا ہے۔ لیکن ذرا لطف تو دیکھو کہ ہم لوگ معصومانہ قریب کاریوں میں انتہا درجہ مسرور و شادماں ہوتے ہیں۔

۸ جولائی

انسان بھی کیا بچوں کی طرح ہے کہ صرف ایک التفات نظر کے لئے اتنی آرزوئیں کرتا ہے! آدمی بھی کیا بچہ ہے! ہم سب لوگ دالہاٹم گئے تھے مگر عورتیں گاڑی میں سوار تھیں۔ کچھ دور کے بعد عورتیں گاڑی سے نکل کر اور پایادہ ہو کر ٹہلنے لگیں۔ ٹہلتے وقت مجھ کو بار بار اشارہ کی خول بصورت آنکھوں میں — میں بیوقوف ہوں اسلئے مجھے معاف کرو! کاش تم ان آنکھوں کو دیکھتے۔ ہاں مختصر! مگر خود میری آنکھوں میں نیند بھری تھی، تو جب عورتیں گاڑی میں دوبارہ سوار ہو گئیں تو میں اور نوجوان سلسٹا اور اندران کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ دونوں نوجوان نہایت خوش و خرم معلوم ہوتے تھے گفتگو کے درمیان میں برابر شارلٹ کی ایک نگاہ لطف کا اُمیدوار رہا مگر اُس کی نظر سوائے مجھ پر اور تمام طرف پڑتی تھی۔ اس حالت میں گویا میں بالکل بت بنا صرف اُس کی ایک نگاہ ناز کے شوق میں خواہ وہ غلط انداز ہی کیوں نہ ہو قربان ہو جانے کے لئے کھڑا تھا۔ میرا دل درپردہ اُس سے سیکڑوں بار رخصت ہو رہا تھا۔ مگر آہ! اسکی نظر کا گوشہ دامن التفات تک پہنچا ہی نہ تھا آخر گاڑی روانہ ہو گئی اور میری نگہ انتظار سے آنسوؤں کے قطرے بے اختیار ٹپک پڑے بہر حال دل کو تسلی دینے کے لئے میں برابر اُس کی گاڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں اسنے کھڑکی کے باہر سر نکالا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ معلوم نہیں کہ آیا اُس نے میرے ہی خاطر سر نکالا تھا؟ مگر میرے دوست۔ خواہ کچھ ہی ہو اُس کی یہ بازنگاہی بھی میرے لئے باعث صد تسکین ہے اس لئے کہ میرا دل کہتا ہے کہ اُس نے مجھ ہی کو دیکھنے کے لئے سر نکالا تھا غایب!

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ میں بھی کیا بچہ ہوں !
۱۰ جولائی

جب کسی مجمع میں لوگ میرے سامنے اُس کا ذکر کرتے ہیں یا اُس کے متعلق مجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ مجھے کیسی معلوم ہوتی ہے تو اُس وقت میری حالت بالکل کسی خطی کی سی ہوتی ہے۔ ”وہ مجھے کیسی معلوم ہوتی ہے“ اس فقرہ سے تو مجھے ازلی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ خیال تو کرو کہ وہ آدمی بھلا کیسا ہو گا جس نے شارلٹ کو دل تو دے دیا ہو مگر اپنی حسیات کو اُس کے خیال سے آزاد رکھے۔ یاد رکھو اس منزل میں دل و دماغ دو علیحدہ چیزیں نہیں۔ ”وہ مجھے کیسی معلوم ہوتی ہے“ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ اوسیان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

۱۱ جولائی

الہیہم بہت بیمار ہیں۔ میں ان کی صحت کے لئے دعا کرتا ہوں اس لئے کہ ان کی ہمدردی کرنے میں شارلٹ بھی میری ہمنوا ہے۔ میں اکثر شارلٹ کو اپنے دوست کے مکان پر دیکھتا ہوں اور آج تو اُس نے مجھ سے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔ یعنی بڑھے م صاحب بہت لالچی اور بخیل ہیں اور اُنھوں نے مدتوں سے اس نیک بخت کو پریشان اور تنگ کر رکھا ہے لیکن انکی تمام حرکتوں کے باوجود وہ کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ کچھ دن پہلے جب ڈاکٹر نے اُس کی صحت کی طرف سے جواب دے دیا تو اُس نے اپنے شوہر کو بلوایا د شارلٹ بھی اُس وقت موجود تھی، اور کہا کہ آپ سے مجھے کچھ ایسی باتیں کہنی ہیں جس سے میرے انتقال کے بعد ممکن ہے کچھ جھگڑا پیدا ہو۔ آج تک میں آپ کے گھر کا حساب کتاب بڑی کفایت شعاری سے چلاتی تھی لیکن مجھے معاف کیجئے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے آپ کو تیس برس تک دھوکا دیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ متا بلانہ زندگی کی ابتدا میں باورچی خانہ اور دوسری خانگی ضرورتوں کے لئے آپ بہت معمولی رقم دیا کرتے تھے لیکن جب ہم لوگوں کا کاروبار بڑھا اور اُس کے ساتھ ساتھ ہمارا مال و اسباب اور ساز و سامان بھی بڑھا تو میں آپ کو اسی تناسب سے ہفتہ وار خرچ میں اضافہ پر راضی نہیں کر سکی۔ مختصر یہ کہ جب آپ کی ضرورتیں بہت ہوتی تھیں

تو آپ چاہتے تھے کہ صرف سات فلورن میں ہفتہ بھر کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں۔ میں آپ سے اتنا خرچ تو بغیر کچھ کہے لے لیتی تھی مگر بعد کو روپیہ کے صندوق میں سے کمی پوری کر لیتی تھی اس واسطے کہ کسی کو خود آپ کی بیوی پر گھر کے بینک سے روپیہ چرانے کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے کچھ نکالا اُس میں سے کچھ ضائع نہیں کیا اور اپنے خدا کے حضور میں بغیر اس اقرار کے جانے پر رونا مندا تھی اگر مجھے اس عورت کا خیال نہ ہوتا جیسے میری ہو سکتے بعد گھر کا سارا بار بڑھکا اور جو آپ کے اس یقین دلانے پر پریشان ہو گئی کہ آپ مجھ کو خرچ دیتے تھے وہ کافی تھا۔

میں شارلٹ سے بہت سے ایسے ناقابل فہم طریقوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا جن سے آدمی خود اپنی آنکھ پر ٹی باندھ کر اپنے کو بالکل اندھا کر لیتا ہے بھلا بتاؤ کہ ایک آدمی کس طرح اور کہاں تک چشم پوشی کرے جب ۳۰ فلورن کی جگہ سات فلورن خرچ کے لئے دے۔ لیکن میں خود ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو بغیر کسی تعجب کے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کے گھر کا خزانہ کسی کمرت کی وجہ سے بھی خالی نہیں ہوتا۔

۱۳ جولائی

نہیں میں فریب خوردہ نہیں ہوں۔ مجھے اُس کی سیاہ اور پر کیف آنکھوں کی جنبش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخلصانہ طور پر میرا خیال رکھتی ہے اور میرا قلب بھی اس کو محسوس کرنے لگا ہے اور خواہ کچھ ہو میرا دل تو یہ کہتا ہے اور کیا تم سے کہ دوں اور تم سے ان لورانی الفاظ کو دہرا دوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس خیال سے خود مجھ کو کتنی لذت ملتی ہے۔ تم چونکہ میری طبیعت کے انداز سے واقف ہو اس لئے تم سے کہتا ہوں کہ جب سے اُس نے مجھ سے محبت کرنی شروع کی ہے میری عزت خود میری آنکھوں میں بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر کیا یہ میری خام خیالی ہے یا واقعیت کا احساس؟ اب تک تو میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو شارلٹ کے دل سے میری محبت چھڑا دے لیکن باوجود اس کے جب وہ البرٹ کا ذکر جو ش اور محبت کے ساتھ کرتی ہے تو اس وقت میں ایک ایسے دیباہ کے مثل معلوم ہوتا ہوں جسکا اعزاز و تہ چمن گیا ہو یا پھر میری حالت اس سپاہی کی سی ہوتی ہے جسکی تلوار ضبط ہو گئی ہو۔

۱۴۔ دو شنگ کا ایک سک

جب کبھی کھانا کھاتے وقت میز کے نیچے میری ٹانگیں اس کی ٹانگوں سے تلقایہ طور پر چھو جاتی ہیں یا میز ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑ جاتا ہے تو میرے دل میں ایک خاص قسم کی سنسناہٹ معلوم ہوتی ہے اور ہوش و حواس بجا نہیں رہتے۔ اس وقت میں گھبراہٹ میں اپنے پاؤں اس طرح گھسیٹ لیتا ہوں جیسے کوئی آگ سے اپنے پاؤں ہٹائے مگر دل بھی چاہتا ہے کہ اُس کے پاؤں سے پاؤں ملتا رہے تو اچھا ہے ہاں اُس کے معصوم اور نادان دل کو کیا معلوم کہ اس کی یہ دوستانہ ادائیں میرے لئے عذاب جان ہو رہی ہیں۔ بعض وقت بات چیت کرتے کرتے جب وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے اور گفتگو کی روانی کو قائم رکھنے کے لئے مجھ سے قریب تر ہو جاتی ہے جس سے اُس کے نازک اور گلاب ایسے جسم کی مہک میری ناک میں پہنچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر بجلی گر گئی ہے اور مجھ کو خاک میں ملا گئی ہے۔ لیکن دہلیم، باوجود ہر قسم کے اعتبار اور یقین کے جو اس کو مجھ پر ہے اگر میں جسارت کر بیٹھوں! تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ مگر نہیں نہیں میرا دل گناہگار نہیں بلکہ کمزور ہے اور کافی کمزور ہے، اور کیا کمزوری گناہ کا ایک درجہ نہیں؟ اُس کی ہستی میرے لئے مقدس ہے بہر حال میرے دل میں جو کچھ بے قراری پیدا ہوتی ہے وہ صرف اُس کے سامنے مگر حالت یہ ہے کہ میں اُسکی قربت میں ان حیات کے اظہار سے بالکل عاجز ہوتا ہوں اس وقت گویا میری یہ کیفیت ہوتی ہے کہ میری روح میرے اعصاب جسمانی کے ہزار سے اُلجھتی ہے وہ پیاؤ پر ایک قسم کا راگ بڑے ہنر اور خوبی کے ساتھ بجاتی ہے۔ اس راگ کی لے بہت سادہ ہے مگر اس کی نازک آنگلیوں میں خدا جانے کون سا اثر ہے کہ اس میں روحانی نغمہ بھر جاتا ہے۔ یہی راگ اس کو پسند بھی ہے اور جب وہ اس کو بجاتی ہے تو میرا دل ایک لمحہ میں گویا تمام کلفتوں اور لاٹشوں سے دھل کر پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں قدیم زمانہ کے ساحر بن نمنوں کا یقین کرنے لگتا ہوں۔ معلوم نہیں اس کے نغمہ میں اس بلا کا سحر کہاں سے آیا اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں خودکشی کے لئے تیار ہوا مگر اس کی ایک راگ سن کر دل کی تمام جلن دور ہو گئی اور پھر میں دوبارہ آزادی سے سانس لینے لگا۔

پیارے ولہلم! خیال تو کرو کہ وہ دنیا جس میں محبوب کا غم اور عشق کا محن نہ ہو کسی بلندہ دنیا ہوگی۔ بھلا سوچو کہ میجک لالٹین میں اگر روشنی نہ ہو تو وہ کیسی تاریک معلوم ہوگی۔ یہ روشنی جو اس تیرہ خاکدان کو منور کئے ہوئے ہے، عشق کی روشنی ہے۔ ہمارا تمہارا کام بس یہی ہے کہ اندر کی آگ روشن کر دیں پھر عمدہ اور چمکدار تصویریں خود بخود دیوار پر ظاہر ہوں گی اور اس حالت میں اگر باز یگر عشق ہم کو صرف ایک چلتا پھرتا سا عکس ہی دکھلا دے تب بھی ہم بچوں کی طرح اُس شاندار نمود حیات کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ آج مجھ سے شارلٹ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں اپنے چند اجاب کے ساتھ مصروف رہا تاہم میں نے اپنا نوکر شارلٹ کے پاس بھیج دیا کہ کم سے کم میں اُس کو دیکھ لوں جس کو شارلٹ نے دیکھا ہے۔ جتنی دیر تک میرا نوکر باہر رہا مجھے بڑی تشویش و پریشانی رہی اور جب آگیا تو پھر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ نوکر ہے تو میں اُس سے لپٹ جاتا اور اُس کو خوب چومتا لوگ کہتے ہیں کہ بونونا کا پتھر اگر دھوپ میں رکھ دیا جائے تو آفتاب کی کرنوں کو جذب کر لیتا ہے اور اندھیرے میں تھوڑی دیر تک کرنوں کے اثر سے جھلکتا ہے۔ بالکل یہی حال میرے نوکر کا اور میرا ہے صرف اس خیال سے کہ شارلٹ کی آنکھیں اس کے چہرہ پر اُس کے گالوں پر اور اُس کے کپڑوں پر پڑی ہیں اُس کی ہر چیز میری نگاہ میں یکایک اتنی محبوب ہو گئی کہ دنیا کی تمام چیزیں مجھ کو اس سے الگ نہیں کر سکتیں۔ اُس کی آمد اور موجودگی سے میں کتنا خوش ہوا! اچھا ولہلم! میری اس حرکت پر ہنسومت۔ آخر تمہیں بتاؤ کہ کیا تم اس چیز کو جو دل کو فرحت بخشی ہے اور مسرور کرتی ہے محض ایک نمود و عیار سے تعبیر کرو گے؟

جب صبح کو میں سو کر اُٹھا تو ہوں اور آفتاب کی نورانی اور عالم افروز کرنوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں تو اس وقت میرے دل کے اندر یہ تمنا بھی بیدار ہوتی ہے کہ آج میں اس سے ضرور ملوں گا۔

لے نے ذوق نگاہ ہے نہ ہنگامہ عشق ۛ اے وائے شہرے کہ درد فتنہ گرے نیست

اور پھر میرے باغ اُمید میں کسی اور بہار کی ضرورت نہیں رہتی گویا تمام تمنائیں سمٹ کر اس ایک محور پر آجاتی ہیں۔

۲۰ جولائی

میں تمہارے اس مشورہ سے اتفاق نہیں کرتا کہ میں سیفر کے ساتھ..... چلا جاؤں۔ میں محکومی بالکل پسند نہیں کرتا اور تم تو جانتے ہو کہ وہ دل کا کتنا ملامٹ ہے اور بُری طبیعت رکھتا ہے تمہارا خیال ہے کہ میری والدہ صاحبہ مجھے کہیں برسرِ کار دیکھنا چاہتی ہیں۔ یقیناً ان میں اس خیال پر بے اختیار ہنس پڑا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں برسرِ کار نہیں ہوں؟ اور کیا میری موجودہ مصروفیت عام کاروبار کی مصروفیت کی سی نہیں ہے؟ ارے بھائی مسور چھیلو تو چھیلنا ہوا اور مٹر کی پھلی چھیلو تو چھیلنا ہوا۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ ایک حماقت سے دوسری حماقت کی طرف دھکیلی جاتی ہے اور خاص کر وہ شخص جو محض دوسروں کی خاطر بغیر اپنی مرضی یا ضرورت کے مال و دولت یا جاہ و منصب یا اسی قسم کے دوسری بے اہل چیزوں کی طرف دوڑتا ہے بڑا ہی بے وقوف اور بے عقل ہے۔

۲۴ جولائی

تم مجھ سے مصوری میں مصروف رہنے کے لئے اصرار کرتے ہو۔ میں تم سے بتا ہی ہوں کہ میں نے اس طرف مصوری میں کچھ کیا ہی نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس طرف جیسا خوش و خرم تھا ویسا شاید ہی کبھی پہلے رہا ہوں گا اور اس سے قبل تو میں مناظر قدرت کی باریکیوں اور سبزہ کی تدرتہ موٹگافیوں سے یک قلم بیگانہ تھا لیکن اب علم کے باوجود میں اُن کے اظہار سے بالکل مجبور ہوں گویا میری گلکاری کی قوت سلب ہو گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز میری نظر کے سامنے حرکت کر رہی ہے۔ اس لئے میں کسی چیز کا خاکہ تک نہیں پیش کر سکتا لیکن اگر میرے ہاتھ میں بجائے قلم کے موم یا مٹی ہوتی تو شاید میں اُس کی تشکیل تخیل کے مطابق بہتر صورت میں کر سکتا۔ اگر دماغ کی یہی کیفیت کچھ دیر تک اور قائم رہی تو میں کم سے کم گندھے ہوئے آٹے ہی سے شغل کروں گا۔

میں نے تین بار شارلٹ کی مومی تصویر بنانے کی کوشش کی مگر بُری طرح ناکام رہا مجھے اس سے اتنی تکلیف پہنچی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں پہلے تمثال گرہی ہے اچھا خاصا شوق رکھتا تھا۔ بہر حال اس کے بعد میں نے اُس کے رخ کی ٹیکٹرنہ مومی تصویر بنائی اور فی الحال اُسی پر قانع ہوں۔

۲۵ جولائی

پیاری شارلٹ! میں ہر چیز کا انتظام کر دوں گا بس تم مجھے سب چیزیں بتاتی جاؤ لیکن ایک بات تو ضرور کرو یعنی خط کو خشک کرنے کے لئے برائے مہربانی اس پر بالون ڈالا کرو اس لئے کہ آج جو جلدی میں میں نے تمہارا خط کھول کر لبوں سے لگایا تو دانت کر کرانے لگا۔

۲۶ جولائی

میں اکثر تہیہ کر لیتا ہوں کہ شارلٹ سے جلد جلد نہ ملا کروں۔ مگر تم جانتے ہو کہ ایسا ارادہ بھلا کتنے دن چل سکتا ہے۔ شوق کی یہ حالت ہے کہ اُس کے پاس روز جاؤں مگر دل پر جبر کر کے کہ میں کل ہرگز نہ جاؤں گا شوق کو ٹال دیتا ہوں لیکن جب کل آتا ہے تو خود بخود میرے دل میں اُس کے دیکھنے کا بے اختیار جذبہ پیدا ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ میں اُس جذبہ پر کچھ غور کروں میں اپنے کو اُس کے آستانہ پر پاتا ہوں۔ یا تو وہ روز شام کو مجھ سے ہتی ہے کہ ”تم تو کل ضرور ہی آؤ گے“ اور پھر تمہیں بتاؤ کہ اس جیلے کو سن کر کون گھڑیٹھا رہیگا یا پھر مجھ سے کوئی کام بتا دیتی ہے جس کی تعمیل کر کے اُس کے پاس جانا ضروری ہو جاتا ہے، یا پھر موسم اتنا اچھا ہوتا ہے کہ میں والہا ٹم ٹپٹے ٹپٹے جاتا ہوں اور پھر وہاں سے اُسکا مکان صرف اچھیل رہ جاتا ہے۔ میں گویا ایک طلسمانہ زندگی بسر کر رہا ہوں اور روز کسی کسی طرح اُس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ میری دادی ایک متناطیسی پہاڑ کی اکثر کہانی کہا کرتی تھیں کہ جب اُس کے نزدیک کوئی جہاز آتا تھا تو اس جہاز کا سارا لوہا نکل نکل کر اس پہاڑ سے بہہ تھا شا جاکر لپٹ جاتا اور پھر جہاز کے غائب ہونے کے بعد وہ لوہا دوبارہ اُس جہاز میں

البرٹ یہاں آیا ہے اس لئے اب میں یہاں سے جاتا ہوں۔ اگر البرٹ دنیا کا بہترین اور شریف ترین انسان ہوتا اور میں ہر لحاظ سے اُس سے کمتر ہوتا تب بھی میں ایسی مکمل ہستی کو ہرگز اُس کے قبضہ میں دیکھنے پر راضی نہ ہوتا۔ قبضہ! خیر یہ تو بہت بڑی چیز ہے۔

البرٹ اس کا منگیتر ہے اور آجکل یہاں موجود ہے۔ وہ اتنا اچھا آدمی ہے کہ اس سے کسی کو بھی شکایت نہیں پیدا ہو سکتی۔ حُسنِ اتفاق سے جب یہ دونوں آپس میں ملے تو میں وہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ جیسا کہ تم جانتے ہو میرے دل پر معلوم نہیں کیا کیا لگدڑی سا اور اس کے باوجود وہ میرا کتنا خیال رکھتا ہے کہ اُس نے میری موجودگی میں کبھی شارلٹ کا بوسہ نہیں لیا۔ خدا اُس کو اس کا اجر دے۔ جس عزت کا برتاؤ وہ شارلٹ کے ساتھ کرتا ہے اس سے تو میرے دل میں اُس کی خاصی محبت ہو گئی ہے۔ اکثر وہ میری طرف محبت آمیز التفات کرتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ التفات بجلائے میرے شارلٹ کی وجہ سے ہے۔ ان معاملات میں عورتیں زیادہ ہوشیار ہوتی ہیں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ وہ دور قیبوں کو آپس میں ہمیشہ دست نہیں رکھ سکتیں اور اگر ایسا کرتی ہیں تو فائدہ بھی اُنھیں کا ہوتا ہے۔ میں البرٹ کی قدر کرتا ہوں اُسکی طبیعت کا سکون میرے مزاج کی شورش سے جس کو میں کبھی نہیں چھپا سکتا، بالکل متضاد ہے۔ اس میں محبت کے جذبات کافی ہیں، اس کے علاوہ شارلٹ کی ہستی پر قابو پا کر اس کو اس نعمت غیر مترقبہ کا احساس بھی ہے۔ اس میں کسی قسم کی کج اخلاقی نہیں اور یہی کج اخلاقی ہے جس کو میں ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھکو عقلمند سمجھتا ہے اور میرے اور شارلٹ کے درمیان جو کچھ مراسم ہیں یا مجھے اس سے جو کچھ دلچسپی ہے اُس سے البرٹ کے جذبہٴ لغت میں اور بھی کامرانی ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آیا وہ شارلٹ کو رقابت کے جوش میں کبھی جھپٹتا بھی ہے حالانکہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کبھی اس قسم کے خیالات و حرکات سے پاک نہ ہوتا۔

خواہ کچھ ہی ہو اب شارلٹ سے میرے تفریحی مراسم ختم ہو گئے۔ خواہ تم اسے حماقت کہو یا میرا دلہانہ انداز یا تم اس کو کسی نام سے بھی پکارو جو ہے ظاہر ہے۔ البرٹ کی آمد سے قبل

مجھے ہر اس بات کا علم ہو گیا تھا جو مجھ کو اب ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں شارلٹ کے سامنے دعویٰ محبت نہیں کر سکتا تھا اور نہ میں نے کیا یعنی اُس حسن و دنواز سے بجائے لطف اٹھانے کے اُس کو صرف دیکھنا، شیوہ عشق قرار دیا اور اب تو میں بالکل احمق کے مانند ہر چیز اچنبھے سے اس طرح دیکھتا ہوں جیسے کسی نے میری محبوبہ کو مجھ سے چھین کر جدا کر دیا ہو۔ میری حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ ہر اُس شخص سے نفرت کرنے لگا ہوں جو مجھے صرف اس لئے توکل و تقاضات کی تعلیم دیتا ہے کہ اب کوئی چارہ کار باقی نہیں ہیں ایسی حیلہ بازی سے الگ ہی رہوں تو اچھا ہے اور اسی لئے میں اکثر پاس کے جنگلوں میں گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں اور واپس آ کر جب کبھی شارلٹ کے پاس البرٹ کو باغ میں بیٹھا دیکھتا ہوں تو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس وقت میرا حال کسی خطبی کا سا ہوتا ہے جو سیکڑوں حماقتیں کرتا ہے اور آج تو شارلٹ نے مجھ سے کہہ بھی دیا کہ ”تم خدا کے واسطے کل رات کا سا بڑاؤ نہ کرنا اس واسطے کہ تمہارے ایسے تند اور خطرناک رویہ سے مجھے دھڑکا ہونے لگتا ہے“ اچھا تم سے ایک بات کہتا ہوں یعنی جب البرٹ اُس کے پاس موجود ہوتا ہے تو میں باہر رہتا ہوں لیکن جب میں اُس کو تنہا پاتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں۔

۸ اگست

میرے پیارے دلہن! یقین مانو کہ پھلی بار جب میں نے اُن لوگوں کے متعلق سخت ابرو اُٹھائی کیا تھا جو مجھے قسمت پر قانع رہنے کا مشورہ دیتے ہیں، تو میرا دے سخن ہرگز تمہاری طرف نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے اس قسم کے خیالات کا اظہار ناممکن ہے۔ بہر حال تمہارا خیال بالکل صحیح ہے مگر مجھے صرف ایک بات سے اختلاف ہے یعنی دنیا میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دو چیزوں میں انتخاب کا موقع ملے۔ بلئی ستواں اور چوڑی ناکوں کے درمیان جتنی قسم کی ناک ہوتی ہے بس سمجھو کہ اتنے ہی قسم کے آرا اور افعال بھی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری دلیل ضرور قابل قبول ہے۔ مگر میں تمہاری حیستیاں سے بچنے کی فکر میں ہوں۔ تمہارا یہی خیال ہے ناکہ یا میں شارلٹ کو حامل کرنے کی اُمید رکھتا ہوں یا پھر کوئی اُمید

نہیں۔ پہلے طریقہ کے مطابق مجھے اپنے کام میں کوشش کرنا چاہئے تا آنکہ مطلب حاصل نہ ہو جائے اور دوسرے طریقہ کے مطابق مجھے ایک انسان کی طرح زندگی بسر کرنا چاہئے اور اس بد بخت جذبہ سے کسی طرح دامن چھڑانا چاہئے جو مجھے بالکل کمزور کر کے برباد کر دے گا میرے عزیز دوست اتمہاری یہ رائے بالکل صحیح ہے اور خوب ہے لیکن کیا تم ایسے بد نصیب شخص کو جو اپنی زندگی کے دن کسی گراں نشیں علالت میں کاٹ رہا ہو یہ مشورہ دو گے کہ وہ بجائے گھل گھل کر مرنے کے ایک خنجر سے اپنا کام تمام کر لے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بیماری نے اُس مریض کی تمام طاقت اتنی سلب کر لی ہے کہ مرض سے رہائی حاصل کرنے کی ہمت بھی اُس میں نہیں رہی ہے؟ میرے خیال میں تم مجھے اسی قسم سے مشابہ کوئی جواب دو گے کہ ”وہ کون ایسا شخص ہے جو اپنے بازو کٹوانے پر تیار نہ ہو جب کہ اسکو یہ معلوم ہو کہ دیر کرنے میں ساری زندگی کا خطرہ ہے“ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ آیا میرا یہ خیال صحیح بھی ہے، بہتر تو یہی ہے کہ اس قسم کی تشبیہوں کو الگ کر دیا جائے۔

بہت ہو چکا وہ اہل۔ بعض وقت تو میں سوچتا ہوں کہ ان تمام جھگڑوں سے چمٹ کر آرزوے شوق سے بالکل نا آشنا ہو جاؤں۔ کاش مجھے کوئی ایسی جگہ معلوم ہوتی جہاں جا کر میں اطمینان سے رہتا۔

آسی روز شام کو

میرا روزنامہ مجھ جس کو میں نے کئی روز سے چھوڑ رکھا ہے آج میرے سامنے ہے میں مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میں نے کس طرح اپنے کو جان بوجھ کر بند میں جکڑ رکھا ہے۔ اپنی حالت کا صاف اندازہ معلوم ہونے کے باوجود افسوس! میں نے بالکل بچوں کی سی کثرت کی اور اس وقت بھی نتائج صاف نظر آرہے ہیں لیکن میرے دل میں اب بھی احتیاط کا ذرا خیال نہیں!

۱۰ اگست

اگر میں احمق نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی کے دن یہاں نہایت آرام و مسرت سے گزارتا

ایک قابل آدمی کو آرام سے زندگی گزارنے کے لئے یہاں کے تمام حالات موافق ہیں حالانکہ حالاً کی موافقت ایسی کم ہوتی ہے اور مجھے اس کا احساس بھی ہے مگر مسرت اور خوشی صرف دل سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حسین اور خوبصورت خاندان میں داخل ہونا اور باپ کا مجھ سے اپنے بچہ کی طرح اور بچوں کا مجھ سے اپنے باپ کی طرح محبت کرنا اور پھر شارلٹ اور البرٹ کی محبت گاہ بننا کتنا مسرت انگیز ہے۔ اور البرٹ کتنا شریف آدمی ہے کہ وہ میری مسرتوں میں کسی قسم کی کج طبعی سے رخنہ نہیں پیدا کرتا اور نہایت محبت سے میری آؤ بھگت کرتا ہے اور شارلٹ کے بعد سب سے زیادہ مجھ ہی کو چاہتا ہے۔ دلہلم! شارلٹ کے متعلق البرٹ سے سیر کے وقت جو باتیں ہوتی ہیں انہیں سن کر تم خوش ہو گے مگر تمہیں ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو گا کہ میرے اور اُس کے تعلقات سے بڑھ کر دنیا میں شاید ہی کوئی بے تکی چیز ہو لیکن اس کے باوجود اکثر اس کے خیال سے میرے آنسو ٹپکتے ہیں۔

البرٹ اکثر مجھ سے شارلٹ کی ماں کے حالات بیان کرتا ہے کہ کس طرح مرتے وقت اُس نے مکان اور بچوں کو شارلٹ کے سپرد کیا اور خود شارلٹ کو البرٹ کو سونپا اُس کا بیان ہے کہ اس وقت سے شارلٹ میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی ہے اور وہ بچوں کی نگرانی میں اپنا وقت ماں کی طرح صرف کرتی ہے۔ گھر کے اُن تمام جھگڑوں کے باوجود شارلٹ کی طبیعت میں وہی خوشی اور مسرت کا احساس باقی ہے۔ میں البرٹ کے ساتھ ٹہلتا ہوں اور راستہ میں پھول توڑ کر ایک عمدہ ہار بنا کر کسی چشمہ کی نذر کر دیتا ہوں اور پھر اُس کی آہستہ روانی کو دیکھتا ہوں۔ شاید میں تم سے یہ کہنا بھول گیا کہ اب البرٹ ہمیں رہے گا اس لئے کہ اس کو ایک سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ تنخواہ معقول ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ درباں میں اُس کا کافی رسوخ بھی ہے۔ میں نے ایسا با اوقات اور منتظم آدمی کم دیکھا ہو گا۔

۱۲ اگست

یشک البرٹ دنیا میں بہترین شخص ہے۔ کل میرا اسکے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے جی میں آیا کہ میں کچھ دن ان پہاڑوں میں بسر کروں جہاں سے میں تمہیں یہ خط

لکھ رہا ہوں اس خیال سے میں البرٹ سے رخصت ہونے گیا۔ جب میں اُس کے کمرہ میں داخل ہو کر ٹہل رہا تھا تو میری آنکھ اُس کے پستول پر پڑی۔ میں نے البرٹ سے کہا کہ میں سفر پر جا رہا ہوں کیا آپ اپنا پستول کچھ دنوں کے لئے عنایت فرمائیں گے؟ وہ فوراً لاپنی ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ پستول خالی ہے صرف نمائش کے طور پر یہاں لٹکا ہوا ہے۔ بھریجئے اور لے جائیے۔“

میں نے ایک پستول اُتارا۔

اس پر وہ بول بول اٹھا کہ اپنی انتہائی احتیاط کی وجہ سے ایک دفعہ میں سخت آفت میں مبتلا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس وقت سے میں ان چیزوں سے بالکل سہوکا نہیں رکھتا۔ یہ سن کر مجھے اس کا قصہ سننے کا شوق پیدا ہوا اور پھر اُس نے اپنا قصہ اس طرح شروع کیا کہ ”قریب تین ماہ کے ہوتے ہیں کہ میں ایک گالوں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس وقت میرے پاس ایک پستول خالی تھا اور میں بے خرخشہ سو رہا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو جب بارش ہو رہی تھی میرے دل میں میٹھے میٹھے نہ جانے کیوں خیال آیا کہ اگر اس مکان پر کوئی حملہ کر دے تو کیا ہوگا۔ پستول کی ضرورت اُس وقت ضرور پڑے گی۔ اور پھر یہ ہوگا یہ ہوگا۔ اس قسم کے خیالات دماغ کو مکان کے حملہ کے متعلق بڑی دیر تک پریشان کرتے رہے۔ اتنے میں میں نے اپنے نوکر کو پستول صاف کرنے اور بھرنے کو دیا۔ نوکر پستول لے کر صاف و اف کر کے مکان کی خانہ سے چھلیں کرنے لگا اور اس کو پستول سے ڈرا لے لگا کہ اتنے میں نہ جانے کیسے پستول چھوٹ گیا۔ گھوڑا چڑھا ہوا تھا اور گولی اس طرح جھونکی کہ اس خادمہ کے داہنے ہاتھ کو توڑ کر نکلی اور اُس کے انگوٹھے کو زخمی کر گئی۔ اس خادمہ کی آہ وزاری اور ڈاکڑ کا سارا خرچ مجھ ہی کو برداشت کرنا پڑا۔ بس اس وقت سے میں اپنا تمام ہتھیار خالی رکھتا ہوں۔ لیکن میرے دوست! آخر اس احتیاط سے فائدہ۔ قدرت کے تمام احتمالات اور امکانی خطرات سے بچنا نامکن ہے بہر حال۔“ وہ ہلہم تم جانتے ہو کہ میں لوگوں کو بس اُسی وقت تک برداشت کر سکتا ہوں جب تک کہ وہ ”بہر حال“ تک نہیں پہنچتے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر عالمگیر قانون میں

مستثنیات کا جزو ضروری ہے۔ لیکن وہ اتنا راست گو ہے کہ جب اس کو خیال گذرتا ہے کہ وہ کوئی ایسا لفظ جلدی میں غلط سلط کہہ گیا ہے جس سے عام حالت کا اندازہ ہوتا ہو تو وہ فوراً اُس کو مشروط اور معتدل کر دیتا ہے یا اُس کے اثر کو کم کرنے کے لئے کوئی دوسرا لفظ کہہ دیتا ہے یہاں تک کہ آخر میں اُس کی باتوں سے کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا۔ اس موقع پر البرٹ اپنے مضمون میں اتنا منہمک تھا کہ میں اُس کی بعض باتوں کو بالکل سن نہ سکا اور بالآخر میں بھی اپنے خیالات کی رو میں گم ہو گیا۔ بعد ازاں جھٹکے کے ساتھ میں نے پستول کی نلی اپنی داہنی آنکھ کے اوپر ماتھے پر رکھی۔ البرٹ یہ دیکھ کر چیخ پڑا۔ اور پستول کی طرف بڑھ کر کہنے لگا کہ ارے یہ کیا کرتے ہیں۔

میں نے جواب دیا ”بھرا نہیں ہے“ اُس نے پھر بیتا بانہ لہجہ میں کہا کہ ”اگر بھرا نہیں ہے تو پھر ایسا کرنے سے فائدہ ہو کوئی پاگل ہی ہو گا جو اپنے کو پستول سے مارے گا۔ مجھے تو پستول کے خیال سے تکلیف ہوتی ہے میں۔“ کسی فعل پر محض خارجی حیثیت سے رائے زنی کرنا اور اُس کو اچھا اور بُرا یا عاقل اور مجنونانہ ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہے؟ آخر اس کے کیا معنی؟ کیا آپ نے کبھی لوگوں کے افعال کے پوشیدہ منشاء کا بھی جائزہ لیا ہے؟ کیا آپ ان اسباب و علل کو سمجھتے ہیں یا سمجھا سکتے ہیں جن سے افعال لازمی طور پر سرزد ہوتے ہیں؟ اگر آپ سمجھ سکتے ہیں تو یقیناً آپ اپنے فیصلہ میں عقل و بردباری سے کام لیں گے۔“

البرٹ۔ ”لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ چند افعال خواہ ان کا منشاء کچھ بھی ہو مجرمانہ ہوتے ہیں۔“

میں نے اس کے اس قول کو کندھوں کی جھر جھری کے ساتھ مان لیا۔ میں۔ ”مگر میرے عزیز دوست! اس میں بھی چند مستثنیات ہوتی ہیں۔ چوری جرم ہے لیکن کیا وہ شخص سزا کا یا رجم کا مستوجب ہے جو اپنے بال بچوں کو فاقہ کشی اور غربت کی مصیبت سے بچانے کے لئے چوری کرتا ہے؟ کسی کا دل گردہ ہے جو کسی ایسے شوہر کو سنگسار کر کے کیلئے

پہلا پتھر پھینکے جو جائز غم و غصہ کی حالت میں اپنی بے وفا بیوی اور اس کے دغا باز عشق کو نذر اجل کر چکا ہو، یا پھر اُس کمن لڑکی کو سنگسار کرے جو اپنے کمزور دل کے ہاتھوں عشق کی بے قرار یوں سے مغلوب ہو کر دفعتاً اپنی عصمت کو گلدستہ طاق نسیاں کر چکی ہو ہمارے قوانین کتنے بھی بے رحم اور ناترس سہی مگر اس قسم کے معاملات میں اُن کو بھی رحم آجاتا ہے اور مجرم اپنی سزا سے بچ جاتا ہے۔

البرٹ۔ ”مگر یہ بالکل دوسری چیز ہے اس لئے کہ غم و غصہ کی شدید حالت میں انسان غور و فکر کی تمام حالتوں سے گزر جاتا ہے اور اُس کی کیفیت ایک مخمور مدہوش اور لالی عقل کی سی ہوتی ہے۔“

میں۔ ”دسکر اکر، تو اچھا آپ لوگ جن کو درست عقل و ثبات ہوش کا دعویٰ ہے شاید اس کو جنوں، نشہ یا اسراف سے تعبیر کریں۔ آپ کے ایسے نیک لوگ خاموش اور متین رہتے ہیں۔ آپ مخموروں سے نفرت کرتے ہیں اور مسرفوں سے دور رہتے ہیں اور ان کے قریب سے دنیا داروں کی طرح صاف گزر جاتے ہیں اور منافقوں کی طرح خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ میں خود کئی بار مدہوش ہو چکا ہوں اور میرے جذبات اکثر مسرفانہ حد تک پہنچ چکے ہیں مگر میں ان کے اقرار سے بالکل متاسف نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے اعمال سے کچھ نہ کچھ تجربہ حاصل کیا ہے۔ دنیا میں جتنی عظیم الشان ہستیاں گزری ہیں اور جنہوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کئے ہیں وہ ہمیشہ مدہوشانہ اور مجنونانہ القاب سے یاد کی گئیں ہیں۔ اور اسی طرح بچ کی زندگی میں بھی کسی شخص نے کوئی بڑا کام بغیر جنون اور نشہ کے خطاب سے ملقب ہو کر نہیں کیا۔ پھر اوعقل کے تلوے تم پر آف ہے۔“

البرٹ۔ ”یہ گویا آپ کے مسرفانہ مزاج کا دوسرا رخ ہے۔ آپ ہمیشہ ایک واقعہ میں مبالغہ کارنگ بھرتے ہیں اور اُسی میں آپ ہمیشہ غلطی کرتے ہیں اس لئے کہ ہم لوگ ذکر کر رہے تھے خود کشی کا اور آپ نے ذکر چیٹر دیا بڑے بڑے کارناموں کا حالانکہ خود کشی

کو سوائے ایک کمزوری کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ مرزا بڑا آسان ہے مگر زندگی کی تمام صعوبتوں اور تکلیفوں کا کمال جو اندری سے مقابلہ کرنا بڑا مشکل ہے۔“

میں اس گفتگو کو ختم کرنے ہی والا تھا اسلئے کہ مجھے اس قسم کی پوچھ اور لچر گفتگو سے زیادہ شاید ہی کوئی چیز تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے درآنحالیکہ میں اس وقت اپنے دل کی گہرائی اور خلوص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس قسم کے مباحثہ سے اکثر میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اسلئے میں نے اپنے کو سنبھال کر ذرا جوش سے جواب دیا کہ آپ اس کو کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں لیکن آپ بھی اپنے کو ذرا صورت اور سراب کی گرفت سے بچائیے دیکھئے ایک قوم جب مدتوں تک کسی ظالم کی سفاکیوں کا شکار رہ کر ابھرتی ہے اور اپنی گردن سے طوق غلامی کو نکال کر پھینک دیتی ہے تو کیا آپ اس کو بھی کمزوری کہیں گے؟ ایک شخص کے گھر میں آگ لگی ہے لگ کی لپٹ اور شعلوں کی لپک سے اپنے مکان کو بچانے کے لئے اس میں طاقت کا اتنا جوش آ جاتا ہے کہ وہ ہماری سے ہماری بوجھ بڑی آسانی سے اٹھا لیتا ہے حالانکہ یہی بوجھ اس حالت سے قبل لائق التفات بھی نہ تھا اسی طرح ایک اور آدمی کی مثال لیجئے جو اپنی توہین کے انفعالی غصہ سے بہادری کے وہ جوہر دکھاتا ہے کہ ایک نہیں بلکہ چھ چھ آدمیوں کو بھگا دیتا ہے تو کیا یہ لوگ بھی کمزور ہیں؟ میرے نیک دوست اگر مقاومت ہی طاقت کا نام ہے تو پھر اعلیٰ درجہ کی مقاومت کمزوری کیسے ہو جائے گی؟“

اس پرابلٹ نے نظر جما کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ آپ نے جو مثالیں پیش کی ہیں معاف کیجئے ان کا نفس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔“

میں۔ ”ممكن ہے آپ کا خیال صحیح ہو اس لئے کہ اکثر لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میری تمثیل کا طریقہ ایک حد تک بے معنی ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ اس مسئلہ کی تحقیق کا رخ دوسری طرف پھیر دیں اور اس طرح دریافت کریں کہ اس شخص کی دماغی حالت کیسی ہوتی ہے جو اپنے کو زندگی کے آلام سے جو اکثر بڑے خوش آئند

معلوم ہوتے ہیں، نجات دلانے کا تہیہ کر چکا ہو۔ اس لئے کہ ہم لوگ اس مسئلہ پر کافی طور سے منطقیانہ بحث نہیں کر سکتے۔

”اچھا سنئے۔ انسانی فطرت کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک درجہ تک یہ حد مسرت، درد اور الم کو برداشت کر سکتی ہے لیکن جہاں اس حد سے تجاوز کیا گیا فطرت فوراً جواب دے دیتی ہے لہذا سوال یہ نہیں ہے کہ ایک شخص آیا مضبوط ہے یا کمزور بلکہ یہ کہ وہ اپنی حد کے اندر تمام تکالیف خاطر خواہ برداشت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور ان تکالیف کی دو صورتیں ہوتی ہیں جسمانی اور روحانی اس لئے میرے خیال میں اس شخص کو بزدل کہنا جو خود کشی کرتا ہے اتنا ہی بے معنی اور بیہودہ ہو گا جتنا اُس شخص کو بزدل کہنا جو کسی مہلک بخار میں مبتلا ہو کر جان سے گذر جاتا ہے۔“

البرٹ۔ ”یوں ممکن ہے صحیح ہو مگر یہ بات جیکبے میں تو بالکل خلاف عقل معلوم ہوتی ہے۔“

میں۔ ”نہیں یہ بات بالکل خلاف عقل نہیں ہے جیسی کہ آپ کو معلوم ہوتی ہے۔ اتنا تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب بدن پر کسی بیماری کا اتنا شدید حملہ ہوتا ہے کہ طاقت گھٹنے لگتی ہے اور فطرت اس کو کسی صورت سے بھی درست نہیں کر سکتی تو ہم لوگ اس بیماری کو مہلک کہتے ہیں اچھا ذرا اس مسئلہ کو آپ دماغ سے تشبیہ دیجئے۔ اگر آپ کسی آدمی کا اس کی فطری مگر تنہا حالت میں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ خیالات کا اثر کس طرح ہوتا ہے اور تاثرات کس طور پر اپنا قدم جاتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جوش اور جذبہ اُس کی قوت فکریہ کو کس طرح مختل کر کے اُس کو بربادی اور تباہی کی شہ دیتا ہے۔ ایک صحیح الدماغ آدمی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کی دماغی کیفیت کا حال معلوم کرے اور مشورہ دینا تو اور لا حاصل ہے۔ وہ اپنی عاقلانہ باتوں کو ایسے سمجھا بھی نہیں سکتا ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی تندرست آدمی کسی بیمار کے پاس رہ کر اپنی طاقت اُس کو نہیں دے سکتا۔“

البرٹ نے اس گفتگو کو بالکل عامیانہ رنگ میں لیا۔ میں نے بہر حال اُس سے ایک لڑکی کا قصہ بیان کیا جس نے حال میں ڈوب کر جان دی تھی وہ ایک نیک لڑکی تھی جو خانہ داری کے کاموں میں محنت کرتے کرتے بڑھی تھی۔ وہ دنیا کے تمام عیش و عشرت سے بیگانہ تھی البتہ

وہ ہر اقرار کو اپنے حسبِ حیثیت عمدہ سے عمدہ کیڑے پہن کر اپنے دوست اجاب کے ساتھ سیر کو نکلتی یا کبھی کسی تقریب کے موقعہ پر کسی رقص میں شرکت کرتی اور اپنے فرصت کے اوقات اپنے ہمسایوں میں گانوں کے لوگوں کی اچھائیوں اور بُرائیوں پر باتیں کر کے گزار دیتی یہ تمام چیزیں معمولی تھیں مگر ان سے اُس کی کافی دلچسپی رہتی۔ آخر کار اس کی آتشِ فطرت کو چند نامعلوم اور مبہم خواہشوں نے تیل چھڑک کر بھڑک دیا۔ لوگوں کی عاشقانہ خوشامدوں نے مندرجہ بالا چیزوں سے اُس کی دلچسپی میں رفتہ رفتہ اضحلال پیدا کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک نوجوان سے ملی اور اس سے ایک ناقابلِ اظہار جذبہ کے ماتحت محبت کرنے لگی اور آج وہ اسکی تمام آرزوں اور اُمیدوں کا مرکز ہے۔ محبت کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے تمام ماحول سے یکسلم بیگانہ ہو گئی اور اب اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور اُسی کے کانوں سے سنتی ہے اور ہر وقت اُسی کی طلب میں رہتی ہے۔ وہی اُس کے خیالات کا طباہِ ماویٰ ہے مگر اسکا ذہن اب تکنا تو اس اور کمزور کر دینے والے خود نمائی کے سست خیالات سے پاک ہے اور اُسکی محبت کا قدم استقامت کے ساتھ برابر اپنے محبوب کی طرف بڑھ رہا ہے اُس کے دماغ میں بس اُسی کی ہورہنے کا سودا ہے اور اُس کے دائمی وصال میں وہ اپنی تمام مسرتوں اور خوشیوں کی جستجو کرتی ہے۔ اس عاشق کے وعدوں سے اُسکے باغِ اُمید میں بہار آ جاتی ہے اور اُس کی محبت اور معافقہ کی گر مجوشی سے اُس کی روح بیخود ہو جاتی ہے۔ اُسوقت وہ گویا اپنی آنے والی مگر پر فریب خوشیوں کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھتی ہے اور اس کیفیت کے اثر سے اُس کے جذبات میں اتنا دھبہ کا تلاطم برپا ہوتا ہے۔ اس بیخودی اور بیقراری کی حالت میں وہ اپنے اپنے دونوں ہاتھ اپنے محبوب کی گردن میں ڈالنے کے لئے بڑھاتی ہے مگر اس کا عاشق اُس سے دفعتاً کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس پریشانی اور از خود رفتگی کے عالم میں اُس کی حالت بالکل اُس شخص کے مانند ہوتی ہے جو کسی اونچی چٹان کے کنارے تاریک فضا میں جبکہ اُمید و تسلی کی ذرا سی جھلک بھی بالکل مفقود ہو، مگر کرنے کے لئے تیار کھڑا ہو۔ افسوس! آج اُس نوجوان نے اُس سے علاحدگی اختیار کی جواب تک اُس کی زندگی کی سانس تھما، آج اتنی بڑی اور وسیع

دنیا اُس کی آنکھوں کے سامنے بے نور ہو گئی اور ایسے نفوس سے خالی ہو گئی جو اُس کے لئے باعثِ دلچسپی ہوتے۔ افسوس! اسکا کوئی پرسان حال نہیں۔ آج دنیا اس سے بھاگتی ہے۔ روح کے اس بیتاب اور بے قرار کردینے والے دردِ محن سے مغلوب ہو کر وہ اپنے کپہاڑ کی چوٹی سے نیچے دریا کی گہرائی میں گر ادیتی ہے تاکہ موت کی آغوش میں اُسکی تکلیفوں کا خاتمہ ہو جائے۔ البرٹ صاحب ذرا سنئے اور غور کیجئے۔ یہی حال ایک کانہیں بلکہ سیکڑوں ہزاروں کا ہے۔ ذرا مجھ سے کہئے کہ کیا یہ واقعہ جسمانی ناتوانی سے تعلق نہیں رکھتا؟ ظلم تو یہ ہے کہ اس بھول بھلیاں سے نکلنے کے لئے فطرت نے بھی کوئی راستہ نہیں بتایا اور جب اس غریب کی تمام قوتیں جواب دے چکیں تو اُس کے لئے سوائے موت کے اور چارہ ہی کیا تھا؟

”میرے خیال میں تو اُس شخص پر قف ہے جو اس واقعہ کو سکون اور خاموشی سے سن کر کہے کہ کتنی بے گتہ! توڑکی تھی جو مر گئی۔ ذرا اور ٹھہر جاتی کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کے اثرات کم ہو جاتے اور اُس کی نا اُمیدی کی سختی کچھ نرم پڑ جاتی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کو کوئی دوسرا عاشق مل جاتا جس سے اُس کی خاطر خواہ تسلی ہو جاتی۔ اسی طرح ایک بیمار کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ کتنا بیوقوف تھا جو مر گیا۔ ذرا ٹھہر جاتا کہ تھوڑی سی طاقت آجاتی اور خون کی گرمی ذرا کم ہو جاتی تب وہ بچ جاتا اور اچھا ہو جاتا۔“

البرٹ اس موازنہ کی حقانیت سے برابر اختلاف کرتا رہا اور اُس نے دوسرے اعتراضات بھی پیش کئے۔ منجملہ ان کے کہنے لگا کہ آپ نے ایک محصوم لڑکی کا جو واقعہ مثال میں پیش کیا ہے وہ یہاں بالکل درست نہیں۔

لیکن وہاں تمہیں بتاؤ کہ ایک تجربہ کار اور عقلمند آدمی ان دلائل سے کس طرح جان بچا سکتا ہے۔ مگر یہ البرٹ کے سمجھ میں آتا ہی نہ تھا۔ پھر میں نے اُس سے کہا کہ ”میرے دوست آدمی آخر آدمی ہے اور اُس کے عقل کی پرواز خواہ کتنی بلند کیوں نہ ہو لیکن جب جنون کا جوش ہوتا ہے تو ساری عقل دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور آدمی اپنے کو اس وقت فطرت کے تنگ دائرہ میں محدود پاتا ہے۔ اُس وقت کیا اچھا ہوتا ہے۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ ہم لوگ اسکے متعلق

پھر گفتگو کریں گے۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنے ٹوپڑی اٹھائی اور چلا آیا حالانکہ میرا دل اس وقت اتر میں ڈوبا ہوا تھا۔
ہم لوگ بغیر ایک دوسرے کو قائل کئے ہوئے جدا ہو گئے افسوس! اس دنیا میں ایک آدمی
دوسرے آدمی کو کتنا کم سمجھتا ہے۔

۱۵ اگست

اس میں کوئی کلام نہیں کہ دنیا میں عشق سے زیادہ ضروری اور کوئی چیز نہیں۔ میں دیکھتا
ہوں کہ شارلٹ میری جدائی بغیر آہ سرد کے گوارا نہیں کرتی اور بچوں کی بھی یہی خواہش ہے
کہ میں اُن سے کل پھر ملوں۔ آج سہ پہر کو میں شارلٹ کا پیا نو درست کرے گیا تھا مگر نہ کرسکا
اس لئے کہ بچے اس پر مصر ہو گئے کہ میں اُن کو کوئی قصہ سنائوں اور شارلٹ نے بھی آخر ان
بچوں کی خاطر سے قصہ ہی کی منظوری دیدی۔ میں نے ان بچوں کے ساتھ چائے پی اور
وہ مجھ سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے شارلٹ سے۔ مجھے جو بہترین قصہ یاد تھا وہ میں نے سنایا
جس میں ایک رانی کے کئی بونے نو کرتھے۔ اس قسم کے قصوں سے میں گویا اپنی مشق بڑھاتا
ہوں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے قصے کس طرح ان بچوں کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں
کوئی قصہ فوراً ایجاد کر کے کہتا ہوں اور آگے چل کر اس کا سراجمول جاتا ہوں تو بچے مجھے فوراً
یاد دلاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں قصہ کو شروع سے آخر تک اُسی غیر دلچسپ طریقہ
سے سناتا ہوں۔ اس سے تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مصنف اپنے مضامین بدلتا ہے خواہ
وہ بدلی ہوئی چیز شاعرانہ حیثیت سے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو تو وہ اپنی تصنیف کو نقصان
پہنچاتا ہے۔ پہلا اثر تو فوراً ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ ہم لوگوں کی دماغی ساخت کچھ اس طرح
کی واقع ہوئی ہے کہ ہم بے سروپا باتوں کا فوراً یقین کر لیتے ہیں اور ایک دفعہ جب حافظہ پر
اُن کا نقش قائم ہو جاتا ہے تو پھر اُسکے مٹانے والے کو بڑی آفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۱۸ اگست

کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ ہماری مسرتوں اور خوشیوں کا جو منبع ہے وہی ہماری

نامرادیوں اور مہیبیتوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ جو جذبہ مناظر قدرت کی طرف سے میرے دل میں محبت پیدا کر کے مجھ کو مسرت اور شادمانی سے بیتخود کر دیتا اور سشت کی تمام نعمتوں کو میرے سامنے پیش کرتا تھا اُس نے آج ایک ناقابل برداشت درد و محن کی صورت اختیار کر لی ہے گویا وہ ایک بھوت ہے جو برابر میرے سر پر سوار ہے اور مجھ کو پریشان کرتا ہے۔ گزشتہ ایام میں جب میں ان چٹانوں سے دریا اُس پار سامنے کے پہاڑوں اور سبزہ زاروں اور پھولوں سے بھری ہوئی وادیوں کو دیکھتا اور بزم قدرت میں کلیوں کو کیستے اور پھولوں کو پینتے دیکھتا (پہاڑیاں تو سرسے پانوں تک سبز مخملی لباس میں ملبوس تھیں) یا وادیوں کے پرنسپ اور خمدار راستوں کی سیر کرتا جن پر خوشنما درخت سایہ کٹے کھڑے رہتے تھے اور ترنم ریز نرگل کے درمیان آہستہ بہنے والی ندی کا لطف اٹھاتا جس پر شام کی ٹھنڈی ہوا سے اُڑتے ہوئے خوبصورت بادلوں کا عکس پڑتا یا جب میں اپنے آس پاس کی جھاڑیوں میں چڑیلوں کے نغے سنتا اور شام کے وقت سورج کی سنہری روشنی میں ہزاروں لاکھوں پردار کپڑوں کو رقص میں مصروف دیکھتا جس کی ڈوبنے والی کرنوں سے جھنجھکنے والے بھنورے اپنی گھاسوں اور پتیوں کی آماجگاہ سے بیدار ہوتے تو میری توجہ اُس موسیقی کی طرف ہو جاتی جو زمین کے ارد گرد دیھے سہل میں جاری رہتی اور پھر میں اُس خشک چٹان کو دیکھتا جس میں سے جھاڑیوں کو غذا پہنچتی۔ لیکن نیچے اتر کر جو میدان تھا اُس کی قوت کا سارا دار و مدار بلوی زمین پر تھا۔ ہاں تو جب میں ان مناظر کو دیکھتا تو میرے قلب میں ایک جوش کی کیفیت اور ایک نور کی چمک پیدا ہوتی جس سے بزم قدرت کا ذرہ ذرہ منور ہے۔ ان جذبات کی روانی سے میں اپنے کو ایک ایسی بلند سطح پر پاتا جہاں سے خدا کی شان کبریائی اور اس ناپید کنار عالم کی خوشنمائی اور بوقلمونی کا تماشا میری روحانی آنکھوں کو صاف نظر آتا۔ اس وقت بڑے بڑے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں میرے گرد احاطہ کرتیں، بڑے بڑے غار میرے قدموں کے لئے راستہ بناتے اور پرشور آبشار میرے سامنے سر کے بل غلطاں اور پھیلاں نظر آتے۔ موجیں مارنے والے بڑے بڑے دریا میدانوں میں بہتے اور ان کے شور سے دشت و جبل گونج اٹھتے۔ زمین

کی گہرائی میں مجھے سیکڑوں ہزاروں متحرک قوتوں کا احساس ہوتا جو ہر ساعت ہر لمحہ بے شمار تعداد میں بڑھتی جاتیں۔ سطح زمین پر آسمان کے نیچے جانداروں کی لاکھوں کروڑوں قسمیں حرکت کرتیں گویا میرے چاروں طرف ہر چیز بے شمار صورتوں کے ساتھ زندہ نظر آتی مگر افسوس! آدمی کتنا بیوقوف ہے کہ اپنی حفاظت کی خاطر اپنے چھوٹے چھوٹے مکالوں میں گھس جاتا ہے اور اپنی اس پناہ سے بزمِ عدمِ خود اس عالمِ بی نظیر حکومت کرتا ہے۔ اُس کے تنگ خیال میں ہر چیز کتنی تنگ نظر آتی ہے! لیکن ناقابلِ گداز پہاڑوں سے، لُت و دق صحراؤں سے جواب تک انسانی قدم کے نقوش سے بالکل پاک ہیں اور سمندروں کے نامعلوم کناروں سے، اس خدائے الایزال کی تسبیح و تحلیل ہر وقت بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس دنیائے ہست و بود کا ہر ذرہ جو اس کے حکم سے کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آیا ہے اسی کی بارگاہِ ازلی کا فیض رسیدہ ہے چڑیوں کی پرواز دیکھ کر کتنی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے کہ کاش! میں اس بحرِ بیکراں کے کنارے پہنچ جاتا اور اس بارگاہِ نامتناہیہ سے مجھے بھی نشاطِ زندگی کا ایک چھلکتا ہوا جام عطا ہوتا اور میری روح کی قوتیں گو محدود سہی مگر حقوڑی ہی دیر کے لئے اس خالق بے نیاز میں جا کر گم ہو جاتیں جو اپنی ذات سے ہر چیز کو مکمل کرنے والا ہے۔

میرے عزیز دوست! اُن اوقات کا خفیف سا تصور بھی میرے لئے باعثِ تشکیب ہے اور اس ناقابلِ اظہار جوش کی یاد اور اس کا بیان میری روح کو بلند مگر میری موجودہ پریشانیوں کو اور کاہشوں کو دونا کر دیتا ہے۔

بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے سے سارے حجابات اُٹھ گئے اور زندگی کا دائمی منظر نظر آنے کے بجائے تیر کا گڈھا منہ پھیلانے ہوئے اپنے بھیا تک انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ جب اس عالمِ آبِ دگل کی ہر چیز فانی نظر آتی ہے اور زمانہ طوفان کی طرح ہر چیز بہائے لئے جاتا ہے اور ہمارے سفینہ زندگی کا یہ حالی ہے کہ یا تو سیلاب میں فنا ہو جائے یا کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تو اس صورت میں کیا ہم کسی چیز کی ہستی کو یقین کے ساتھ تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہر ساعت و ہر لمحہ

آپ کی اور آپ کے گرد و پیش کی تمام چیزوں کی تاک میں ہے اور یہی نہیں بلکہ ہر لمحہ آپ خود بھی اپنی تباہی کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ آپ سیر و تقریر کے لئے جاتے ہیں مگر اس سیر و تقریر میں ہزاروں معصوم کیڑوں کا خون ہو جاتا ہے۔ صرف آپ کی ایک جنبش قدم سے چوہنٹ کی کتنی محنت اکارت جاتی ہے اور اس کی آراستہ و پیراستہ دنیا بد نظمی اور بد ترتیبی کا شکار بن جاتی ہے۔ نہیں نہیں! مگر دنیا کی مصیبتیں اور آفتیں ہیں ختم نہیں ہوتیں۔ بلکہ خوفناک طوفان آتے ہیں جو صدمہ آبادیوں کو چشم زدن میں بہا لے جاتے ہیں۔ دہشت ناک اور مہیب زلزلے آتے ہیں جو شہروں کو دم بھر میں نکل جاتے ہیں لیکن میرا دل ان آفتوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ اس خیال سے کہ تباہی و بربادی کی قوت خود کا رخاۃ قدرت میں پوشیدہ ہے۔ قدرت کی تمام پیدا کردہ چیزوں میں گویا خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ اس لئے اس دنیا میں جس کو ہوا، مٹی اور متحرک قوتوں نے محدود کر رکھا ہے میں اپنے متفکر اور محزون دل کے ساتھ آوارہ و پریشان پھرتا ہوں۔ یہ عالم میرے لئے گویا ایک دیو عظیم کی حیثیت رکھتا ہے جو ہمیشہ خود اپنے بچوں کو نگل جاتا ہو۔

۲۱ اگست

صبح کو جب میں اپنی خستہ خوابی سے بیدار ہوتا ہوں تو اپنے دو لون، ہاتھوں کو اُس کی طرف بڑھاتا ہوں مگر افسوس وہ کہاں! رات کو نیند کی حالت میں جب کسی معصومانہ خواب میں میں اُس کو اپنے ساتھ کسی میدان میں دیکھتا ہوں یا اُس کے دستہائے نازنین پر بوسہ دیتا ہوں تو میں اُس کو اپنی چارپائی پر تلاش کرتا ہوں مگر افسوس وہ کہاں! نیند کے قبل دماغ کی پریشان مگر خوش آئند حالت میں جیسے اُس کو اپنے پاس سمجھ کر چھونا چاہتا ہوں اور نہیں پاتا ہوں تو اُس وقت قلب حزن کے طعنے کے بے اختیار آنکھوں کی راہ سے پھسل کر بہتے ہیں، اور تمام لذتوں اور اراموں سے بیگانگی

۱۵ ہر کہ آمد بجاں نقش خرابی واروہ و در خوابات مہر سید کہ ہشیار کجاست - حافظ

کے عالم میں میں نگہ پانی آئندہ محرومیوں اور نادرادیوں پر اشک حسرت بہاتا ہوں۔
۲۶ اگست

والہلم اُف کتنی بڑی بد قسمتی ہے کہ میری روح عمل سر ہو کر اب کاہلی اور سستی پر قانع ہو گئی ہے۔ میں نہ تو بالکل بیکار رہ سکتا ہوں اور نہ میرا کسی کام میں جی لگتا ہے۔ خیال میں وہ رعنائی بھی نہیں رہی اور اب حسن فطرت کے مشاہدہ کے لئے وہ آنکھ کہاں سے لڑائی کتاب میں کاٹے کھاتی ہیں۔ ایک دفعہ بھی جب ہم اپنے آپ کو بے قابو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر ہمارا پتہ لگنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اکثر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ کاش میں کوئی معمولی مزدور ہی کیوں نہ ہوا اور اگر مزدور ہوتا تو صبح کی بیداری کے بعد میرے دل میں یہی ایک آرزو ہوتی یعنی دن بھر کی محنت اور مزدوری کا خیال رہتا جب میں البرٹ کو اس کے بے شمار کاغذات و مسودات میں محو پاتا ہوں تو اکثر اس پر رشک کرتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو آج کتنا خوش و خرم ہوتا۔ اس خیال سے متاثر ہو کر میں نے بارہا تم کو اور وزیر حکومت کو لکھنے کا ارادہ کیا کہ مجھ کو سفارتخانہ میں کوئی جگہ مل جائے اور تم بھی سمجھتے ہو گے کہ مجھے جگہ مل جاتی اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ مل جاتی۔ وزیر مدلتوں سے مجھ پر نہایت مہربان ہے اور متعدد بار مجھ سے نوکری کیلئے کہہ چکا ہے۔ ملازمت کیا ہے بس ایک گھنٹہ کا کام ہے۔ لو اس پر اس گھوڑے کا قصہ یاد آیا جو آزادی سے تنگ آکر خود لگام لگوانے اور زین کسوانے پر راضی ہوا تھا اور سواری کی نوبت آخر کار یہاں تک پہنچی کہ جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ کیا میری انقلاب و تغیر کی یہ خواہش نتیجہ نہیں ہے اس بغیراری کا جو زندگی کے ہر شعبہ میں میرا پیچھا کرتی آئی ہے اور کرے گی؟

۲۸ اگست

اگر میری بیماریاں علاج پذیر ہیں تو یقیناً ان کا علاج میں ہو سکتا ہے۔ آج میری سالگرہ ہے اور علی الصبح البرٹ نے ایک پولندہ بطور تحفہ بھیجا۔ کھولنے پر اس میں

سے ایک سرخ فیتہ نکلا جس کو شارلٹ اُس روز پہنے ہوئے تھی جب میں اُس سے پہلے پہل ملا تھا اور اُس فیتہ کو میں نے اُس سے کئی بار مانگا بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہومر ٹولف وٹسٹائن کی دو جلدیں بھی تھیں اس کتاب کی مجھ کو اکثر ضرورت بھی رہتی ہے اس لئے کہ سیر و تقریر کے وقت اس نثر والے نسخے لے جانا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ لوگ میرا کتنا خیال کرتے ہیں اور دوستی اور محبت کے ذرا ذرا سے جزئیہ پر کیسی نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا تحفہ امیروں اور کبیروں کے بے بہا مگر حقیر تحفوں سے کہیں بہتر ہے۔ میں نے اُس فیتہ کو عالم شوق میں سیکڑوں بار بوسہ دیا اور ہر بار میری مشام جان اُس زمانہ کی ناقابلِ محو مسرتوں کی یاد سے معطر ہو جاتی ہے پس دلہلہم ہماری زندگی یہی ہے۔ میں اپنی قسمت کی شکایت بھی نہیں کرتا اور کروں بھی تو کیا کروں۔ گلہاے زندگی کی بہا رہیں چند روزہ ہے۔ کتنے خوبصورت اور خوشنما پھول ہیں جو مرجھا جاتے ہیں اور اپنا اثر تک نہیں چھوڑتے اور کتنے ہیں جو پھلے تک نہیں پا اور کتنے ہیں جو پھلتے ہیں اور اُن کے پھل پکے ہیں! اس بے ثباتی کے باوجود دیر حال پھول ہوتے ہیں اور میرے عزیز دوست ابھر کر یہ زمانہ کی نیرنگی نہیں ہے کہ جو کلیاں بڑھتی ہیں اور چٹک کر پھول ہوتی ہیں ہم اُن کی خوشبوؤں سے لطف اٹھائے بغیر اُن کو مرجھا جانے دیتے ہیں! اچھا الوداع! موسم گرما کتنا شاندار ہے۔ شارلٹ کے باغ میں اکثر میں پیڑوں پر پڑھتا ہوں اور اونچی اونچی ڈالوں کے نشقٹالوں کو ہلا کر گراتا ہوں۔ وہ نیچے کھڑی ہوتی ہے اور جیسے جیسے وہ گرتے جاتے ہیں انھیں ہاتھ بڑھا کر لیتی جاتی ہے۔

۳۰ اگست

میری بستی بھی کتنی بد قسمت واقع ہوئی ہے مگر میں اپنے کو دھوکا کیوں دل رہا خزان بیہمانہ بے معنی اور بے پایاں جذبات کا کیا حشر ہو گا؟ میں اگر کچھ کہنا سننا چاہتا ہوں تو بس شارلٹ سے۔ میرے تخیل میں سوائے اُس کے اور کسی کی جگہ نہیں اور گرد و پیش کی تمام چیزیں اگر اُن کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے تو میرے لئے محض بے کار ہیں۔ میرا

تخیل میرے لئے ایک خواب نما حالت پیدا کر دیتا ہے اور اسی حالت میں میں کئی گھنٹے اُسکی یاد میں اتنی خوشی سے گزارتا ہوں کہ اکثر تھک کر اپنا خیال اُسکی طرف سے ہٹالیتا ہوں وہلم معلوم نہیں کہ میرا خانہ خراب دل مجھ سے کیا کیا نہ کر دائے۔ جب میں شارلٹ کے ساتھ کئی گھنٹہ بسر کرتا ہوں تو اُس کے حسین چہرہ، بے پناہ غمزہ اور پاک خیالات میں گم ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ میرا دماغ رفتہ رفتہ اپنے انتہائی بیجانی کیفیت میں ہوتا ہے۔ پھر اُسوقت میری بھارت میں دھندلا پن مسامعہ میں برہمی اور سانس میں تکلیف پیدا ہو جاتی ہے گویا مجھے کسی قاتل کا سامنا کرنا پڑا ہے پھر میرا دھڑکتا ہوا دل میرے مضطرب اور درد سیدہ احساس سے تسکین کا طالب ہوتا ہے۔ بسا اوقات میں اپنی ہستی سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہوں۔ اُن لمحات میں اگر کوئی شخص میرے بے قرار دل کو تسلی نہیں دیتا ہے اور شارلٹ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں اُس کے خوبصورت ہاتھ کو تسکین اضطرار کی خاطر اپنے آنسوؤں سے تر کروں تو میں اُس سے علیحدہ ہو کر دیوانہ وار جنگل کی طرف چلا جاتا ہوں اور وہاں اکثر کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہوں یا کسی دشوار گزار جھاڑی میں جانے کی کوشش کرتا ہوں جہاں کانٹے میری خوب تو اضع کرتے ہیں اُسوقت البتہ میرے دل کی جلن میں کچھ کمی ضرور ہوتی ہے۔ وہاں اکثر پیاس کی شدت یا خشکی نے زمین پر لیٹ جاتا ہوں یا رات کو جب چاند اپنی ہلکی ہلکی کرنیں ڈالتا ہے تو میں سنان جنگل میں کسی پیڑ کے سمارے بیٹھ کر اپنے خستہ اور تھکے ہوئے اعضا کو آرام دیتا ہوں اور جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتا ہوں تو صبح تک..... کچھ دیر کے لئے سو رہتا ہوں۔ وہلم میرے رنج و مصیبت و اسباب پریشانی کے سامنے کسی زاہد عزلت گزین کا حجرہ اُس کا بورہ اور اُس کی کانٹے دار پیٹی کوئی حقیقت نہیں دکھتی۔ بلکہ یہ چیزیں عیش و آرام کا سامان معلوم ہوتی ہیں۔ اچھا الوداع شایدا ان کلفتوں سے میری نجات کا ذریعہ موت ہی کے اعوش میں ہے

۳ ستمبر

یہاں سے میرا جانا بہت ضروری ہے۔ وہلم تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے

اضطراب کی وجہ دریافت کرنے میں کافی تکلیف اٹھائی۔ گزشتہ دو ہفتے سے میرے دل میں برابر یہ خیال رہا کہ اب اس شوخ ستم پرور کا کبھی نام نہ لوں اور رشتہ وفا کو توڑ کر علحدہ ہو جاؤں۔ مگر..... فی الحال وہ شہر گئی ہوئی ہے اور ایک دوست کے یہاں مقیم ہے اور پھر البرٹ..... ہاں میرا جانا یہاں سے بہت ضروری ہے

۱۰ ستمبر

وہلکم۔ کیسی خوفناک رات ہے مگر میرا دل اب ہر افتاد کے لئے تیار ہے۔ ہاں اب میں اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ کاش تم یہاں ہوتے اور ہم دونوں گلے مل کر اتنا روتے کہ آنسوؤں کا دریا بہنے لگتا اور اُن آبلہ ہاں دل کو نشتر غم سے چھیر تے جنکی کھٹک سے دل ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔ ہاں افسوس! میں یہاں تنہا بیٹھا ہوا سکیلا لے رہا ہوں اور دل کے پریشان ریزوں کو تسکین خاطر کیلئے جمع کر رہا ہوں۔ صبح کا انتظار ہے اور طلوع آفتاب کے وقت گھوڑے دروازے پر آ جائیں گے۔ وہ کتنی میٹھی نیند سو رہی ہے! اُس کو کیا خبر کہ آج میں نے اسکو بس آخری بار دیکھا ہے میں اب بالکل آزاد ہوں دو گھنٹہ کی ملاقات میں میں نے اپنا جی اتنا نوکڑا کر لیا کہ اپنا راز دل اُس پر ظاہر نہیں کیا مگر وہلکم میری اس کی باتیں بھی کیسی دل فریب تھیں!

البرٹ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کے کھانے کے بعد شارلٹ کے پاس باغ میں آئے گا۔ میں شام کو شاہ بلوط کے اونچے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا غروب آفتاب کا سماں دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی کیا منظر تھا جب سورج سامنے کی خوشنما وادی اور خاموش چشمہ کے نیچے آخری بار چلا گیا۔ اس جگہ کی سیر اکثر میں شارلٹ کے ساتھ کر چکا ہوں اور غروب آفتاب کا منظر بھی دیکھ چکا ہوں اور آج بھی اسی جگہ ٹھل رہا تھا جو مجھے بہت عزیز تھی شارلٹ سے ملنے کے قبل میں وہاں بیشتر ایک اندرونی جذبہ سے متاثر ہو کر جا چکا ہوں اور ہم دونوں کو اپنی ابتدائی ملاقات میں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ہم دونوں اسی جگہ کو پسند کرتے ہیں جو واقعی ایسی دل فریب اور پر فضا ہے کہ کسی مصور کے تخیل میں کافی

رنگینی پیدا کر سکتی ہے۔ شاہ بلوط کے نیچے سے سامنے کا منظر بڑی دور تک صاف معلوم ہوتا ہے لیکن میں یہ سب باتیں اپنے پچھلے خطوں میں لکھ چکا ہوں اور کتنا رے کے جیڑ کے درختوں کا حال بھی بتا چکا ہوں۔ ان درختوں کے درمیان جو راستہ جاتا ہے وہ دور جا کر اتنا تنگ اور تاریک ہو جاتا ہے کہ آخر میں وہاں ایک قدرتی گوشہ بن گیا ہے جس میں ایک خاموش حجرہ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ دن کے وقت آفتاب کی روشنی میں جب پہلی بار میں وہاں گیا تھا تو مجھ پر اضمحلال اور دلگیری کی جو عجیب حالت طاری ہوئی تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میرے دل میں اُس وقت نہ جانے کیوں خیال آیا کہ یہ جگہ ایک نہ ایک دن میرے لئے یا مسرت و انبساط یا پھر رنج و محن کا باعث ہوگی۔

آدھ گھنٹہ تک میں اسی اُدھیڑ بن میں پڑا رہا کہ آیا میں اُس طرف جاؤں یا واپس چلاؤں کہ اتنے میں میں نے ان لوگوں کو چبوترے کی طرف آتے دیکھا اور اُن کو لینے کے لئے تیزی سے آگے بڑھا اور جیسے ہی میں نے شارلٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ دیا ویسے ہی میرے بدل پر رشتہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جوں ہی ہم لوگ چبوترے کے اوپر پہنچے چاند سبزہ پوش پہاڑی کے پیچھے سے نکلا بہت سی باتوں کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور بات چیت کرتے کرتے بغیر کسی ارادہ کے ہم لوگ درختوں کے اُسی تاریک گوشہ کے قریب پہنچ گئے اور شارلٹ اُس میں داخل ہوئی اور جا کر بیٹھ گئی۔ البرٹ اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ مگر میرے دل کی وحشت نے مجھے زیادہ دیر تک وہاں بیٹھنے نہ دیا۔ میں اُٹھا اور اُٹھ کر اُس کے سامنے آیا اور پھر ادھر ادھر ٹہل کر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میری وحشت اور یقیناً رسی ایسی تھی کہ گویا رنگوں میں بجائے خون کے پارہ دوڑ رہا تھا۔ چاند اب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور اپنی رو بہلی کر لوں سے میدان اور اُس چہرے کے جنگل کو منور کر رہا تھا۔ شارلٹ بار بار چاند کی طرف دیکھتی اور ہم لوگوں سے اُسکی نورانی خوبیوں کو بیان کرتی۔ یقیناً منظر بڑا دل فریب اور پر فضا تھا۔ ہمارے گوشہ کی تاریکی نے جمع اصداد کی وجہ سے منظر کو اور بھی چمکا دیا۔ ہم لوگ خاموشی سے چاندنی کا لطف اُٹھا ہی رہے تھے کہ شارلٹ نے بوں گفتگو شروع کی کہ ”جب میں چاندنی رات میں سیر کرنے

بھکتی ہوں تو میرے تمام گزشتہ احباب یاد آتے ہیں پھر اُس وقت میرے دل میں موت اور عاقبت کا خیال آنے لگتا ہے، بعد ازاں اس کی آواز زیادہ پر اثر اور زور دار ہو گئی اور کہنے لگی کہ ”ورنہ یقیناً ہم لوگ دوبارہ زندہ ہونگے مگر کیا اس دوبارہ زندگی میں ہم اپنے پرانے دوستوں سے مل سکیں گے اور اُن کو پہچان بھی سکیں گے؟ آخر تمہارا کیا خیال ہے کچھ تم بھی کہو؟ یہ سن کر میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا کہ ”شارٹ اینڈ شک ہم لوگ ضرور ملیں گے۔ اس عالم میں اور دوسرے عالم میں بھی ضرور ملیں گے۔ بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ لہلہا معلوم نہیں اُس نے یہ سوال مجھ سے ایسے وقت کیوں کیا جب میرے دل میں یہاں سے جانے کا خیال آ رہا تھا۔

شارٹ نے پھر یوں بات شروع کی کہ ”کیا وہ لوگ جو دار الفنا کو چھوڑ کر دارالقرار کی طرف کوچ کر چکے ہیں جانتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس حال میں ہیں اور کیا ان کو اس کی خبر ہے کہ ہم لوگ کس وقت خوش اور دلشاد رہتے ہیں اور کب ان دشتگانِ خاک کو محبت سے یاد کرتے ہیں؟ خدام کی پھیلتی ہوئی تابکی میں میری ماں کی روح اکثر آتی ہے اور جب میں اپنے بچوں اور چھوٹی بہنوں کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہوں جیسے کہ یہ بچے میری ماں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو میں ہنسنے لگتی ہوں۔ اُن کو یہاں کی کھانے کی چیزیں اور کپڑے دیکھ کر کہتی ہوں کہ اے کاش! میری ماں ملا اعلیٰ سے دیکھتی کہ میں کس طرح اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی دیکھ بھال کرنے کے ان وعدوں کو پورا کر رہی ہوں جو میں نے اُسکے بستر مرگ کے پاس کھڑے ہو کر کیا تھا۔ ان خیالات میں ڈوب کر اکثر میں بے اختیار ہونٹ چبچباتی ہوں اور کہتی ہوں کہ میری اچھی ماں! اگر میں بچوں کی خبر گیری تیری طرح نہیں کر سکتی تو محاف کر۔ لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے اس میں کوتاہی نہیں کرتی اُن کو میں عمدہ عمدہ کپڑے پہناتی ہوں لکھنا لکھلاتی ہوں اور اس سے بڑھ اُن کو بیکار کرتی ہوں اور تعلیم دلواتی ہوں۔ میری بیماری اماں! اگر تم کو آج بیماری محبت آمیز اور خاموشی زندگی کا حال معلوم ہو تو بے شک تم اُس خدا سے رحیم کی نعمتوں کا شکر نہایت عاجزی سے ادا کر دو گی جس کی بارگاہ سے تم اپنے آخری لمحاتِ حیات میں صرف ہماری مسرت اور خوشی کے لئے

گر ہوا کہ دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ اس طرح شارلٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مگر دماغ کو
ہے جو اس کے شیریں اور پراثر الفاظ کو دہرا سکے اور کون ہے جو اس کی روح کے پاک جذبات کو سرد و سرد
الفاظ کا جامہ پہنا سکے!!

البرٹ نے اتنے میں درمیان سے یوں بات کرنی شروع کی ”میری پیاری شارلٹ! تم پر
ان باتوں کا بڑا اثر پڑتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہاری روح اس قسم کے خیالات میں بڑے
جوش کے ساتھ ڈوب جاتی ہے مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں۔“

اس پر شارلٹ نے بھی بات کاٹ کر کہا ”البرٹ! شاید تم ان شاموں کو ابھی بھولے نہیں
ہو گے جب ہم تینوں ابا جان کی عدم موجودگی میں اس چھوٹی گول میز کے کنارے بیٹھے تھے
اور اُس وقت بچے کھاپنی کر سوچکے ہوتے تھے۔ تمہارے پاس اکثر کوئی اچھی کتاب ہوتی مگر تم اس کو
پڑھتے۔ تھے اس لئے کہ اُس شریف محنتی اور خوبصورت عورت کی باتیں تمام چیزوں سے بدرجہا بہتر
معاوم ہوتیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کتنی راتیں روتے روتے اس دعائیں نگہاری ہیں کہ
خدا یا مجھے بھی اُسی کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ یہ سن کر میرے دل میں برداشت
کی مطلق تاب نہ رہی اور میں اُٹھ کر اس کے قدموں پر گر پڑا اور اُنہارویا کہ اُس کے پانوں تر ہو گئے
اور پھر بیچ کر کہا کہ شارلٹ! اس وقت تم پر خدا کی رحمت کا اور تمہاری والدہ مرحومہ دونوں کا
سایہ ہے۔“

شارلٹ۔ (میری بیٹی پر اپنے ہاتھوں کو رکھ کر مگر تم تو شاید اس سے واقف تھے اور وہ
تمہارے جاننے کے بیشک لائق تھی۔“ افسوس! میں اسکی زبان سے اپنی ایسی تعریف سن کر بیہوش
کیوں نہ ہو گیا کیونکہ میں نے اپنی تعریف اُس کی زبان سے کبھی سنی ہی نہیں تھی۔

شارلٹ۔ ”ان باتوں کے باوجود ابھی وہ بہار جوانی سے اچھی طرح پھول چنے نہ پانی تھی
کہ دفعتاً باغ زندگی سے چھ ماہ کا ایک چھوٹا بچہ چھوڑ کر کوچ کر گئی۔ اُسکی بیماری بھی ایسی طویل
نہ تھی لیکن اس کی روح میں سکون اور استقلال پیدا ہو گیا تھا۔ ہاں اگر کبھی ملول ہوتی تو صرف
بچوں کے خیال سے اور خاص کر میری چھوٹی بہن کے خیال سے۔ جب اسکا وقت قریب آیا تو اُس

نے تمام بچوں کو اپنے پاس بلوایا۔ میں سب کو لے گئی۔ چھوٹے بچے تو یہ بھی نہ سمجھتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ بڑے بچے البتہ رنج سے روتے اور جان کھوتے تھے۔ جب ہم سب اُس کے بستر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تو اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں کو اٹھا کر ہم لوگوں کی سلامتی کے لئے دعا کی اور پھر سب کو باری باری پیار کر کے واپس کر دیا اور پھر مجھ سے کہنے لگی کہ دیکھو تمہیں اب ان سب کی ماں ہو، میں نے وعدہ کے خیال سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس پر وہ بولی کہ دیکھو تم ہم سے وعدہ تو بہت بڑا کر رہی ہو یعنی ماں جیسی محبت اور حفاظت کا بار اپنے سر لے رہی ہو میں نے تم کو اکثر بچوں کی خاطر ابدیدہ ہوتے دیکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم میں ماں ایسے دل کی نزاکت موجود ہے لیکن میں جب جانوں کہ تم اپنے بھائیوں اور بہنوں کی اسی طرح ہمیشہ خاطر کرتی رہو اور بیوی کی طرح اپنے باپ کی مطیع اور فرمانبردار بنی رہو۔ اب سارے خاندان کا لے لے کے تمہیں سہارا ہو، اس کے بعد اُس نے میرے باپ کو پوچھا جو اُس کے بستر مرگ کی تاب نہ لا کر غم سے مدھمال دوسرے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر البتہ اُٹھ کر اُس کمرے میں موجود تھے اُس نے کسی کے ہاتھوں کی آہٹ سن کر پوچھا تھا کہ کون آ رہا ہے اور تم سے کہا بھی تھا کہ دیکھو کون ہے۔ اُس نے بڑے اطمینان خاطر کے ساتھ ہم دونوں کو دیکھا تھا اور اُس کی نظروں میں گویا دعا کے یہ الفاظ پائے جاتے تھے کہ خدا کرے تم دونوں آپس میں مل جل کر مہنسی خوشی کی زندگی بسر کرو۔ اس پر البتہ نے اُس سے گلے مل کر اُس کو بوسہ دیا اور کہنے لگا ”بیشک ہم دونوں خوش ہیں اور انشاء اللہ اسی طرح خوش خوش زندگی گزاریں گے“ البتہ عام طور پر نہایت متین رہتا ہے مگر اس موقع پر اپنی پریشانی خاطر کو نہ روک سکا اور میری حالت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ میرے اضطراب کا اظہار تو لفظوں کی دینا سے بہت دور واقع ہوا ہے۔

پھر شارلٹ نے مجھ کو یوں مخاطب کیا ”درتھم! ایسی مبارک ہستی کے اُٹھ جانے سے ہم لوگوں کو جو قلق ہوا اُس کا اظہار ناممکن ہے۔ خدایا! کیا یہ دنیا اسی لئے بنائی گئی ہے کہ ہم اپنی محبوب ترین چیزوں سے جدا کر دیئے جائیں۔ اُس کی جدائی کا صدمہ بچوں سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ اس کی موت کے دنوں بعد تک بچے برابر اُس کی یاد میں یہی کہہ کہہ کر روتے اور

سسکتے تھے کہ بے کالے ملکوں والے میری پیاری اماں کو اٹھالے گئے۔
 یہ کہہ کر شارلٹ کھڑی ہو گئی اور میں بھی چونک پڑا مگر بیٹھا رہا اور اُسکا ہاتھ تھامے رہا۔ شارلٹ
 نے کہا کہ اب دیر ہو رہی ہے چلنا چاہئے۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں سے کھینچنا چاہا مگر میں
 اُسکا ہاتھ بدستور تھامے رہا اور کہا کہ ”شارلٹ! ہم دونوں ضرور ملیں گے اور ہر ممکن انقلاب و
 تغیر کے باوجود یقیناً ایک دوسرے کو پہچان لیں گے اچھا اب میں جا رہا ہوں اور اپنی مرضی سے
 جا رہا ہوں اور کیا یہ بھی کہوں کہ ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں لیکن اپنے الفاظ کو شاید پورا کر کے نہ دکھا
 سکوں۔ اچھا شارلٹ الوداع۔ البرٹ الوداع۔ ہم لوگ پھر ملیں گے۔ شارلٹ نے مسکرا کر جواب
 دیا ”اچھا کل ملیں گے“۔ کل۔ اُن یہ لفظ کیسا جانتا ہے۔ جب اُس نے میرے ہاتھ میں سے اپنا
 ہاتھ کھینچا تو اُسے کیا معلوم تھا کہ میرے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ دونوں چیر کے دھڑتوں
 والے راستے چلے گئے اور میں چاندنی رات میں کھڑا ہو کر اُن لوگوں کو برابر دیکھتا رہا۔ پھر میں
 بے اختیار زمین پر گر پڑا اور خوب رویا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُٹھا اور پھر دوڑ کر اُسی چبوترے
 پر گیا۔ دیکھا تو شارلٹ نیبو کے درختوں کے نیچے پہنچ چکی تھی اور اُسکا سفید لباس باغ کے دروازے
 کے پاس آخری بار نظر سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کی طرف بڑھایا مگر وہ
 کہاں!

باب دوم

ہمارا کتبہ ہم لوگ کل یہاں پہنچے۔ سفیر ہمارے اور چند دنوں تک شاید باہر بالکل نہ نکلے۔ اگر وہ فدا کم بد مزاج اور کم تر شہرہ و تاؤ ممکن ہے اُس سے بچھ جاتی۔ اب مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ قدرت نے شاید مجھے کسی سخت امتحان کے لئے چن لیا ہے۔ اسے دل بھٹ کر اس لئے کہ لا اہالی اور آزادہ رو آدمی ہر افتاد کو برداشت کر جاتا ہے۔ ایک آزاد دل، اس قلم سے ایسے الفاظ نکلنے پڑ سکتا تھا ہیں۔ کاش میں ذرا سا اور آزاد دل رکھتا تو دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش و خرم آدمی شاید ہی کوئی اور ہوتا لیکن کیا میں اس حالت میں اپنی استعداد اور قوت سے نا اُمید ہو جاؤں جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے نہایت کم قابلیت کے لوگ اپنی قابلیت کی نمائش طرے اطمینان خاطر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسے میرے کارسازہ میرے پاس جو کچھ ہے سب تیرا ہی عطیہ ہے پھر تو نے میری بہت سی موجودہ نعمتوں کو کم کر کے کیوں نہ ان کے بدلے میرا دل اطمینان اور اعتماد سے بھر دیا۔

ذرا صبر کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا میرے دوست بیشک تم ٹھیک کہتے ہو جب سے میں نے لوگوں سے برابر ملنا جلنا شروع کیا ہے اور ان کے اشتغال کو دیکھتا ہوں تب سے میں بہت مطمئن ہو گیا ہوں اس واسطے کہ ہم لوگوں کی ساخت فطرت نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے برابر اپنا موازنہ کرتے رہتے ہیں اور ہماری خوشیوں اور مصیبتوں کا دار و مدار زیادہ تر گرد و پیش کے حالات اور اشتغال پر ہوتا ہے اسلئے تنہائی سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں۔ تنہائی میں ہمارا خیال جو بہ صورت پر واکر کیلئے تیار رہتا ہے، ہم کے پروں پر اترتا ہے اور ایسی مہینوں کی تصویر پیش کرتا ہے جن کے سامنے خود ہماری ہستی بالکل حقیر اور دست نظر آتی ہے اور اس عالم میں ہر چیز اپنی اصلیت سے بہت بڑی اور خود ہم سے بہت ارفع اور اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔ دماغ کا یہ فعل بالکل قدرتی ہے اسلئے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بار بار عیاں کرتے ہیں اور ختم تخیل سے دوسروں میں ان اوصاف کو دیکھتے ہیں جو خود ہم میں نہیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں میں اپنی تمام خوبیاں بھی دیکھتے ہیں اور اسی وسیلے سے ہم کو ایک شاد و خوش باش اور مکمل انسان کا تصور ہوتا ہے مگر کیا انسان ہے؟ یہ انسان صرف ہمارے تخیل میں ہوتا ہے لیکن جب باوجود کمزوریوں اور نامزادیوں کے ہم محنت سے کام

کرتے ہیں اور محنت کو برابر جاری رکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ گو ہم کو اکثر کشتی کا رخ بدلنا پڑتا ہے مگر تب بھی ہم اُن لوگوں سے اچھے رہتے ہیں جنکو ہوا اور جوار بھائے کی مدد ملتی رہتی ہے اور سچ پوچھو تو اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم دوسروں کے قدم بقدم چل کر دوڑ میں اُن سے بازی لے جائیں۔

۲۶ نومبر

میری حالت یہاں زیادہ خوشگوار ہے اور کام میں مشغول رہنے سے بڑا فائدہ معلوم ہوتا ہے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان کے اشتغال معلوم کرنے سے مختلف قسم کی دلچسپی ہو گئی ہے میں نے کانٹسٹس سے ملاقات پیدا کر لی ہے اور روز بروز میری نظریں اُن کی عزت بڑھتی جاتی ہے وہ صاحب فہم و بصیرت ہیں گوانکی نظر اوروں کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے مگر وہ اپنے طور طریقہ میں بالکل سردہری نہیں برتتے بلکہ گوانکے ملتے ملتے محبت کرتے اور اُن میں جوش اور سرگرمی پیدا کرتے ہیں۔ ایک موقع پر جب میں اُن کے پاس ایک کام کیلئے گیا تھا تو انھوں نے مجھ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ میرے پہلے ہی جملہ میں انھوں نے بھانپ لیا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے میرے ساتھ بالکل دوسرے انداز میں گفتگو شروع کی جس میں وہ اور لوگوں سے بات نہیں کرتے۔ میں اُن کی مخلصانہ اور صادقانہ عنایتوں کا خاطر خواہ شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ ایسے کارنامہ و ادب کی میرے ساتھ ہمدردی یقیناً باعث صد فخر و انبساط ہے۔

۲۷ دسمبر

جیسا میں ڈرتا تھا سفیر نے بالآخر ویسا کیا یعنی وہ اکثر مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔ وینا میں اُس سے بڑا شاید ہی کوئی بیوقوف ہو جو دروازے کی بات کا اتنا خیال رکھتا ہو۔ وہ ہر کام ایک بدھی عورت کی طرح کیے بعد دیگرے بڑے فائدہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اُس کو خوش کرنا محال ہے اسلئے کہ وہ اپنے سے بھی کبھی خوش نہیں ہوتا میں اپنا کام قاعدے اور شوق کے ساتھ کرتا ہوں اور جب ختم ہو جاتا ہے تو گھر چلا آتا ہوں لیکن وہ برابر میرے کاغذات پر دیکھ کر واپس کر دیتا ہے کہ بدبس کافی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ نظر ثانی کی بھی ہدایت ہوتی ہے اسلئے کہ نظر ثانی سے الفاظ کے بستر اور صحیح استعمال کرنے کی مشق بڑھتی ہے۔ اُس وقت پھر مجھے صبر کی تاب نہیں رہتی اور میں زندگی سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ اس کی بھی کیا ہدایت ہے کہ نہ تو کوئی حرف عطف اور نہ کوئی لفظ متعلق فعل چھوٹے پائے۔ میں جملہ میں جن الفاظ کے

اُلٹ پھیر کو پسند کرتا ہوں بس اسی سے وہ خفا ہوتا ہے اور اگر میرے وقتوں کی موسیقی سرکاری اصطلاح سے نہیں ملتی تو وہ میرا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ یقیناً ایسے شخص سے واسطہ رکھنا بڑی بد قسمتی ہے۔

اس بددلی اور بے لطفی کا بدل مجھے صرف کاؤنٹس کی ملاقات میں ملتا ہے۔ کئی روز ہوئے اُس نے مجھ سے کہا کہ میں خود سیفر کے لیٹ ولعل اور تاخیر سے ناراض ہوں۔ اس کے ایسے لوگ اپنے لئے تو خیر مگر دوسروں کے لئے بھی سیکڑوں دقتیں پیدا کرتے ہیں مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے اور یہ مجبوری بالکل اسی طرح کی ہے جیسی ایک سیاح کو اونچے پہاڑ کی چڑھائی میں پیش آتی ہے یعنی اگر وہاں پہاڑ نہ ہوتا تو راستہ بالکل سیدھا اور خوشگوار ہوتا مگر چونکہ پہاڑ ہے اسلئے اُس سے گریز ناممکن ہے۔ کاؤنٹس کی مجھ پر مہربانیوں کا علم اس پُربے سیفر کو بھی ہے اور اس سے وہ اور چڑتا ہے اور اُسکو جب کبھی موقع ملتا ہے مجھے سنا کر کاؤنٹ کی بُرائی کرتا ہے۔ میں قدرتا کاؤنٹ کی طرف سے جواب دیتا ہوں جس سے معاملہ اور نازک ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں کل اُس نے مجھے ایک مکتا بھی رسید کیا اور کہنے لگا کہ کاؤنٹ تو دنیا دار آدمی ہے اور کاروبار میں بھی ایسا ہی اچھا ہے!! اُس کا طرز اچھا اور اُس کی تحریر میں روانی بھی پائی جاتی ہے مگر غیر معمولی فراست اور ذکاوت والوں کی طرح اُس کی قابلیت گہری نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ میری طرف اس انداز سے دیکھنے لگا کہ آیا مجھ کو اُس کی ضرب سے کچھ چوٹ آئی یا نہیں۔ مگر اُس کی اس نظر کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اس قسم کے افعال اور اقوال والے آدمیوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ تاہم میں برابر اپنی جگہ اڑا رہا اور اسی جوش اور سرگرمی سے اسکا جواب دیتا رہا۔ میں نے کہا کہ اگر صرف تفصیل علم اور سیرت کے پہلو پر نظر ڈالی جائے تو اس لحاظ سے بھی کاؤ کی ہستی قابل قدر ہے۔ میں تو آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جس کا دماغ ایسی معلومات کا خزانہ اور ایسی وسیع لیاقت کا گنجینہ ہو۔ اس کی تو عجیب حالت ہے۔ وہ ایک طرف تو پیشمار علوم و فنون میں مہارت رکھتا ہے اور دوسری طرف روزمرہ کے کاموں میں ذرا ذرا سی جبرئیا میں عملی طور پر دلچسپی لیتا ہے مگر میری ساری گفتگو اُس پر فروت کے سمجھ میں بالکل نہ آئی اور

میں اُسے سلام کر کے چلا آیا کہ کہیں اُس کی دوسری احمقانہ باتوں سے مجھے سخت غصہ نہ بجائے لیکن ان تمام باتوں کے تم ہی ذمہ دار ہو تم ہی وہ شخص ہو جس نے مجھے عمل کی خوبیوں پر کچھ لکھ کر اس حلقہ میں اپنی گردن ڈالنے پر مجبور کیا۔ ایک آدمی جو تزکاری کی کاشت کر کے اپنی پیداوار کو بازار کے دن شہر میں لے جا کر بیچتا ہے اگر مجھ سے کم مفید کام کرتا ہے تو بھائی مجھے موجودہ محنت اور مشقت کی حالت میں دس برس اور رہنے دو۔

اے یہ خوش آئند سو حال روح! اس چیز سے تو مجھے ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے کہ یہاں سوسائٹی میں مجھ کو احمق اور بیوقوف لوگوں سے کام پڑا ہے۔ ان کے اقتدار اور منصب کی لالچ بھی کیا چیز ہے اور اس کے انتظار میں سبقت لیجانے کے لئے وہ کتنی جانفشانیاں کرتے اور مشقت اٹھاتے ہیں! ان کی خواہشات کی اس عربانی میں کتنے ناگفتہ بہ اور بے شعور جذبات پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہم لوگوں کی سوسائٹی میں ایک عورت ہے جو ہمیشہ اپنے خاندان اور اپنی جائیداد کے حالات سناتی ہے۔ کوئی غیر آدمی اس کو پہلی بار دیکھ کر بالکل سمجھ کا مگر اس بیچاری کا سر دولت اور منصب کی بنیاد و نمائش سے پھگ گیا ہے۔ دراصل وہ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ وہ اسی اطراف کے مجسٹریٹ کے ایک منشی کی لڑکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں تھا کہ کس طرح لوگ اپنے کو اتنا ذلیل و خوار کر لیتے ہیں۔ روز بروز مجھ پر حقیقت عیاں ہوتی جاتی ہے کہ دوسروں کو اپنے معیار پر جانچنا کتنی بڑی نادانی ہے اور میں تو خود اپنے دل کے باتھوں اتنا تنگ اور پریشان حال ہوں کہ میں لوگوں کو اپنے اپنے راستہ پر جانے دینے کیلئے بالکل تیار ہوں بشرطیکہ وہ حق وہ مجھے بھی دیں۔ مجھے جس چیز سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے وہ منصب اور اقتدار کا امتیاز ہے جو ظالمانہ حد تک پہنچ گیا ہے میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ لوگوں کی حالتوں میں امتیاز اور فرق ناگزیر ہے اور اس خیال سے مجھ کو جو فوائد پہنچتے ہیں اُن کو بھی جانتا ہوں مگر میں ان امتیازات کو کبھی اس حد تک نہیں جانے دوں گا جس سے اس گنبد نیلگوں کے نیچے میرے عقوڑے بہت آرام میں غفل پڑے۔

ابھی حال میں میری ملاقات مس باب سے ہوئی ہے جو بہت دلپسند لڑکی ہے اور جس نے اپنی سادہ فطرت کو مصنوعی زندگی بسر کرنے کے باوجود برقرار رکھا ہے۔ ہم دونوں پہلی ہی بار گفتگو کر کے

یکساں طور پر خوش ہوئے۔ اور رخصت ہوتے وقت میں نے اُس سے پھر ملنے کا خیال ظاہر کیا اس پر وہ اتنے منت و غلطی سے راضی ہو گئی کہ میں اُس آنے والی گھڑی کا بڑی بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ وہ یہاں کی مستقل رہنے والی نہیں ہے مگر یہاں اپنی چچی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی چچی کی صورت بڑی مکروہ ہے۔ میں اس سے بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور آدھ گھنٹہ کے بعد مجھے معلوم ہوا جیسا کہ اُسکی بھتیجی نے بعد کو اقرار کیا کہ اُسکی چچی ایک معمولی جائداد کی مالکہ ہے مگر عقل و فہم اُسکی گرہ میں اس سے بھی کم ہے اور اُسکو اپنے آبا و اجداد کے حسب و نسب کے تصور میں، اپنی شرافت کے ناز میں اور اپنے اونچے اور بلند مکان سے مزدوروں اور غریبوں کو نفرت سے دیکھنے میں جو لطف و آرام ملتا ہے وہی دوسری چیز میں نہیں ملتا بیشک وہ اپنی جوانی میں حسین رہی ہوگی اور شاید اپنے عفو و انبساط میں اُس نے اپنی کچ ادائیگوں اور غمخواروں سے بہتر سے نوجوانوں کا دل بھی گھائل کیا ہوگا مگر اپنی پختگی سن و سال میں خود ایک بڑھے سپاہی کے ظلم و فدا کی اسیر ہو گئی جو اُسکی نگہداشت کی خاطر اور آزادی کے بدلے اُسکی ادھیڑ عمر میں اس کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گیا۔ وہ بیچارہ سپاہی بھی مر گیا اور وہ اب بیوہ ہے اور اپنی ”آہنی“ زندگی تنہائی اور عزت میں گذارتی ہے اور صرف اپنی خوبصورت بھتیجی کو ہیرا کرنے کے لئے اپنے گوشہ سے باہر نکلتی ہے۔

۸ جنوری ۱۹۳۷ء

انسان بھی کیا چیز ہے! اس کے سارے خیالات صورت و سامان، تزک اور احتشام کے تصور میں پریشان رہتے ہیں۔ وہ دلوں آگے بڑھنے کے لئے صرف ایک جنبش قدم پر ہر طرح کی جسمانی اور دماغی کوششوں میں مصروف رہتا ہے اور ہمیشہ صف میں ایک نمایاں جگہ کی فکر میں مشغول رہتا ہے۔ یہی نہیں کہ ایسے لوگ کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جائیں بلکہ یہ لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر معمولی کام کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اُن کو خاصی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ گذشتہ ہفتہ برف پر چلنے والی گاڑی کے معاملہ میں آگے اور پیچھے کا ایک ایسا ناگوار سوال اُٹھا جس سے ہمارا سارا لطف کمر کرا ہو گیا لیکن یہ احمق کیا جانیں کہ بزرگی اور عظمت کے میدان میں بازی بچانے کا معرکہ یہاں گرم نہیں ہوتا اسلئے کہ جو شخص یہاں میر ہوتا ہے اُس کے حصہ میں شاید ہی لطف و تفریح کا پورا حصہ آتا ہو کتنے بادشاہ ہیں جن پر ذرا حکومت کرتے ہیں اور کتنے وزراء ہیں جن پر اُن کے منشیان کا فرض پڑتی کرتے ہیں! اچھا بتاؤ

ان معاملات میں کون اصلی سردار اور کارفرما ہوا۔ میرے خیال میں تو دبی چودھو سردوں کے نقطہ نظر کو سمجھ سکے اور اس بات کی کافی مہارت اور قوت رکھتا ہو کہ اپنے بڑوں کی قوت اور اثر کو اپنے مقصد کی کاربراری میں استعمال کرے۔

۲۰ جنوری

میری پیاری شارلٹ! میں تمہیں یہ خط ایک ایسے مقام کے دیہاتی سرے کے ایک کمرہ سے لکھ رہا ہوں جہاں میں نے ایک سخت طوفان سے بھاگ کر پناہ لی ہے۔ میرے سارے زمانہ قیام مقام د میں جہاں میں بالکل غیروں میں رہتا تھا اور بے شک وہ لوگ میرے دل سے بیگانہ تھے مجھے تمہیں خط لکھنے کا کسی وقت ذرا بھی خیال نہیں آیا۔ لیکن اس کا شانہ قدرت اور اس گوشہ عزلت میں جب میرے دروازوں کے شب نشینوں پر شدید زلزلہ باری ہو رہی ہے تم کو یا میرے پاس ہو۔ جیسے ہی میں یہاں داخل ہوا تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے آگئی اور تمہاری یاد پھر تازہ ہو گئی۔ میری پیاری شارلٹ! تمہاری یاد کتنی پاک ہے۔ خدایا! میری اور تیری اُن پہلی اور مسرت بخش محبتوں کو پھر تازہ کر دے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس اضطراب اور پریشانی میں تم مجھے دیکھتیں۔ میرے تمام احساسات جواب دے چکے ہیں اور میرے دل میں کبھی مسرت کا جوش نہیں اٹھتا کسی گھڑی مجھے راحت اور آرام نہیں ملتا۔ ہر نقش آرزو میرے سامنے باطل اور دنیا کی تمام دلفریبیاں میرے سامنے بے اثر ہیں گویا میں ایک کٹھ پتلی کے تماشے کے سامنے کھڑا ہوا کٹھ پتلی کی حرکتیں دیکھ رہا ہوں اور میرے دل میں خیال ہوتا ہے کہ یہ تماشہ گاہ کہیں سراب نظر تو نہیں۔ ہاں ان کٹھ پتلیوں کو دیکھ کر جی ضرور ہل جاتا ہے یا لو کہو کہ میں بھی انہیں میں سے ایک پتلی ہوں لیکن جب میں اپنے کسی ہمسایہ کا ہاتھ پکڑتا ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ قدرتی اور اصلی نہیں تب میں خوف سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔ روز شام کو میں سوچتا ہوں کہ کل سویرے طلوع آفتاب کا تماشہ ضرور دیکھوں گا اور اس سے لطف اٹھاؤں گا۔ لیکن باوجود ارادہ کے صبح کے وقت بستر پہ پڑا رہتا ہوں۔ اسی طرح دن کو یہ ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو چاندنی میں پھر دل کا مگر جب رات ہوتی ہے تو گھر میں بیٹھ رہتا ہوں۔ مجھے بالکل خبر نہیں کہ پھر آخر میں کیوں اٹھتا ہوں اور کیوں سوتا ہوں۔ وہ خمیر جس سے میری تعمیر ہوئی ہے اب بالکل بیکار ہو گیا اور فطرت کی وہ دلچسپی

جس سے میں اندھیری راتوں میں خوش رہتا اور صبح سویرے اُٹھ کر ٹہلتا تھا اب غائب ہو گئی ہے اب میرے لئے یہاں ایک ہی دلچسپ چیز ہے اور وہ مس ب کی ذات ہے میری پیاری شارلٹ، اگر کوئی تمہارا مثل ہو سکتا ہے تو وہ مس ب ہیں مگر تم شاید کہو کہ یہ کیسا شخص ہے جو اب تعریفوں کے پل باندھنا سیکھ گیا ہے۔ لیکن یہ ایک طرح صحیح بھی ہے۔ حال میں میری طبیعت میرے افکار کے باوجود ایسی اچھی ہو گئی کہیں سکوروک نہ سکتا تھا۔ میری طبیعت میں کچھ مذاق بھی ہے اور یہاں کی عورتیں مجھ سے کہتی ہیں کہ خوشامرانہ باتوں کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا اور تم اس میں شاید جھوٹ کا اضافہ بھی کرو اسلئے کہ خوشامداد اور جھوٹ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اب ذرا مس ب کا بھی عقوڑا سا حال سنو۔ فطرت نے اس کی روح میں کافی تازگی عطا کی ہے جو اس کی نیلی آنکھوں سے نمایاں ہے مگر اپنی حیثیت سے وہ سخت نالاں ہے کیونکہ اسکی کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی اور اب تو وہ فیشن کی مصنوعی زندگی سے صلہ کی اختیار کرنے کو خوشی سے تیار ہے اور تمہاری اہلیت اور قابلیت کی دل سے قائل ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے اور تمہارے متعلق باتوں میں اسکو کافی لطف آتا ہے۔

اے کاش میں اسوقت تمہارے چھوٹے کمرے میں تمہارے تھوٹے پاس بیٹھا ہوتا اور بچے میرے گرد کھیلے ہوتے اور اگر وہ شرارت کرتے تو میں اُن کو بھوت پریت کے دلچسپ قصے سنا کر اپنے پاس خاموش بٹھا لیتا۔ اسوقت آفتاب اپنی نارنجی نقاب ڈالے ہوئے بڑے آب و تاب کے ساتھ غروب ہو رہا ہے اور اُس کی آخری کرنیں تمام درو دیوار میدان اور جنگل پر چمک رہی ہیں جو برف سے بالکل سفید ہیں۔ طوفان بھی ختم ہو گیا ہے اور میں بھی اب اپنے تاریک گوشہ کی راہ لیتا ہوں۔ کیا البرٹ اس وقت تمہارے پاس موجود ہے؟ اور وہ تمہارا آخر کون لگتا ہے؟ خدامیرے اس سوال کو معاف کرے۔

۸ فروری

پچھلے ہفتہ میں موسم بہت خراب تھا لیکن میرے لئے یہ بھی ایک رحمت ہے کیونکہ جب میں یہاں ہوں شاید ہی کوئی اچھا دن ہو جب لوگوں کی بیجا آمد و رفت سے باہر جانے کی کوئی نہ کوئی

زحمت درپیش نہ ہوئی ہو۔ بارش کی تیز دھار کھریا طوفان میں میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ گھر کا حال باہر سے یقیناً بہتر ہے مگر پھر باہر کی بھی کیفیت کسی حد تک گھر سے اچھی ہے۔ ان سب خیالات کے بھجور کی وجہ سے آخر کار میں قناعت کر کے گھر ہی میں بیٹھ رہتا ہوں۔ صبح کو جب آفتاب اپنی نورانی کرنوں سے عالم کو منور کرتا ہے تو میرے منہ سے ضروری فقرہ نکلتا ہے کہ آج کا دن کیسا خوشگوار ہے اور قدرت کا یہ عطیہ کیسا دلغریب ہے مگر لوگ اسکو یقیناً خراب کر دیں گے اور نہ صرف لوگ خراب کرتے ہیں بلکہ ایسی چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مثلاً صحت، شہرت، مسرت، تفریح یہ تمام چیزیں ان کے لئے بے معنی ہیں اور ان تمام خرابیوں کی جڑ ان کی جہالت، نادانی اور کمزوری ہے جو بقول اُنہیں کے ان کی نیک نیتی پر مبنی ہے۔ کاش میں ان سے التجا کر سکتا کہ خدا را اپنے ہاتھ سے اپنے پالوں میں کلما ٹی مت مارو۔

عارف زوری

سفیر کے ساتھ میرا رہنا اب مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اسکی حالت اب برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ وہ اس مضحکہ خیز طریقہ سے کام کرنے لگا ہے کہ میں اکثر اسکو ٹوکنے پر مجبور ہو جاتا ہوں اور خود اپنی رائے سے کام کرتا ہوں جس کو وہ محض بیکار سمجھتا ہے۔ حال میں اُس نے دیوار میں میری شکایت کی نقی جس پر وزیر نے مجھ کو تنبیہ بھی کی۔ تنبیہ نہایت مشائستہ تھی مگر تھی تو آخر تنبیہ اسوجہ سے میں استعفا دینے پر بالکل تیار تھا کہ اسی ضمن میں اُسکا ایک خط آگیا جس کے شریفانہ انداز اور بلند خیالی سے مرعوب ہو کر میں اپنے ارادہ سے باز آیا۔ اس خط میں اُس نے میرے تیز احساس کو کم کرنے کی کوشش اور میری محنت، سرگرمی، جوش اور کام میں میرے انتہائی انہماک کی تعریف کی تھی جو میری جوانی کی قولوں کا نتیجہ تھا۔ اس جوانا ہمتی کو دوبارے ملانے کے کم کرنا چاہتا تھا تاکہ اسکا بہتر طریقہ سے استعمال ہو سکے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے آئندہ ہفتہ تک میں خاموش ہو گیا ہوں اور اب میری اندرونی پر خاش بھی موقوف ہو گئی ہے۔ قناعت اور دماغی سکون کتنی بیش قیمت چیزیں ہیں۔ میرے دوست! کاش ان انمول جواہرات کی بے ثباتی ذرا اور کم ہوتی۔

میرے دوستو! خدا تم کو اچھا رکھے اور وہ خوشی عطا کرے جس سے اُس نے مجھے محروم کر رکھا ہے۔ البرٹ صاحب! میں آپ کی فریب دہی کا شکر گزار ہوں۔ آپ کی شادی کے مقررہ روز میں آپ کی شادی کی خبر کا انتظار کرتا رہا اور اُس دن میرے جی میں آیا کہ شارلٹ کے رخ کی یکطرفہ تصویر دیوار سے اُٹا کر دوسرے کاغذات کے ساتھ دفن کر دوں۔ شارلٹ کی شادی آپ کے ساتھ ہو بھی گئی مگر وہ قصور اب تک آدیزاں ہے۔ اچھا اُسے لٹکی رہنے دو اور آخر وہ کیوں نہ لٹکی بیچیکو میں جانتا ہوں کہ میرا شمار اب بھی آپ ہی لوگوں کے ساتھیوں میں ہے اور شارلٹ کے دل میں اب بھی میرے لئے جگہ محفوظ ہے۔ مگر وہ جگہ درجہ دوم کی جگہ ہے تو پھر میں اُسی جگہ پر قائم کیوں نہ رہوں۔ البرٹ! اگر وہ خدا نخواستہ مجھے بھول گئی تو میں بالکل پاگل ہو جاؤنگا اور اس خیال سے تو مجھے گویا شعلہ دوزخ کی لپک محسوس ہوتی ہے۔ الوداع البرٹ۔ میرے جنت کے فرشتے الوداع۔ شارلٹ الوداع۔

ہمارا سچ

ابھی ابھی ایک سخت ناگوار اور تکلیف دہ واقعہ پیش آیا ہے جس سے میں اس جگہ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میرے صبر کا یہاں اب بالکل لمبریز ہو گیا ہے اور بس موت — یہ چیز لا علاج ہے اور اس کے ذمہ دار صرف تمہیں ہو جس نے مجھ کو اس جگہ پر کام کرنے کے لئے مجبور کیا جسکے لئے میں بالکل موزوں نہ تھا۔ بہر حال مجھے اب ایک طرح کا اطمینان ہو گیا ہے اور تم بھی مطمئن ہو گے۔ تم اس واقعہ کو میری یقین دہانی اور سیما آسا طبیعت پر محمول نہ کرو۔ میں تمہارے پاس اس واقعہ کو صاف اور سیدھے سادے رنگ میں لکھ کر بھیجتا ہوں جیسے کوئی واقعہ نکار لکھتا۔

مقام و کاؤنٹ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میری عزت کرتا ہے۔ یہ بات عام طور پر سب کو معلوم ہے سیکڑوں بار اس کے بارے میں تم کو لکھ چکا ہوں۔ کل میں نے اسکے یہاں کھانا کھایا اور کل ہی کے دن شام کو اُس کے یہاں رواج کے مطابق اُمرا و رؤسا کے جمع ہونے کا دن تھا مجھے اس اجتماع کا بالکل خیال نہ تھا اور یہ بات بھی میرے ذہن سے اُتر گئی کہ ہم ایسے معمولی لوگوں کو اُمرا کے ایسے مجمع میں کہاں بارل سکتا ہے۔ بہر حال میں نے کاؤنٹ کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانے

کے بعد ہم لوگ پاس والے بڑے کمرہ میں چلے گئے اور وہاں بڑی دیر تک ہل ہل کر باتیں کرتے رہے اتنے میں کرنل ب آگئے اور وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ ہم سب لوگ باتیں کر رہے تھے کہ اجتماع کا وقت آگیا۔ خدا گواہ ہے کہ اس وقت میرے دل میں کوئی خیال نہ تھا کہ اتنے میں لیڈی س مع اپنے شریف شوہر اور اپنی بیوقوف مگر ساز باز کرنے والی لڑکی کے جسکی کمزوری اور گردن چوڑی تھی داخل ہوئیں اور ایک حقارت آمیزہ نظر ڈالکر مغرورانہ انداز سے جیسے پاس سے گزریں چونکہ میں اس قسم کے تمام لوگوں سے سخت نفرت کرتا ہوں اسلئے میں فوراً ہی جلنے پر تیار ہو گیا اور اسکا منظر بالکاؤنٹن لوگوں کی بکواس سے ذرا الگ ہو تو میں اُس سے رخصت ہو کر چلا آؤں۔ اتنے میں مس ب بھی داخل ہوئیں۔ میں جب اُس سے ملتا ہوں تو مجھے ایک قسم کی دلی راحت ملتی ہے اسلئے میں ذرا رک گیا اور اسکی کرسی کی پشت پر جھک کر اُس سے باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرنے میں اتنا مشغول تھا کہ مجھے اسکا بالکل پتہ نہیں چلا کہ وہ کچھ گھبرائی سی ہے اور اسی حالت میں اُس نے اپنی پرانی بے تکلفی سے جواب دینا بھی بند کر دیا۔ اس کے اس رویہ سے مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدایا! کیا یہ بھی اوروں کی طرح ہو گئی۔ باوجود اس کے کہ مجھے اس کی اس چال سے تکلیف ہوئی اور میرے جی میں بھی آیا کہ میں وہاں سے چلا آؤں مگر میں وہاں ٹھہرا رہا اور اس کے اس ناز و بار و یہ کی تاویل میں گرفتار رہا اور اس امید میں رہا کہ وہ شاید دوستانہ طریقہ سے مجھے پہچان لے۔ اتنے میں اس مجمع کے بقیہ لوگ بھی پہنچ گئے۔ اس میں بیرن ف تھا جو اپنے اس زرق برق لباس میں مبوس تھا جو پہلی بار فرانسس اول کی تخت نشینی کے وقت پہنا گیا تھا۔ چانسلمن بھی مع اپنی بیوی کے موجود تھا۔ ان میں سٹرلینج بھی تھے جو بدلینگی اور بد تمیزی سے کپڑا پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی پرانی وضع کی کوٹ تازہ مرمت کا پتہ دیتی تھی اور یہ چیز تو انکی تمام بد تمیزیوں سے بازی لے گئی۔ میں نے اپنے چند ملاقاتیوں سے باتیں کیں مگر ان لوگوں نے بہت مختصر سا جواب دیا۔ اس اثنا میں برابر مس ب کی طرف متوجہ رہا اور کمرہ کے دوسرے کونے میں عورتوں میں جو سرگوشیاں بھڑکی تھیں اُن کو بالکل نہ دیکھ سکا اور وہ سرگوشیاں بڑھ کر مردوں میں یہاں تک پہنچ گئیں کہ آخر لیڈی س نے کاؤنٹ کو بڑی تندہی سے مخاطب کیا دس پہ نے ان تمام واقعات کی تفصیل بعد کو مجھے بتائی،

جس پر کاؤنٹ میرے پاس آیا اور مجھے دیرپہ کے پاس لیجا کر کہنے لگا کہ آپ شاید ہم لوگوں کے مصلحت انگیز رواج سے واقف ہوں گے۔ آپ کی موجودگی سے یہ لوگ ناخوش ہوتے ہیں مگر میں کسی طرح بھی....“ میں نے بات کاٹ کر کہا کہ ”میں جناب سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے واقعی اسکا پہلے سے خیال رکھنا چاہیے تھا مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس معمولی عدم توجہی کو معاف کر دیں گے۔ میں تو یہاں سے جانے والا تھا مگر میری بد قسمتی کہ میں رک گیا“ یہ کہہ کر میں مسکرایا اور چلنے کے لئے جھک کر آداب بجالایا چلتے وقت اُس نے مجھ سے اسطرح بات چیت لایا جس سے ہر قسم کا پہلو نکلتا تھا۔ اس معزز مجمع سے میں ٹھکر جلدی سے باہر آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر م کے مکان پر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ راستہ میں پیماڑی کی چوٹی کے پیچھے دو بنے والے سورج کا نظارہ بھی کیا دلچسپ تھا۔ پھر میں نے ہو مر کے اُس خوبصورت حصہ کو بڑھا جس میں مہاں نواز گل بانوں کے یونیسیفر (اولیسیوس) کی دعوت کرنے کا حال ہے یہ حصہ واقعی بہت خوب تھا۔ رات کو کھانا کھائے۔ گھر آیا۔ کمرہ میں جو دیکھا تو بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ میز کے ایک کونے کی چادر اٹا کر چومہ کھیل رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر الف چلے آ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی ٹوپی رکھی اور جیسے ہی اُن کی نظر مجھ پر پڑی لپک کر وہ میرے پاس آئے اور آہستہ سے اس ناگوار واقعہ کا ذکر کرنے لگے۔ میں نے چونک کر کہا ”میرے ساتھ؟“ پھر انھوں نے کہا کہ کاؤنٹ نے آپ کو اس جلسہ سے چلے آنے پر مجبور کیا۔ میں نے کہا کہ ”ہاں شیطان ہی ہو جو اس جلسہ میں پھر جاے میں تو وہاں سے ٹھکر بہت خوش ہوا۔ میں خوش ہوں کہ آپ اس واقعہ کو معمولی خیال کرتے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ لوگ اس کے متعلق بہت چرمیگوئیان کر رہے ہوں گے۔ اس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی اس واسطے کہ میرے دل میں برابریہ خیال آتا رہا کہ ہر شخص جو وہاں بیٹھا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا اس واقعہ پر کیا غور کر رہا ہوگا۔ بس اسی خیال سے تو میرا دل سخت پریشان ہو گیا۔ اور جب میں دیکھتا ہوں کہ تقریباً ہر محفل ہر جلسہ میں میرے ہی حال زار کا ذکر کر کے میرے دشمن اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں اور یہ کہہ کر طعنہ دیتے ہیں کہ بڑے بول کا سر نہ بچا اور کہتے ہیں کہ جو لوگ تعلقات، مراسم اور اس قسم کی ”احقانہ“ نفیر یحوں سے نفرت کرتے ہیں اُن کا ہی حال ہوتا ہے تو اُس وقت جی سی چاہتا ہے کہ میں اپنے سینہ میں ایک خنجر

چہو لوں۔ تم ہمت و استقلال کے متعلق جو چاہو کہو لیکن خدا مجھے وہ ہستی دکھاؤ جو احمقوں اور بیوقوفوں کی ہنسی صبر کے ساتھ اس حالت میں برداشت کر سکے جبکہ اُن کو اس پر تھوڑی سی قیمت کسی نہ کسی وجہ سے حاصل ہو گئی ہو۔ ہاں جب اُن لوگوں کی حماقتیں بے بنیاد ہوتی ہیں تو اُن کو بغیر کسی شکایت کے برداشت کیا جاسکتا ہے

۱۶ مئی

ہر چیز نے گویا میرے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ آج ٹہلتے ٹہلتے میں مس ب سے ملا اور اس کے ساتھ ہولیا اور جب ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے اُس کے دوستوں سے کچھ دور ہو گئے تو میں نے اُس سے اس کے بے ہوش رویہ پر گفتگو شروع کی۔ اس نے جوش میں آکر جواب دیا کہ ”ور تھو تم تو میرے دل کا حال جانتے ہو۔ پھر تم کس طرح اس واقعہ کی غلط ترجمانی کرتے ہو۔ جیسے ہی تم کمرے میں داخل ہوئے اُس وقت میں نے کیا کیا آفتیں نہیں برداشت کیں۔ میں یہ سب جانتی تھی اور بار بار تم سے کہتے کہتے رک گئی۔ میں جانتی تھی کہ خاندان س اور خاندان ٹ کی عورتیں مع اپنے شوہروں کے بجائے تمہارے ساتھ رہنے کے واپس چلا جانا پسند کریں گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ کاؤنٹ اس معاملہ میں ان سے کوئی خاص تعارض نہ کرے گا۔ اور اب تو اتنی سی بات کا اتنا افسانہ بن گیا ہے۔“ ریڈلین نے کل مجھ سے جو کچھ کہہ تھا اسکو میں بڑی تکلیف اور درد کے ساتھ محسوس کرنے لگا اور اسی حالت میں اپنے جذبات کو چھپا کر میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ واقعہ آخر افسانہ کیسے بن گیا۔

”اُف! اس کی وجہ سے مجھے اب تک کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں“ اس اچھی لڑکی کی زبان سے یہ فقرہ اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ میں بھی اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور میرے جی میں آیا کہ اپنے کو اُس کے قدموں پر ڈال دوں پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ اس درمیان میں اس کی آنکھوں سے برابر آنسو بہتے رہے اور میری حالت بھی کسی مجنون کی سی ہو گئی۔ اتنے میں اُس نے اپنے آنسوؤں کو چھپائے بغیر پوچھا اور کہنے لگی کہ ”تم تو میری چچی کو جانتے ہو وہ بھی وہاں موجود تھی اور تم جانتے ہو کہ وہ کس رنگ

میں اس واقعہ کو لیتی ہے ؟ کل رات اور آج صبح میں تمہارے اور اپنے تعلقات پر ایک لکچر دیکھو
ہلکا بڑھکتے ہوئے سننے پر اس طرح مجبور کی گئی کہ میں تمہارے جواب میں نہ تو کچھ کہہ سکتی تھی اور نہ کچھ کہنے
کی ہمت کر سکتی تھی ۹

اس کی زبان سے جتنے الفاظ نکلے اس نے میرے دل پر گویا تیرہ فشر کا کام کیا۔ اُس کو کیا
معلوم کہ اگر وہ ان باتوں کو مجھ سے پوشیدہ کہتی تو میرے اوپر کتنا احسان کرتی۔ علاوہ بریں اُس
نے مجھے ان تمام بیہودگیوں اور بدتمیزیوں سے بھی آگاہ کر دیا ہے جو اب ”شرافت“ کے نام سے
کی جانیں گی اور جن کی وجہ سے بدنما دا اور بدطینت لوگ مجھ کو نیچا دکھائیں گے اور میرے وقار کو
صدمہ پہنچے اور دوسروں کے ساتھ میرے سردمہری کے برتاؤ پر جن کا میں اکثر ملزم ٹھہرا جاتا
ہوں، خوشیاں سنائیں گے۔ ولہلم۔ ان سب باتوں کو اس کی زبان سے نہایت خلعتانہ اور
ہمدردانہ انداز میں سنکر میرے بدن میں غم و غصہ کی اہر دوڑ گئی اور اس وقت بھی مجھ پر وہی بیجانی
کیفیت طاری ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر کوئی شخص اس واقعہ پر مجھے ملامت کرتا تو میں فوراً اپنا غصہ
اُتارنے کے لئے اسکی جان ہی لے لیتا اور تب کہیں اُس کے خون کے نظارہ سے میرے غصہ کے
کم ہونے کا امکان ہوتا۔ سیکڑوں بار میں نے خنجر اس نیت سے ہاتھ میں لیا ہے تاکہ اپنے درو رسیدہ
دل کی کسک کو کم کروں۔ علم طبیعیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ عمدہ گھوڑوں کی ایک نسل ایسی بھی
ہوتی ہے کہ جب وہ دوڑتے دوڑتے ٹھک جاتے ہیں تو وہ اپنے دانتوں سے کسی رگ میں خود ہی
فصد کھول لیتے ہیں تاکہ سانس آرام دسکون کے ساتھ لے سکیں۔ مجھے بھی اپنی فصد کھولنے کا
اکثر خیال ہوتا ہے تاکہ میں اس رنج و معیبت کی بندشوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاؤں۔

۲۴ مارچ

میں نے دربار میں اپنا استعفا داخل کر دیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ منظور بھی ہو جائے گا
مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کرو گے کیونکہ اس باب میں میں نے تم سے پہلے کوئی مشورہ نہیں لیا۔
میرے لئے اب اس جگہ سے چلا جانا از بس ضروری ہو گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے یہاں مقیم
رہنے کی ترغیب دو گے اور اس لئے — یہ خبر میری والدہ صاحبہ کو ذرا نرمی کے ساتھ سنانا

میں یہاں جب اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو اس حالت میں اوروں کے لئے بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ اس خبر سے والدہ صاحبہ کو ضرور تکلیف ہوگی کہ میں نے اپنی پرانی طرز زندگی کو بالکل ہی کیوں بدل دیا۔ حالانکہ اُس پر اگر میں قائم رہتا تو ترقی کر کے اوّل پرلوی کونسلر اور پھر وزیر کے درجہ تک پہنچتا اور اب بجائے آگے بڑھنے کے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑے گا۔ تم جس پیرایہ میں چاہو بحث کرو اور میرے یہاں رہنے کے جتنے وجوہ ممکن ہو سکتے ہیں اُن پر زور دو مگر اب تو میں یہاں سے جاتا ہوں اور بس اتنا کافی ہے۔ لیکن تم میرے پتہ سے ناواقف نہ رہو اسلئے میں تمکو بتاتا ہوں کہ پرنس — آجکل یہیں ہیں۔ وہ مجھ سے ملکر بہت خوش ہوئے اور میرے استعفا کا ارادہ سنکر انھوں نے مجھ کو اپنے دیہاتی مکان میں آنے اور اپنے ساتھ موسم بہار گزارنے کی دعوت دی ہے۔ اب میں بالکل خوشخام ہوں اور چونکہ ہم دونوں سوائے ایک معاملہ کے سب پر متفق ہیں اس واسطے میرا ارادہ ہے کہ میں اُن کے ساتھ کچھ دنوں قسمت آزمائی کروں۔

۱۹ اپریل

تمہارے دونوں خطوں کا شکریہ۔ جواب میں دیر ہوئی اور اس خط کو بھی میں نے اس انتظار میں روک رکھا تھا کہ جب دربار سے جواب آجائے تو بھیجوں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری والدہ وزیر کے پاس اس قسم کی کوئی درخواست نہ بھیج دیں جس سے میرے استعفا میں خلل پڑے لیکن میری استدعا قبول ہو گئی اور میرا استعفا منظور ہو گیا۔ میں یہ نہ بتاؤں گا کہ کتنی تعجبوں کے ساتھ میرا استعفا منظور ہوا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ وزیر نے اس پر کیا لکھا اس لئے کہ تم پھر اپنی وہی پرانی آہ زاری شروع کر دو گے۔ ولیم ہمد ہمارے میرے پاس ایک تحفہ قیمتی بچیس ڈھکنٹ بھیجا ہے اور اُس کے اس اختیاق سے متاثر ہو کر تو میں رو دیا۔ اچھا مجھے اب ان رویوں کی ضرورت نہیں رہی۔ بگو میں نے والدہ صاحبہ سے مانگا تھا۔

ہریش

میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا اور چونکہ میرا وطن سترک سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر

لے سوئے کا ایک سکھ جو تقریباً ۱۰ میل کے برابر تھا اور پہلے یورپ میں چلتا تھا۔

اس لئے میں وہاں ایک بار اور جا کر اپنے بچپن کے خواب آسا واقعات کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں
میں اُسی دروازہ سے داخل ہوں گا جس سے میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے والد کے انتقال کے قبل
جایا کرتا تھا۔ اب والدہ نے یہ مسرت بخش کنج چھوڑ کر معلوم نہیں کیوں تمہارے غم زدہ شہر میں سکونت
اختیار کی ہے۔ اچھا میرے دوست الوداع۔ تم میرے آئندہ حالات سنو گے۔

۹ مئی

میں اپنے وطن میں ٹھیک ایک جوش سے معمور زائر کی حیثیت سے گیا تھا اور میرا دل اسوقت
بہت سے غیر متوقع جذبات سے لبریز تھا۔ شاہ بلوط کے بڑے درخت کے قریب جو قصبہ ہے پون
میل کے فاصلہ پر ہے میں گاڑی سے اتر گیا اور گاڑی کو پہلے ہی بھیج کر خود پیدل چلنے لگا تاکہ پچپن
کی بہت سی خوشیوں سے اپنے دل کو پھر سے معمور کروں۔ شاہ بلوط کے نیچے جب پہنچا تو میں کھڑا
ہو گیا۔ یہ درخت کسی زمانہ میں میری سیر و تفریح کی حد اور جولانگاہ تھا۔ آف! اب کتنی تبدیلیاں
ہو گئی ہیں اُس معصومانہ مسرت کے عالم میں میں ایک ایسی نامعلوم دنیا کا مشتاق رہتا تھا جہاں
اپنی آنکھوں اور اُمیدوں کے مطابق ہر قسم کی تفریح و انبساط کا سامان مل سکے اور میرے دوست
اب حالت یہ ہے کہ میں اس خراب آباد سے واپسی پر کتنی ناامردیاں اور ناکامیاں اپنے ساتھ لایا ہوں
بچپن میں میں ان پہاڑوں کو کتنے شوق سے دیکھتا تھا جو میرے سامنے دور تک چلے
گئے ہیں اور کتنی بار وہ میری دلی تمنائوں کا مرکز رہ چکے ہیں۔ میں یہاں گھنٹوں بیٹھ کر ان کے
نظارہ سے لطف اٹھاتا اور اُن کے درختوں کے سایہ میں پھر نے کی آرزوئیں کرتا اور اکثر ان
کی وادیوں میں جو دور سے کتنی دلفریب معلوم ہوتی ہیں گم ہو جانے کی تمنا کرتا۔ جب میری
سیر و تفریح کا وقت یا میری چھٹیاں ختم ہو جاتیں تو میں اس خوبصورت خطہ کو بڑی مجبوری
کے ساتھ خیر باد کہتا۔ میں قصبہ کے قریب گیا اور اُن پرانے باغوں اور چمنوں کو پہچان گیا
جس میں لوگ گرمی کے زمانہ میں رہتے ہیں۔ جو نئے باغات بعد کو بنے تھے وہ مجھے پسند نہیں
آتے اور نہ اُن کی تبدیلی میرے دل کو بھائی۔ جوں ہی میں قصبہ میں داخل ہوا میرے تمام پرانے
جذبات عود کر آئے۔ میرے دوست! میرے اسوقت کے محسوسات بڑے دلفریب اور خوش آئند

تھے مگر میں اس وقت ان کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کا لطف بیان کرنے سے غائب ہو جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے پرانے مکان کے قریب بازار میں جا کر رہوں لیکن وہاں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ وہ اسکول کا کمرہ جہاں وہ اچھی بڑھی اُستانی ہم لوگوں کو پڑھایا کرتی تھی اب وہاں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ کمرہ دیکھتے ہی مجھ کو فوراً وہ وقت یاد آ گیا جب میں زبردستی پکڑ دھکڑ کر پہلے پہل پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا تھا اور میری روحی تکلیف آنسوؤں کے ذریعہ ظاہر ہوئی تھی۔ ہر ہر قدم پر کوئی نہ کوئی خاص اثر کی ایسی یاد تازہ ہوتی تھی کہ امکانِ مقدسہ میں بھی کسی راز کو اتنے مقامات کا احساس نہ ہوتا ہوگا حالانکہ وہاں کا چہرہ چہرہ کتنی پر اثر یاد سے لبریز معلوم ہوتا ہے اور اس حالت میں اُس راز کی روح بھی شاید میرے جیسے جذبات شوق سے ملونہ ہو اس سلسلہ میں ایک واقعہ مثال کے لئے کافی ہوگا۔ میں ایک چشمہ کے کنارے کنارے چل کر ایک کھیت کے پاس آیا جہاں میں پہلے ٹھہرا کرتا تھا اور اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں میں اپنے ہجولیوں کے ساتھ پانی پر لٹھیں بنا کر تیرا یا کرتا تھا۔ ساتھ اپنے بچپن کی یہ بات بھی یاد آئی کہ میں کتنے مستفلس شوق سے اس چشمہ کے بہاؤ کو دیکھتا اور ملک کے اُن حصوں کے متعلق روحانی خیالات قائم کرتا جن میں سے چشمہ بہتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اسی حالت میں تھوڑی دیر کے بعد میرے تخیل کی حد ختم ہو جاتی مگر پانی اپنی اسی رفتار سے برابر بہتا چلا جاتا کیونکہ میرا تخیل نامعلوم فاصلہ کے خیال سے منتشر اور پریشان ہو جاتا۔ میرے عزیز دوست۔ میرے آبا و اجداد کے خیالات بھی بالکل اسی طرح مسرور اور مقید رہے ہونگے اور اُن کی شاعری اور اُن کے جذبات بھی کمسنی کی خوشبو سے چمکتے ہوں گے۔ یولیسز جب اس بحر بیکراں اور اس عالم ناپیدا کنار کا ذکر کرتا ہے تو اس کے توصیفی الفاظ بالکل صحیح موثر، قدرتی اور رازدار معلوم ہوتے ہیں معلوم نہیں اس قول میں کونسی کام کی بات پوشیدہ ہے جسکو میں نے اسکول میں اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ پڑھا ہے کہ دنیا گول ہے حالانکہ انسان کو خوش رہنے کے لئے بس تھوڑی سی زمین کی ضرورت ہے اور اس کی آخری آرامگاہ کے لئے تو اس سے بھی کم کی ضرورت ہے۔؟

میں آجکل بشا ہزادہ کے ساتھ اس کے شکاری مکان میں مقیم ہوں۔ واقعی وہ ایسا

شخص ہے جس کے ساتھ آدمی ہنسی خوشی کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ ایماندار ہے اور قلعے سے خالی تاہم اُس کے ساتھیوں میں چند اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو میں بالکل نہیں سمجھ سکتا نہ تو وہ یہودے اور بدینت ہیں اور نہ دیکھنے میں بھلے اور ایماندار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض وقت گمان گذرتا ہے کہ وہ لوگ بالکل بھلے مانس ہیں لیکن تب بھی میں اُن کو قابل اعتبار نہیں سمجھ سکتا اکثر مجھے شاہزادہ کی اُن باتوں کے اطہار سے سخت تکلیف ہوتی ہے جن کو اُس نے یا تو کہیں سنی ہیں یا پڑھی ہیں اور جنکو وہ بالکل اسی طرح بیان کرتا ہے جس طرح دوسروں نے اُس سے کہا ہے۔ وہ میری فہم و بصیرت اور قابلیت کا بہ نسبت میرے دل کے زیادہ مداح ہے حالانکہ میں صرف اپنے دل کا دیوانہ ہوں اور سچ پوچھو تو میری کل کائنات یہی ہے۔ ہماری قوت، ہماری مسرت اور ہماری تکلیت ان سب چیزوں کا سرچشمہ بس یہی دل ہے۔ میری جیسی علم و دانش تو بہر حال سبھی حاصل کر سکتے ہیں مگر میرا دل تو بس میرا ہی دل ہے۔

۲۵ مئی

میرے دماغ میں چند افکار تھے خیال تھا کہ جب وہ بروے کار آجائیں گے تو اُن سے تمہیں آگاہ کروں گا لیکن اب چونکہ وہ ناکام رہے اسلئے تمہیں بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں میں فوج میں داخل ہونا چاہتا تھا اور مدلوں سے اس کا شوق بھی تھا۔ شاہزادہ کے ساتھ یہاں آنے کا میرا مقصد خاص ہی تھا اس لئے کہ وہ — میں جنرل ہے۔ ایک روز کی سیر میں نے اپنا خیال اُس سے ظاہر کیا مگر اس نے اُسے ناپسند کیا۔ درحقیقت اسکی باتوں کو نہ مننا اور اسکے مضبوط دلائل کو نہ ماننا کسی مجنوں ہی کا کام ہوگا۔

۱۱ جون

منہ چاہو کہو میں اب یہاں نہیں رہ سکتا اور میں اب یہاں کیوں رہوں؟ میں اب تنگ آ گیا ہوں حالانکہ شاہزادہ مجھ پر بہت مہربان ہے مگر مجھے یہاں آرام نہیں ملتا۔ مجھ میں اور اس میں کوئی بات ملتی جلتی نہیں ہے۔ وہ صاحب فہم ضرور ہے مگر بہت معمولی قسم کا اسکی باتوں میں مجھے بس اتنی تفریح کا سامان ملتا ہے جتنا میں کسی اچھی لکھی ہوئی کتاب کے

پڑھنے سے حاصل کر سکتا۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں اور رہوں گا اور بعد ازاں اپنے سفر پر چل کھڑا ہوں گا۔ جو تصویریں میں نے یہاں بنائی ہیں وہ میری تمام تصویروں میں بہترین ہیں۔ شاید وہ کو بھی فنون لطیفہ سے ذوق ہے لیکن اگر وہ اصول قواعد کی پابندی چھوڑ دے تو اس کے دماغ میں ترقی کی کافی گنجائش پیدا ہو جائے۔ جب میں اپنے روشن تخیل کی مدد سے فطرت اور فنون لطیفہ کی تفسیر کرتا ہوں، اور اس وقت وہ اپنی عالمانہ رائے پیش کر کے ماہرین فنون لطیفہ کے اصطلاحی الفاظ ان اپ شتاب طریقہ پر استعمال کرتا ہے، تو مہرے مہر کا بیمانہ اکثر چھلک پڑتا ہے۔

۱۶ جولائی

اس دنیا میں میں نے پھر راہ بیانی اور سرگردانی اختیار کی ہے اور بالکل زائر ہو گیا ہوں لیکن تمہیں کہو کہ آخر تم کیا ہو؟

۸ جولائی

یہاں سے اب میں کہاں جاؤنگا؟ میں تم پر یہ راز ظاہر کر دں گا۔ میں یہاں دو ہفتہ اور رہنے پر مجبور ہو گیا ہوں اور اس کے بعد میں سوچتا ہوں کہ علاقہ — کی کانوں کی سیر کرنا میرے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن ان سب باتوں سے میں اپنے کو واقفنا فریب دے رہا ہوں ورنہ اصلیت یہ ہے کہ شارلٹ کی صحبت سے ایک بار اور لطف اٹھانے کی خواہش ہے اور بس۔ میں اپنے دل کے اس ایسا پر مسکرتا ہوں اور اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔

۱۹ جولائی

نہیں! نہیں! اب تک ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ میں اور اس کا شوہر! — اے میرے خالق! اے مجھے زندگی کی نعمت سے مالا مال کرنے والے! اگر تو میری قسمت میں بخوشی لکھ دیتا تو میں تمام عمر تیری عبادت میں گزارتا لیکن اب میں کوئی شکوہ شکایت نہیں کر دے گا میرے ان آنسوؤں کو معاف کر اور میری بیکار خواہشات سے درگزر وہ اور میری بیوی!

لے پھر مجھے پھلا دیں دیکھو۔ دل خانہ خراب کی باتیں۔

اے! اس حسن المخلوقات کو سینہ سے لگانے کا خیال! — پیارے ولیم۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ البرٹ اپنے ہاتھوں کو اس کی نازک کمر میں ختم کرتا ہے تو میرا سارا جسم متحرک ہوا اٹھتا ہے۔ اور کیا میں تم سے کہہ دوں اور کیوں نہ کہوں کہ وہ بہ نسبت البرٹ کے میرے ساتھ بہتر زیادہ خوش ہوتی۔ البرٹ ایسا آدمی نہیں ہے جو اُس کے دل کی تمام خواہشوں کو پوری کر سکے کیونکہ وہ عشق کی راہ عقل سے ملے کر ناچا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ — نگران دونوں کے قالب میں ایک جان نہیں۔ میرے پیارے دوست! بارہا کسی دلچسپ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھتے وقت اور سیکڑوں دھڑکیاں ہاتھیں جب میرا اور شارلٹ کا دل مل جاتا یا جب کسی خیالی انشا میں کسی شخص کے متعلق ہم دونوں کے جذبات کا اظہار ہوتا تو میں محسوس کرتا کہ خالق نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر ولیم! اس کو کیا کیا جائے کہ البرٹ اُس سے بہت محبت کرتا ہے اور پھر کونسا ایسا فقرہ ہے جو ایسی محبت کا مستحق نہیں۔ میرے کام میں ایک ناگزیر ملاقات سے خلل پڑ گیا ہے۔ میرے افسوس ختم گئے ہیں اور میری خاطر بھی اب جمع ہے۔ میرے عزیز ترین دوست! اچھا الوداع۔

۱۷ اگست

دنیا میں ہی تنہا بد قسمت اور مصیبت زدہ نہیں ہوں۔ کون ہے جس کی اُمیدوں کا خون نہیں ہوتا اور کون ہے جس کی خواہشات پر پانی نہیں پھرتا! نیبو کے پیر کے نیچے میں اپنی اچھی اوستانی بڑھیا سے مل آیا ہوں۔ اسکا سب سے بڑا لڑکا مجھے دیکھتے ہی میری طرف دوڑا اور اُس کی خوشی کی چیخ سن کر اُس کی ماں بھی نکل آئی جس کے چہرہ پر رخ و غم کے آثار نمایاں تھے۔ اسکا پہلا فقرہ تھا کہ ”افسوس میرا چھوٹا جان چل بسا۔“ جان اسکا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ میں یہ خبر سن کر خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا کہ ”میرا شوہر حال میں سوئٹزرلینڈ سے خالی ہاتھ واپس آیا ہے اور اگر کچھ ٹخیر اور نیک لوگوں نے اسکی امداد نہ کی ہوتی تو وہ بیچارہ بھیک مانگ کر کہیں گھر پہنچتا۔ راستہ میں وہ بخار میں مبتلا بھی ہو گیا تھا۔“ اس واقعہ کو سنکر میں خاموش رہا پھر اُس کے چھوٹے لڑکے کو کچھ نکال کر دے دیا بعد ازاں اُس کی

نے مجھے پھلوں کی دعوت دی جس پر میں راضی ہو گیا۔ پھلوں سے فراغت پا کر میں امن و دگر کی حالت میں اُٹھا اور چلا آیا۔

۲۱ اگست

میرے محسوسات میں برابر تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ بعض وقت تو مجھے مستقبل بہت شاندار اور مسرت آمیز نظر آتا ہے لیکن یہ کیفیت صرف ایک لمحہ تک رہتی ہے۔ جب میں اپنے خیال میں غرق ہو جاتا ہوں تو اُس وقت میں اپنے دل میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر البتہ مجھے تودہ — ہو جائیگی اور میں — ہو جاؤں گا! اور اس خطبہ میں میں حیران و سرگرداں ایک اونچی چٹان پر پہنچ جاتا ہوں جس کے کناروں کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔

جب میں اس دروازہ سے گذرتا ہوں یا اُس رستہ پر چلتا ہوں جس سے میں پہلی بار شارلٹ کے پاس گیا تھا تو میرا دل اپنی موجودہ بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر بیٹھ جاتا ہے اُف! ہر چیز کتنی بد لگتی ہے۔ اب نہ تو میرا دل ویسا رہا اور نہ اب وہ جذبات رہے۔ میرے محسوسات بالکل ایسے مردہ شاخ وادے کے سے ہو گئے ہیں جس کی روح اپنے عیش و عشرت کے زمانہ کے بنائے ہوئے اُس خوشنما و آراستہ محل کو دیکھنے آئی ہو جس کو اُس نے مرتے وقت بصد حسرت و یاس اپنے لڑکے کے لئے چھوڑ دیا ہو اور جو اب اتنی خراب و خستہ حالت میں پڑا ہو کہ اُس کی ساری شان و شوکت غائب ہو گئی ہو اور اُس کے بڑے بڑے کمرے اور بام و در بے لکیں ہوں۔

۳۰ ستمبر
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی دوسرے سے کیسے محبت کر سکتی ہے اور کس طرح محبت کرنے کی ہمت کر سکتی ہے درآئیکہ اس دنیا میں مجھے اس سے زیادہ عزیز اور کوئی چیز نہیں اور اس چتر نیلگوں کے نیچے تو میری سب سے بڑی دولت اگر ہے تو وہی ہے۔

۱۰ ستمبر
شاید یہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے قدرت اب اُس کی بہار کو خزاں سے بدل رہی ہے اسلئے مجھ پر بھی خزاں کا جادو چل رہا ہے اور میرے چاروں طرف خزاں کا رنگ چھار رہا ہے۔ میرے

شجر زندگی کی پتیاں بھی مرجھا کر پھیلی پڑ گئی ہیں اور اُس پاس کے درخت بھی اپنے پتوں سے خالی ہو گئے ہیں۔ میں نے یہاں آنے کے بعد تم کو ایک کسان کے لڑکے کی بابت لکھا تھا۔ کیا وہ تمہیں یاد ہے؟ والہام میں میں نے اُس کے متعلق دریافت کر لیا۔ معلوم ہوا کہ وہ برخاست ہو گیا اور اب لوگ اُس سے پرہیز کرتے ہیں۔ کل جب میں پاس کے ایک کانوں میں جا رہا تھا تو اُس سے سڑک پر ملاقات ہوئی اور میں اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اُس نے اپنا سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے اور جب میں اس قصہ کو تم سے کہوں گا تو تم خود ہی سمجھ لو گے۔ لیکن میں تمہیں کاہے کو مخفیہ دول اپنا رنج و غم اپنے ہی تنگ کیوں نہ محدود درکھوں اور تمہیں فضول کیوں اس بات کا موقعہ دول کہ تم مجھ پر الزام لگاؤ اور میری ذات کو قابلِ رحم سمجھو۔ خیر اچھا سنو۔ میرے قسمت کا ایک جغویہ بھی ہے۔

میرے سوالات کا جواب اول اول اُس کسان کے لڑکے نے دینی ہوئی ٹھگین آواز میں دیا۔ جس سے میں نے اُس کو بودا سمجھا لیکن جوں جوں بات چیت بڑھتی جاتی تھی وہ بھی زیادہ بے تکلفی سے باتیں کرتا جاتا تھا اور آخر میں تو اُس نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اقرار کیا اور اپنی بخت پر پشیمان ہوا۔ میرے دوست اکاش میں اُس کے الفاظ کو پورے طور پر دہرا سکتا۔ اُس نے مجھ سے اپنے گزشتہ زندگی کے واقعات اس لطف و مسرت سے بیان کیا کہ میری واپسی کے بعد بھی اسکا اس پر اثر باقی رہا اور اسکا جذبہ عشق و محبت اتنا تیز ہو گیا کہ وہ اپنے تمام افعال و اقوال اور اپنے مستقبل سے بالکل بیگانہ ہو گیا۔ اس حالت میں نہ تو وہ کھا سکتا تھا نہ پی سکتا تھا اور نہ سو سکتا تھا۔ ہر وقت اس کو ایک جس دم کی کیفیت پہنچیں کئے رہتی۔ وہ بڑوں کے تمام احکام کی خلاف ورزی کرتا اور تمام اوامر کو بھول جاتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی جن سوار ہے۔ اسی دوران میں ایک روز ایسا ہوا کہ اُس کی محبوبہ اپنے کوٹھے پر چڑھی۔ اُس کو جب معلوم ہوا تو اُس کے پیچھے پیچھے وہ بھی گیا یا یوں سمجھو کہ اس کی طرف راغب ہوا۔ چونکہ اُس کی محبوبہ نے اُس کی تمام التجاؤں اور منتوں کو سنی ان سنی کر دیا تھا اس لئے اُس نے مجبوراً جبر سے کام لیا۔ لیکن اس حالت میں اُس کو مطلق خیر نہیں کہ کیا واقعہ پیش آیا مگر اُس نے خدا کو گواہ بنا کر اتنا ضرور کہا کہ میرا ارادہ

اس کی طرف سے اچھا تھا اور میری اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ مجھ سے شاہی کرے اور پھر ہم دونوں ہنسی خوشی زندگی گزاریں۔ جب وہ اپنی داستان بیان کرتے کرتے اس مقام پر پہنچا تو ذرا ہچکچانے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو ظاہر کرنے کی اس میں ہمت نہیں مگر اُس نے آخر کار پریشانی کے ساتھ اقرار کیا کہ ”میری محبوبہ نے مجھ کو اپنے غم دل کی داستان کہنے کا قہر اس موقع ضرور دیا اور برائے نام آزادی بھی دیدی تھی“ اپنے اس قصہ کو وہ دو تین بار درمیان سے کاٹ چکا تھا اور مجھ کو اس بات کا پورا یقین دلایا تھا کہ اس کو بدنام کرنے کا وہ ذرا سا بھی خیال اپنے دل میں نہیں رکھتا کیونکہ اب بھی بدستور سابق وہ اُس سے مخلصانہ طور پر محبت کرتا ہے۔ پھر اُس نے کہا کہ یہ قصہ اس سے قبل میں نے کسی اور سے نہیں کہا اور آپ سے صرف اس لئے کہتا ہوں کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ میں بالکل آوارہ و بدعاش نہیں ہوں۔ میرے دوست! یہاں میں اپنا پرانا رگ جس کو تم جانتے ہو کہ میں برابر الا کرتا ہوں، پھر الا پونگا اگر میں اُس شخص کی حالت اچھی طرح لکھ سکتا جیسا کہ وہ میرے سامنے کھڑا تھا یا کھڑا ہے، کاش میں اس کی پوری تصویر کھینچ سکتا تو تم اُس سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن جو کچھ لکھ رہا ہوں اتنا ہی کافی ہے۔ تم چونکہ میری بدقسمتی کی داستان جانتے ہو اور میری طبیعت سے بھی خوب واقف ہو اس لئے تم آسانی سے سمجھ سکتے ہو کہ ہر بدقسمت آدمی سے مجھے کتنا انس ہو جاتا ہے لیکن اس شخص کے ساتھ تو خاص طور سے ہے جس کا میں نے ابھی واقعہ بیان کیا ہے۔

یہ خط دہرانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنے قصہ کا خاتمہ لکھنا بھول گیا۔ لیکن یہ کمی آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔ وہ محبوبہ اپنے بھائی کے ایمارت اس عاشق جانناز کی طرف سے بے پروائی برتنے لگی اور اس کا بھائی تو اُس سے بہت دلوں سے نفرت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کو گھر سے نکال دے اس لئے کہ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اُس کی بہن نے دوسری شادی کی تو خود اُس کے لڑکے جائداد سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ اس کی بہن لا ولد ہے۔ بہر حال وہ لوگ نکال دیا گیا اور اس سارے معاملہ سے اتنی رسوائی و بدنامی ہوئی کہ اگر وہ چاہتی بھی تو اُس

نوکر کو واپس نہیں بلا سکتی تھی اب اُس نے دوسرا نوکر رکھ لیا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس نوکر سے بھی اس کا بھائی اسی طرح ناراض ہے کیونکہ اس سے بھی وہ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن میرے اطلاع دینے والے کا بیان ہے کہ وہ نوکر خود ایسی مصیبت کے بعد زندہ رہنے کیلئے تیار نہیں۔ اس قصہ میں نہ تو حاشیہ آرائی کی گئی ہے اور نہ نمک مرچ لگائی گئی ہے البتہ میں نے سوسائٹی کے عمرہ اور مروجہ الفاظ میں اس قصہ کو بیان کر کے اسکا زور کم کر دیا ہے۔ محبت کی یہ داستان الفت کا یہ کارنامہ اور حشمت کی یہ پانڈاری کوئی شاعرانہ سحر طرانی نہیں بلکہ یہ بالکل حقیقی چیز ہے اس کا اثر اپنے اصلی اور صاف رنگ میں صرف اُن غیبی لوگوں میں پایا جاتا ہے جنکو ہم غیر تعلیم یافتہ اور وحشی کہتے ہیں۔ ذرا ہم لوگوں کو تو دیکھو کہ ہم لوگ اپنے کو تعلیم یافتہ کہتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ گمراہ نہیں کہتے! میں تم سے اتنا کرتا ہوں کہ اس قصہ کو غور سے پڑھو۔ آج میری طبیعت میں سکون ہے اس واسطے کہ میں آج یہ قصہ لکھتا رہا اور تم خود میری تحریر سے اندازہ کر سکتے ہو کہ میں روز کی طرح آج پریشان خاطر نہیں ہوں۔ ولعلہ! اس قصہ کو پڑھو اور بار بار پڑھو۔ یہی تمہارا دوست کی بھی کہانی ہے۔ میری حالت بھی بالکل اس قصہ کی طرح رہی ہے اور رہے گی لیکن میں اس عزیز اور بہت سخت سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے ہچکچاتا ہوں کیونکہ اسکی حرکت اور غم کا آدھا حصہ بھی محمد میں نہیں۔

۵ ستمبر
شارٹ نے اپنے شوہر کو اس قصبہ میں ایک خط بھیجا تھا جہاں وہ کسی کام کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ وہ خط اس طرح شروع ہوا تھا۔ میری جان سے زیادہ عزیز بھتیجی جلدی ممکن ہو چلے آؤ۔ میں سیکڑوں پیسے آرزوؤں اور ہزاروں میناب تمناؤں کے ساتھ تمہاری منتظر ہوں۔ اسی روز ایک صاحب البرٹ کا یہ پیغام لائے کہ چند وجوہ کی بنا پر وہ اب بھی واپس نہیں آ سکتا اسلئے شارٹ کا خط بھیجا نہیں گیا اور اسی روز شام کو میرے ہاتھ لگا۔ میں اُسے پڑھ کر مسکرا دیا جب شارٹ نے مجھ سے مسکرانے کی وجہ دریافت کی تو میں بول اٹھا کہ "تخیل بھی فطرت کا کیسا عجیب عطیہ ہے۔ میں تو خط دیکھ ایک لمحہ تک یہی سوچتا رہا کہ یہ خط مجھ ہی کو لکھا گیا ہے"

اس پر وہ کچھ ناراض سی ہوئی اور میں خاموش ہو رہا۔

۶۔ شارلٹ کے ساتھ پہلی بار جس نیلی کوٹ کو پہن کر میں نے رقص کیا تھا اُس کی جدائی مجھ پر بہت شاق گذری لیکن اب میں اس کو پہن بھی نہیں سکتا۔ البتہ میں نے اب ایک نئی کوٹ بالکل اُسی طرح کی سلوائی ہے جس کا کالر اور آستین بالکل اُسی کے مشابہ ہیں۔ نئی واسکٹ اور بتون بھی ویسا ہی ہے لیکن اس نئی کوٹ سے نہ معلوم میرے اوپر پہلی کوٹ کا سا اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے آئندہ چلکر میں اس کوٹ کو زیادہ پسند کرنے لگوں۔

۱۲۔ شارلٹ کئی روز سے موجود نہیں تھی وہ البرٹ سے ملنے گئی تھی۔ آج اُسکی اوپر پزل اُس سے ملنے گیا وہ سب سے استقبال کے لئے کھڑی ہو گئی اور میں نے بھی اس کے ہاتھ کو بڑے شوق سے بوسہ دیا۔ اتنے میں جزیرہ کیری کا ایک طوطا جو آئینہ کے اوپر بٹھا تھا وہاں سے اُڑ کر شارلٹ کے کاندھے پر بیٹھ گیا۔ شارلٹ نے اسکو کاندھے پر سے اتار کر ہاتھ پر بٹھایا اور بولی کہ ”لو یہ ایک نیا ساتھی ہے۔ ایک صاحب نے بچوں کے واسطے تحفہً بھیجا ہے۔ ذرا دیکھو تو کتنا پیارا ہے۔ جب میں اس کو کھلاتی ہوں تو وہ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا ہے اور خوب چمکتا ہے اور مجھے بوسہ بھی دیتا ہے ذرا دیکھو۔۔۔۔۔!“

یہ کہہ کر وہ اس طوطے کو اپنے چہرہ تک لے گئی یہاں تک کہ اُس نے اپنی خوشنما چونچ سے شارلٹ کے دونوں لبوں کو اتنے شوق سے دبایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو بھی لطف آ رہا ہے۔ اس طوطے کو میری طرف بڑھا کر اُس نے کہا کہ یہ تم کو بھی اسی طرح بوسہ دلیگا۔ یہ کہنا تھا کہ اُس کی چونچ اُس کے نازک لبوں سے میرے لبوں تک بڑھی اور اس وقت کا احساس نہ پوچھو! گویا یہ احساس کسی آنے والی خوشی کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا کہ صرف ایک بوسہ سے اُس کی بھلا کیا سیری ہوگی۔ اس کو خوراک کی ضرورت ہے اور اس قسم کے بے معنی پیار سے اُس بیچارہ کا کیا پیٹ بھرے گا! اس پر شارلٹ بولی نہیں

نہیں وہ میرے منہ میں سے کھاتا ہے اور یہ کہہ کر اُس نے اپنی زبان نکالی جس پر کچھ دانے نظر آتے تھے۔ پھر وہ بڑے ناز و انداز سے اس طرح مسکرائی جیسے کوئی کسی معصوم بستی کے دامنِ محبت کی ہوا پا کر مسکراتا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے اپنا رخ پھیر لیا کیونکہ میرے سامنے اس کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا اور نہ اس قسم کی معصومانہ اداؤں اور مسرتوں کا جلوہ دکھا کر میرے تخیل کو چھیڑنا چاہئے تھا اور نہ میرے دل کو اُس نیند سے جگانا چاہئے تھا جس میں وہ زندگی کی بے قدری اور بے وقعتی کا خواب دیکھ رہا تھا مگر سوال یہ ہے کہ آخر اُس کو کیوں نہ ایسا کرنا چاہئے تھا؟ اسلئے کہ وہ خوب جانتی ہے کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔

۱۵ ستمبر
وہ لہلہ اس خیال سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو ان چند چیزوں کی قدر نہیں کر سکتے جن میں واقعی زندگی کی قیمت پوشیدہ ہے۔ تم کو مقامِ س کے اخروٹ کے درخت یاد ہوں گے جس کے نیچے میں شارلٹ کے ساتھ اس وقت بیٹھا کرتا تھا۔ جب میں بڑھے پادری سے ملے جاتا۔ وہ درخت کتنے شاندار تھے اور اُن کے نظارہ سے میرا دل بار بار مسحور ہوا۔ وہ درخت اپنی پھیلی ہوئی شاخوں سمیت پادری کے مکان کے صحن کی زینت تھے اور دل کو کتنی تازگی بخشتے تھے۔ اُن کے دیکھنے سے اُس بڑھے پادری کی یاد آتی جس نے اسکو سالہا سال قبل لگایا تھا۔ قصبہ کا اسکول ماسٹر بھی اُس پادری کا نام اکثر لیتا ہے جبکو اُس نے اپنے دادا سے سنا۔ وہ پادری واقعی ایک اچھا آدمی رہا ہوگا اور پرانے درختوں کے نیچے میں اکثر اکیلی یا احترام کے ساتھ تازہ کرتا ہوں۔ کل اسکول ماسٹر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے اطلاع دی کہ وہ درخت کاٹ دیئے گئے ہیں اور جرے کاٹ دیئے گئے ہیں۔ مجھے یہ سنکر اتنا طیش آیا کہ اُس حالت میں مجھے وہ بد بخت شخص ملتا جس نے اس پر پہلی ضرب ماری ہے تو میں اُسکو نہ روکا۔ لیکن اب لیا کہ یوں سوا سے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ اگر میرے مکان کے سامنے ایسے درخت ہوتے اور اُن میں سے ایک پرانا ہو کر خشک ہو جاتا تو میں اُس کی جدائی میں حل کھول کر دیتا۔ ہاں اگر کچھ تسلی ہے تو فقط اتنی بات سے ہے (اور یہ چیز غایب خیال پرستی ہے،

کہ سارا قصبہ ان درختوں کی جدائی پر غلگین ہے اور میرے خیال میں پادری صاحب کی بیوی کو جلد قصبہ والوں کی طرف سے ہر قسم کے تحفہ تحائف بند ہو جانے کی شکل میں معلوم ہو جائیگا کہ اُس نے یہ حرکت کر کے قصبہ والوں کے دلوں پر رنج و غم کا کتنا زبردست آلا چلایا ہے۔ یہ سارے کیرتوت اُسی پادری کی بیوی کے ہیں جو آج کل یہاں پادری ہے۔ وہ درختوں کا لگانے والا بیچارہ بڑھا پادری تو مدت ہوئی اس عالم فانی کو خیر باد کہہ چکا۔ یہ پادری کی بیوی طولِ خدا و نزا جسم رکھتی اور دنیا والوں سے بے پروائی برتنے میں بالکل حق بجانب ہے اسلئے کہ دنیا والے بھی اُس کو کب خیال میں لاتے ہیں اس پر اس احمق کو تو دیکھو کہ وہ اپنے کو بڑی عالم فاضل سمجھتی ہے اور مذہبی کتا بولیا پر جرح کرتی ہے اور عیسائیت کی اخلاقی و عقلی اصلاح کی جو ہوا چلی ہے اُس میں خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑاتی ہے اور جب لاواٹر کے جوش و خروش کا ذکر ہوتا ہے تو اُس پر برہم ہوتی ہے۔ اُس کی محنت خراب ہو چکی ہے اس لئے اسکو دنیا کی بات میں لطف نہیں آتا یقیناً ایسا ہی شخص میرے درختوں کو کاٹ سکتا تھا اور میں تو اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ ذرا اس کے بے معنی وجوہ کو تو سنو۔ وہ کہتی ہے کہ پتیوں کے گرنے سے سامنے کی ساری جگہ گندی اور نرم ہو جاتی تھی۔ شاخوں سے روشنی رکتی تھی اور جب اخروٹ پکے تھے تو لڑکے اُن پر ڈھیلا مارتے تھے، اولاس تمام شور و شغب سے اُسکے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا تھا جس سے اُس کے دماغ کی یکسوئی میں اس وقت خلل پڑتا جب وہ کہنی کوٹ، سیلر، اور مائیکینس کے مابین موازنہ کرتی۔ قصبہ کے سارے لوگ خاصکر بوڑھے اُس کی اس حرکت سے بہت ناخوش ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جب لوگ اتنا ناخوش ہیں تو پھر اُس کو کاٹنے ہی کیوں دیا گیا۔ اس پر لوگ بولے کہ ہم گالوں کے عزیز کسان گر جا کے میجر کے حکم پر کیا چون چرا کر سکتے تھے۔ لیکن ایک چیز خوب ہوئی یعنی گر جا کے میجر اور پادری (جس نے سوچا تھا کہ اپنی بیوی کی تلون مزاجی سے فائدہ اٹھائے، دونوں نے طے کیا تھا کہ درخت کی لکڑی آپس میں بانٹ لیں گے مگر حکومت کے محکمہ مال کو اسکی خبر لگ گئی

لے جان لاواٹر (۱۸۰۱-۱۶۴۱) فخرِ نوری میں پادری تھا اور آخر عمر تک عیسائی مذہب پر کتنا ایس لکھتا رہا۔ پادری جوش مقرر اور صاحبِ قلم تھا اس کے بعض مضامین مذہبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا کر گیا تھا۔ مذہب کے ساتھ ساتھ علم و تہذیب کا بڑا مہر تھا۔ اور اس سلسلہ میں اسکی جو تصنیف ہے اس میں ایک باب گوتے کا لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے

اوس نے اس زمین کے متعلق جس پر یہ دونوں درخت کھڑے تھے اپنا پرانا دعویٰ پھر تازہ کیا اور ان درختوں کو نیلام کر دیا۔ وہ درخت اب تک اُسی جگہ پڑے ہوئے ہیں۔ اگر میں بادشاہ ہوتا تو میں ان سبھوں کی خوب خبر لیتا۔ یعنی پادری۔ منجر اور محکمہ مال کی کیا میں نے بادشاہ کا لفظ اپنے لئے استعمال کیا؟ لیکن اگر میں بادشاہ ہوتا تو مجھے کانٹوں کے درختوں کا خیال بھی نہ ہوتا۔

۱۰ اکتوبر

بس میری ساری خوشی اسکی سیاہ اور سیلی آنکھوں کو دیکھنے میں ہے۔ مگر مجھے جس بات سے تکلیف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لمبڑ اتنا خوش نہیں ہے جتنا۔ کہ اسکو خیال تھا۔ یا جتنا میں خوش ہوتا۔ اگر۔۔۔ مجھے آخر ان دفعوں سے کیا مطلب! مگر میں یہاں کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتا اور شاید میں یہاں کافی کھل کر لکھ گیا ہوں۔

۱۱ اکتوبر

میرے دل میں اب بجائے ہومر کے اوسیان نے جگہ لے لی ہے۔ دنیاے شاعری کا وہ نامور شخص مجھے اپنی سحر طراز شاعری سے معلوم نہیں کس کس عالم کی سیر کرتا ہے۔ دشوار گزار جنگلوں میں پھرنا جہاں سخت طوفانی ہوائیں چل رہی ہوں اور جہاں چاند کی مصیبی روشنی میں ہم کو اپنے آبا و اجداد کی روحیں نظر آتی ہوں یا پہاڑ کی چوٹیوں سے پانی کی موسلا دھار بارش میں غاروں سے بلند ہونے والے نالوں کو سننا یا دوشیزہ کے اُس نوحہ و ماتم پر کان دھنا جسکو اپنے بہادر اور جانناز عاشق کی سبز پوش قبر پر کرتے کرتے وہ دنیا سے کوچ کر گئی ہو، یہ سب نیرنگیاں اوسیاں ہی میں ملتی ہیں۔ جب میں اُس سفید بالوں والے مغنی سے ملتا ہوں تو وہ وادی میں گھوم گھوم کر اپنے آبا و اجداد کے نقش قدم تلاش کرتا ہے لیکن افسوس اسکو بجائے نقش قدم کے ان کی خاک کا ڈھیر ملتا ہے۔ پر شور و سرور کی موجودگی کے نیچے ڈوبنے والے زرد چاند کو ٹھنکی باندھ کر دیکھنے سے اُس کو اگلے زمانہ کا خیال آتا جب خطرہ کی آمد لوگوں کو بہادر بنا دیتی تھی۔ اور چاند کی وہ روشنی بھی کیسی پر کیف ہوتی جو اُس کشتی پر پڑتی جو مال غنیمت سے لدی ہوئی

کہ گھٹے لاما کا بڑا دوست تھا۔ اسکو معروف ہے بھی کچھ سیاحی اور ان مغموں پر اس کی تصانیف ہیں۔

فتح کی خوشی میں لہروں پر اچھلتی ہوئی چلی آتی تھی۔ جب میں اُس کے چہرہ پر تفکر اور حزن کے شدید آثار پاتا ہوں یا میں اُس کی شان و شوکت کو داما ندہ اور خستہ ہو کر فنا ہوتے اُس وقت دیکھتا ہوں جب وہ اپنی محشوقہ کے ساتھ عنقریب اختلاط کرنے کی اُمید میں ایک نواسے سینہ تاب سے اپنے عشق کی حرارت کو تازہ کرنا چاہتا ہے اور پھر سر دھڑی اور لمبی گھاسوں پر نظر ڈال کر جو بہت جلد اس کو زمین میں چھپا دیں گی چیخ کر کہتا ہے کہ مسافر آئیگا، وہ آئیگا جس نے میرا حسن دیکھا ہے اور پھر پوچھے گا کہ معنی کہاں ہے؟ فنگل کا وہ نامور فرزند کہاں ہے؟ مگر بجائے مجھ کو پانے کے وہ میری خاک پر چلے گا، مجھ کو تلاش کرے گا اور نہ پائے گا، تو میرے دوست! یہ سب دیکھ کر میرا جی ہی چاہتا ہے کہ کاش ایک سچے بہادر اور شریف سپاہی کی طرح میں اپنی تلوار کھینچ سکتا اور شاہزادہ کو زندہ موت کی طوالت اور دردناک خستگی سے نجات دلاتا اور خود اپنی روح اس جلیل القدر ہستی کی پیر وی کے لئے آزاد کرنا جسکو میرے ہاتھوں نے معیبت سے چھڑایا ہے۔

۱۹ اکتوبر

افسوس! خالی — میرا سینہ مجھے خالی معلوم ہوتا ہے بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک بار بس صرف ایک بار میں اُس کو سینہ سے لگا لیتا تو یہ ہیبتناک خلا بھر جاتا۔

۲۴ اکتوبر

ہاں ولہلم! مجھے یقین ہے اور روز بروز میرا یقین بچتہ ہوتا جاتا ہے کہ ہستی خواہ کسی کی بھی ہو بالکل بے سود ہے۔ ابھی ابھی شارلٹ کی ایک دوست اُس سے ملنے آئی تھی میں اس وقت پاس والے کمرہ میں چلا گیا اور ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ پڑھنے میں میری طبیعت بالکل نہیں لگتی تھی میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں دونوں کی گفتگو سنتا جاتا تھا۔ دونوں معمولی معمولی چیزوں کے متعلق گفتگو کرتی رہیں۔ زیادہ مضمون قصبہ سے متعلق تھا۔ یعنی ایک کی نشاندہی ہو رہی ہے دوسرا بیمار ہے اور بہت بیمار ہے، تیسرے کو خشک کھانسی آتی ہے اور اُس کا چہرہ روز بروز دہلا ہوتا جاتا ہے اور اکثر دورہ بھی ہوتا ہے۔ شارلٹ بولی کہ ”ہاں ان بھی بہت بیمار ہے“ اس پر اس عورت نے کہا کہ ”اب تو اُسکے بازو بھی سوج آئے ہیں یہ باقی شکر میرا

تیز پرواز و تخیل مجھے فوراً بیماروں کی چار پائیوں کی طرف لے گیا جہاں میں ان ناتوانوں کو درد اور کرب کی حالت میں موت سے کشتی لڑتے دیکھتا رہا۔ مگر دلہلم، یہ عورتیں ان سب باتوں کا ایسی سادہ دلی سے ذکر کرتی ہیں جیسے کوئی کسی اجنبی کی موت کا حال بیان کرے۔ جب میں اس کمرہ کے چاروں طرف جہاں میں اسوقت بیٹھا ہوا ہوں، دیکھتا ہوں اور سامنے شارلٹ کے کپڑے، البرٹ کی تحریریں اور سارا اثاثا البیت یعنی قلمدان تک جس کو میں اسوقت استعمال کر رہا ہوں، دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میرا اس خاندان سے کیا تعلق ہے، تو میرے دوست یقین مانو میں ان چیزوں کی خوشی اور مسرت کو اگر ان چیزوں کا خوش ہونا ممکن ہے، بڑھاتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل بغیر ان سب چیزوں کے حرکت نہیں کر سکتا لیکن اسکے باوجود مان لو اگر میں مر جاؤں یا ان چیزوں کے درمیان سے ہٹا دیا جاؤں تو وہ کیا میری جدائی محسوس کرینگے اور آخر کب تک میری عدم موجودگی کا خیال کرینگے، آخر کب تک؟ ہاں انسان کی ناتوانی اور یکسی کا یہی حال ہے کہ جہاں اُس کو اپنی ہستی کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے یا جہاں وہ سب سے قوی اور استوار اثر ڈالتا ہے خواہ وہ اُس کے معشوقہ کے دل اور حافظہ ہی پر کیوں نہ ہو، وہاں اسکو فنا کا جام پینا پڑتا ہے اور جلدی پینا پڑتا ہے۔

۲۰ اکتوبر
کاش میں اپنے سینہ کو چیر کر دکھا سکتا کہ ہم لوگ، ایک دوسرے کے جذبات پر بالکل اثر نہیں ڈال سکتے۔ اگر مجھ میں فطری طور پر عشق و محبت، عیش و عشرت، انبساط و مسرت کے جذبات حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کوئی شخص ان چیزوں کو مجھ میں پیوست نہیں کر سکتا اور اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ میرا دل محبت و رافت کے پرتو سے چمکتا ہو مگر میں اس حرارت کو کسی ایسے شخص کے اندر نہیں داخل کر سکتا جس کو فطرت نے اس سے محروم کر رکھا ہو۔

۲۱ اکتوبر وقت شام
میں اتنی چیزوں کا مالک ہوں لیکن اُس کے عشق نے مجھ پر سب چیزیں حرام کر رکھی ہیں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے لیکن بغیر اُس کے کیا ہے! کچھ نہیں!

سیکڑوں دفعہ میں اُسے سینہ سے لگاتے لگاتے رہ گیا۔ اُف! میری حالت کتنی درذناک ہے کہ میں ایسی خوبصورت بہتی کو اپنے سامنے بار بار گزرتے دیکھتا ہوں مگر اُسے چھو نہیں سکتا حالانکہ چھونا انسان کی جبلت میں بڑی حد تک سرایت کئے ہوئے ہے۔ کیا بچے ہر اس چیز کو نہیں چھوتے جس کو وہ دیکھتے ہیں۔ لیکن میں!

خدا گواہ ہے کہ میں کتنی بار رات کو بستر پر لیٹ کر خیال نہیں بلکہ یہ اُمید کرتا ہوں کہ اب میں دوبارہ بیدار نہ ہوں لیکن صبح کو جب آنکھ کھلی تو وہی بہن وہی آسمان وہی سورج اور وہی جہان دیکھتا ہوں اور پھر اسی بد بختی کی دنیا میں آ جاتا ہوں۔ اگر میں وہی ہوتا تو اپنی بیزارا و رملہ طبیعت کا سارا الزام موسم کی خرابی یا کسی کی ملاقات یا پھر کسی ذاتی ناکامی پر رکھتا اور تب درد و کرب کا یہ ناقابل برداشت بوجھ صرف میری ذات پر نہ پڑتا۔ لیکن افسوس! میں اُس نیز کو اب رنج کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کیونکہ اپنی تمام مصیبتوں اور آفتوں کا ذمہ دار نہا میں ہی ہوں۔ اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ میرا ہی سینہ آج میرے تمام درد و الم کا خزینہ ہے حالانکہ یہی کبھی میری تمام خوشیوں اور مسرتوں کا گنجینہ تھا۔ کیا میں وہی ہوں جو کبھی ہنسیوں سے کھیلتا اور خوشیوں سے دوچار ہوتا اور جس کے قدم کے نیچے شت قطعی اور جس کا دل اتنا وسیع تھا کہ ساری دنیا اس میں سما سکتی تھی۔ لیکن آج یہ بامردہ ہے۔ کوئی جذبہ اس میں روح نہیں پھونک سکتا۔ میری آنکھوں کا دوبارہ بھی بالکل خشک۔ سسکیوں سے میرے احساس کی آبیاری اور شادابی کا دور ختم ہو گیا۔ میری آہیں اب رخ کو بالکل سوخت نہیں کرتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہوں کیونکہ یہ زندگی کا لطف چلا گیا۔ وہ متحرک اور مقدس قوت جو میرے لئے دنیا میں تعمیر کیا کرتی اب بالکل سرد ہو گئی ہے۔ جب میں اپنی کھڑکی سے دور کی پہاڑیاں اور صبح کے وقت راج کو کہہ رہی سے نکلتے اور تاریک اور خاموش عالم کو منور کرتے دیکھتا ہوں یا چشمہ کو نزل

کے درمیان سے جس کی پتیاں جھڑ گئی ہیں آہستہ آہستہ بہتے دیکھتا ہوں یا جب قدرت کی نیرنگیاں اپنے تمام خوبصورت مناظر میرے سامنے پیش کرتی ہیں مگر اس کی دلفریبیاں میرے بجھے ہوئے دل سے شوق اور اضطراب کے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں نکال سکتیں تو اس وقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں گویا ایک سخت دل بے حس اور بے شرم مجرم ہوں جو فطرت کی عدالت کے سامنے کھڑا ہوا ہے اس حالت میں اکثر میں زمین پر جھک کر خدا سے آنسوؤں کے لئے بالکل اسی طرح دعائیں مانگتا ہوں جس طرح ایک ناامید کسان کسی گرم ملک میں اپنی جلی ہوئی کھیتی کے لئے بارانِ رحمت کی خاطر دعائیں مانگتا ہے۔ میرے خیال میں خدا ہماری الحاح و زاری کے بناء پر نہ تو پانی برساتا ہے اور نہ دھوپ کرتا ہے۔ پچھلے دنوں کے خیال سے مجھے بہت پریشانی رہا کرتی ہے کہ آخر کیا سون کیوں اتنا خوش قسمت تھا؟ بات یہ تھی کہ اس وقت میں خدا کی رحمت کا انتظار صبر کے ساتھ کرتا اور اس کی نعمتوں کا صدق دل سے شک کیہ ادا کرتا تھا۔

۸۔ ^{نورنومبر} شارلٹ میری زیادتیوں کی اصلاح بڑی محبت سے کرتی ہے۔ حال میں میں نے معمول سے زائد شراب پینا شروع کر دیا ہے۔ اس پر اُس نے مجھ سے کہا کہ ”دیکھو شراب زیادہ نہ پیو۔ بلکہ شارلٹ کا خیال کرو۔“ جو اب میں نے کہا کہ تمہارا خیال! ایسی نصیحت کی ضرورت ہی کیا تھی کیا میں تمہارا ہمیشہ خیال نہیں کرتا اور سچ پوچھو تو میرے خیالات خود میرے نہیں ہوتے بلکہ تم خود میری زبان بن کر بولتی ہو۔ آج ہی صبح میں اس جگہ بیٹھا تھا جہاں چند روز پیشتر تم گاری سے اُتری تھیں یہ سنکر اُس نے گفتگو کا مضمون فوراً بدل دیا تاکہ میں اس پر زیادہ بات چیت نہ کروں۔ میرے عزیز دوست! میری قوتِ عمل بالکل سرد ہو گئی ہے اور میری حالت یہ ہے کہ میں ہر طرح اُس کے فرمان کا تابع ہوں۔ می بردہر جا کہ خاطر خواہ اوست۔

۹۔ ^{نورنومبر} و ہللم! میں تمہاری دلی ہمدردی اور تمہاری عمدہ نصیحتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر تم سے درخواست بھی کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے خاموش رہو اور مجھے میری مصیبتوں پر چھوڑ دو۔

اپنی سب بختی اور شوریگی کے باوجود مجھ میں برداشت کی کافی قوت ہے تم جانتے ہو کہ میں مذہب کا قائل ہوں۔ میرے خیال میں مذہب ہی ایسی چیز ہے جو کمزور کو قوت، ناتواں کو توانائی، بے بختی اور مصیبت زدہ کو تسلی دیتی ہے مگر کیا مذہب ہر شخص پر برابر برپا اثر ڈالتا ہے؟ اگر اس عالم کی ہمت دہنائی پر غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ سیکڑوں ایسے ہیں جن کے لئے مذہب کا نام بے معنی ہے خواہ اسے سامنے تبلیغ کی جائے یا نہ کیجائے۔ جب یہ حالت ہے تو کیا مذہب میرے لئے بھی ضروری ہے؟ کیا عیسیٰ مسیح کا یہ قول نہیں ہے کہ وہ لوگ مسیحی ہیں جنکو خدا نے میرے سپرد کر دیا ہے؟ تو کیا اس قول کے مطابق میں بھی انھیں کے سپرد کیا گیا ہوں؟ لیکن اس میں آخر کیا ہرج ہے؟ اگر خدا مجھے بجائے عیسیٰ مسیح کے سپرد کر دینے کے اپنے پاس ہی رکھ لے اور میرا دل بھی بعض وقت یہی کہتا ہے۔ دیکھو میرے مطلب کو کہیں غلط سمجھ لینا اور میرے بے ضرر الفاظ سے کہیں مضحکہ نہ اُخذ کر لینا میں اس وقت اپنا پورا دل نکال کر تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں ورنہ میرے لئے خاموشی اور سکوت زیادہ اچھا تھا لیکن میرے خیال میں مجھ کو ایک ایسے مضمون سے کنارہ کشی نہیں اختیار کرنا چاہئے جس سے لوگ اتنے ہی بے خبر ہیں جتنا کہ میں۔ انسان کی تقدیر آخر کیا ہے؟ بس اپنی مصیبت اور تکلیف کا پیمانہ پر کرنا اور اپنی قیمت کئے ہوئے تلخ جام کو حلق کے نیچے اتار جانا یہی اُس کی قسمت ہے اور اگر انسان کی صورت میں خدا نے اس جام کو تلخ بنایا ہے تو میں احمقانہ وقار کے ساتھ اسکو شیریں کہنے والا کون ہوتا ہوں۔ جب میری ہستی کا سارا نظام فنا و بقا کی آویزش کے وقت لرزہ برآمد ہوگا اور جب گذشتہ زمانہ کی برق آسایا مستقبل کی تاریک خلیج کو منور کرے گی اور جب میرے سامنے کی ہر چیز ہلاک اور ساری دنیا ناپید ہوگی تو میں اُس پر خطر لمحہ کے وقت پیچھے ہٹ کر اپنے کو کیوں شرمندہ و خجل کروں۔ کیا یہ آواز کئے میرے خدا ہے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ ایسی عاجز اور ناقص ہستی کی نہیں ہے جس پر بے حد ظلم توڑا گیا ہو اور جو ناگزیر طور پر فقر و ہلاکت میں گرنے والی ہو اور اپنی بے ماگلی اور بے بضاعتی پر کراہ رہی ہو۔ پھر ان الفاظ کو دہرانے سے میں کیوں شرمندہ ہوں اور اس امید پر کیوں نہ خوف کھاؤں جس میں ان لوگوں تک کے لئے خطرہ تھا جنہوں نے آسمان وزمین کو پوٹھا کی طرح استعمال کیا۔

اس کو نہ تو اس کا احساس ہے اور نہ علم کہ وہ ایک ایسا زہر تیار کر رہی ہے جو ہم دونوں کو فنا کر دے گا۔ درجھے دیکھو کہ میں اس زہر کے پیالہ کو جو مجھے تباہ کرنے والا ہے، کس شوق سے پی رہا ہوں۔ اسکی لگاؤ کی نظروں کا جس سے وہ اکثر — اکثر — نہیں، نہیں بلکہ بعض وقت مجھ کو دیکھتی ہے اور اُس کے حسن خلق کا جس سے وہ میرے بے اختیار جذبات کے اظہار کو سنتی ہے اور میری مصیبت پر ہمدردی کرتی ہے آخر کیا مطلب ہے ہلکے جب میں اُس سے رخصت ہو رہا تھا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ ”پیارے درخظر الوداع“۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے پیارے درخظر کے الفاظ سے خطاب کیا اور اسکی یہ آواز میرے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی اور میں نے اُس کو سیکڑوں بار دہرایا اور کل رات کو سوتے وقت تو مختلف چیزوں کا خیال کرتے کرتے میں یکبارگی کہہ پڑا ”پیارے درخظر الوداع“ جب میں ذرا ہوش میں آیا تو میں اپنی حرکت پر خوب ہنسنا۔

میں اب اُسے نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ وہ بالکل میری معلوم ہوتی ہے مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیدیجائے اسلئے کہ وہ دوسرے کی ملکیت ہے۔ اس طرح میں اپنے درد کی کیفیت کو خوشی سے بدل کر رہا ہوں اور اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس قسم کے کتنے متفاو خیالات کو شعر کا جامہ پہناتا۔

وہ میری مصیبتوں سے آگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اور آج تو اُس کی نگاہ میری روح میں پھوٹ ہو گئی۔ میں جب گیا تو وہ تنہا تھی اور خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے جاتے ہی مجھے غور سے دیکھنے لگی لیکن مجھے اس کے چہرہ میں اسوقت نہ تو حسن کی وہ اگلی سی لطافت اور نہ وہ غیر معمولی قابلیت کا جلوہ نظر آیا۔ یہ سب چیزیں گویا اب اس سے رخصت ہو چکی ہیں۔ مگر اس کی ایک چیز نے تو مجھے مار دالا اور وہ اس کی ہمدردانہ اور جہانہ نگاہ تھی۔ کاش اسوقت اُس کے قدموں پر نثار ہونے کے بجائے میں اس کو اپنے پہلو میں لے لیتا اور اُس کی نگاہوں کا جواب ہزاروں بوسوں سے دیتا۔ طبیعت کو ہلانے کے لئے اُس نے بہاؤ بھانا اور نرم اور میٹھی آواز سے خوشگوار سروں کے ساتھ گانا گائے دیکھا

اُس کے لب آج سے قبل شاید ہی اتنے شیریں آواز رہے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لب صرف اس لئے کھلتے تھے کہ پیالوں سے جولاہی ہوتی لقمہ نکلے اُسے جذب کر کے ادا کریں۔ سلف۔ میری اُفت کی پُقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ میں تو آپ سے باہر تھا اور جھک کر میں نے یہ عہد کیا کہ میں ان خوبصورت اور شیریں لبوں کی عفت کو جنکی حفاظت فرشتے کرتے ہیں، اپنے بوسہ سے کبھی داغدار نہ کروں گا۔ میرے دوست! مگر اس کے باوجود میری تمنا ہے کہ — لیکن میرے دل کو شک اور غمزدگی نے گھیر رکھا ہے۔ کاش میں مسرت کا ایک جام پی کر اپنے تمام گناہوں کے کفارہ کی خاطر اس عالم کو خیر باد کہتا! لیکن کون سے گناہوں کی خاطر؟

۲۶ نومبر
اکثر میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ اسے دل! آخر تو ہی تنہا مصیبت کا مارا اور غمگین کیوں ہے؟ حالانکہ خدا کی اور مخلوق بھی ہیں جو خوش ہیں اور تیری طرح تو کسی پر بھی غم کا ایسا پہاڑ نہیں ٹوٹا بلکہ ازان میں ایک قدیم شاعر کے دیوان کا ایک حصہ پڑھ کر اپنے دل کے سوز و گداز کو کم کرتا ہوں۔ اُن مجھے کتنی چیزیں یادداشت کرنی ہیں۔ کیا دنیا میں میرے پہلے بھی آدمی اسی طرح تھکے ہوئے تھے؟

۳۰ نومبر
میں اب پہلا سا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی ہے جس سے طبیعت بد مزہ ہو جاتی ہے اور آج ہی کا واقعہ دیکھو! افسوس! ہماری فقیرا افسوس! انسان کی فطرت! چونکہ بھوک نہیں تھی اسلئے کھانے کے وقت میں دریا کی طرف سیر کو نکل گیا۔ ہر چیز تاریک اور مخمذہ نظر آتی تھی مگر پہاڑ سے نم اور ٹھنڈی پروا ہوا خوب چل رہی تھی۔ میدان پر کالے یا دِل بھی چھائے ہوئے تھے۔ اتنے میں دور فاصلہ پر ایک آدمی بیٹھی پُرائی کوٹ پہنے نظر آیا جو شاید پہاڑوں میں پودوں کی تلاش میں چکر لگا رہا تھا۔ جب میں اُس کے پاس گیا تو وہ پھر کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ کافی قبول صورت تھا اور اُس کے چہرہ پر مستقل فکر کے مگر ساتھ ہی لطف و نفرت کے بھی آثار پائے جاتے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ بال دونوں شانوں پر پڑے ہوئے تھے اور اُس کے کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی درجہ کا

آدمی ہے۔ میرے دل میں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ آپ یہاں کس کام میں مصروف ہیں مگر پھر خیال آیا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔ آخر کار میں نے پوچھ ہی دیا کہ آپ کو کس چیز کی تلاش ہے ایک سر در آہ بھر کر اُس نے کہا کہ میں پھولوں کی تلاش میں ہوں مگر اب تک ایک بھی نہیں ملا ہے میں (مسکرا کر) اب پھولوں کا موسم کہاں؟

اس پر وہ مجھ سے ذرا اور نرم دیکھ ہو گیا اور کہنے لگا کہ پھول تو بہت ہیں اور خود میرے باغ میں دو قسم کے گلاب اور لالہ صحرائی ہیں۔ ان میں سے ایک تو میرے ابا جان نے کہیں سے لا کر دیا تھا۔ دونوں بالکل گھاس کی طرح جتے ہیں۔ اس طرف دو دن سے میں ان کی تلاش میں ہوں مگر نہیں مل رہے ہیں۔ وہاں پر زرد نیلے اور سرخ پھول کھلتے ہیں اور اس پودا کا (اشارہ کر کے) پھول تو بہت خوشما ہوتا ہے لیکن اس وقت تو مجھے ایک بھی نہیں ملتا۔

میں نے اس کا انہماک دیکھ کر معمولی طور پر پوچھا کہ آخر آپ ان پھولوں کو جمع کر کے کیا کریں گے؟ میرا یہ فقرہ سُن کر اُس کے چہرہ پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اپنی انگلی منہ کے سامنے کر کے اُس نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں اسکا راز کسی پر ظاہر نہ کروں۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ میں نے اپنی معشوقہ کو پھولوں کا ایک گلدستہ نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

”ہاں۔ تو پھر“

”نہیں، نہیں، اُس کے پاس بہت کچھ مال و زر ہے اور وہ بڑی مالدار ہے۔“

”کیا اس کے باوجود وہ آپ کے گلدستہ کو پسند کرے گی۔“

”اُس کے پاس جواہرات اور تاج نالٹوپیاں بھی ہیں۔“

”آخر وہ بے کون؟“

”بس اگراسٹیٹس جنرل مجھے رقم ادا کر دے تو میں آج سے ایک دوسرا آدمی بن جاؤں۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب میں بہت خوش و خرم رہتا تھا۔ مگر افسوس وہ زمانہ گزر گیا اور اب۔۔۔ پھر وہ اپنی بیقرار آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

”اچھا تو آپ ایک زمانہ میں بہت خوش تھے۔“

”کاش میں آج بھی ویسا ہی ہوتا۔ میں اس وقت اتنا خوش اور قانع تھا جتنا کہ ایک انسان کو ہونا چاہیے۔“

اتنے میں ایک بڑھیا ہم لوگوں کی طرف آتی ہوئی نظر آئی اور اُس نے آواز دی کہ ہنری، ہنری کہاں ہو۔ ہم لوگ تمہارا بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں، چلو کھانا کھا لو۔ میں اُس بڑھیا کے قریب گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا یہ تمہارا لڑکا ہے۔ اُس نے کہا ہاں، میرا بد نصیب بیٹا یہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے خدانے مجھے سخت اذیت میں ڈال رکھا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس حالت میں وہ کتنے دنوں سے ہے۔ اس پر بڑھیا بولی کہ سکون کی یہ حالت چھ مہینہ سے ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ اب کچھ اچھا ہے۔ سال بھر تک تو وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ ہنکی ہنکی باتیں کرتا اور پاگل خانہ میں پابہ زنجیر تھا۔ اب اتنا ہے کہ وہ کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا۔ لیکن وہ اب سوائے راجاؤں اور رانیوں کے دوسری بات نہیں کرتا۔ پہلے وہ بہت اچھا اور خاموش نوجوان تھا اور میرے خرچ میں بھی کچھ مدد کر دیتا تھا۔ خط بھی اُس کا پاکیزہ تھا لیکن یکایک وہ غمگین رہنے لگا اور کسی بخار کی طرح تیز جذبہ سے مغلوب ہو کر دیوانہ وار پھرنے لگا۔ اور اب جیسا ہے آپ کے سامنے ہے۔ اگر جناب میں آپ سے بتاتی کہ — میں نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا کہ وہ کونسا زمانہ تھا جب وہ اپنی مسرت و شادمانی پر فخر کرتا تھا۔ میرے اس سوال پر وہ بڑے دردمیز لہجہ میں بولی کہ ”جس زمانہ میں اس کا دماغ بالکل بیکار تھا اُسی زمانہ کو وہ مسرت سے تعبیر کرتا ہے اور اُسی زمانہ کی یاد سے ہمیشہ بیقرار ہو جاتا ہے حالانکہ اس زمانہ میں وہ پاگل خانہ میں تھا اور دنیا کی ہر چیز سے بالکل الگ تھا“ یہ سن کر تو میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اُس سے ہاتھ پر کچھ روپے رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔

قصہ کو لوٹتے وقت میں عالم خیال میں اس کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہتا جاتا تھا۔ ”تو تو اتنا مسرور و شادمان تھا جتنا کہ ایک آدمی ہو سکتا ہے۔ اسے دونوں جہان کے مالک، کیا انسان کی قسمت اسی کا نام ہے؟ کیا وہ عقل و شعور جاہل کرنے کے قبل یا کھونے کے بعد ہی خوش رہ سکتا ہے؟ اور بد بخت ہستی! تیری قسمت پر میں تب بھی رشک کرنا ہوں اور تیری فریب خوردہ زندگی

کاشتکاری ہوں۔ تو کتنی آرزوؤں کے ساتھ اپنی شاہراہی کے لئے پھول جمع کرنے جاتا ہے، کب، جاڑے میں اور جب تک پھول نہیں ملے تو تو ملول ہوتا ہے مگر یہ بالکل نہیں سمجھتا کہ جاڑے میں بھی کہیں پھول چھلے ہیں لیکن مجھکو دیکھو، آوارہ اور بیکار پھرتا ہوں، میرا دل اُمید کی چمک سے محروم اور مقصد کی ترپ سے یکسر خالی ہے۔ اسی حالت میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور میں کسی نہ کسی طرح گھر آ کر پڑھتا ہوں لیکن ایک تو ہے کہ گراسٹیٹس جنرل مجھکو رقم ادا کر دے تو تو سوچتا ہے کہ تو ایک دوسرا ہی آدمی بن جائیگا۔ اور خوش و خرم مگر فانی انسان! کون ہے جو تیری مصیبتوں کا سبب اس عالم آب و گل کو ٹھہرائے یہاں اسکا سبب اور ہی کچھ ہے۔ تو نہ خبر رکھتا ہے اور نہ احساس کہ خود تیرے پڑ مرده دل اور پریشان دماغ میں تیرے رنج و مصیبت کا وہ پوشیدہ منبع ہے جس کو تمام دنیا کی طاقتیں تجھ سے الگ نہیں کر سکتیں۔“

اس آدمی کے مرنے پر کسی قسم کا غم نہیں کرنا چاہئے جو کسی بیمار کے اس دور دراز اور صحت بخش سفر پر ہنستا ہے جہاں وہ بیچارہ جا کر ایک زیادہ سخت بیماری میں مبتلا ہو کر تلخی موت کا شکار ہو جاتا ہے اور اسی طرح اس شخص کی موت پر بھی کوئی افسوس نہیں ہونا چاہئے جو ایک نا اُمید گناہگار کے سفر اماکن مقدسہ کا مضحکہ اڑاتا ہے جسکو اس بیچارہ نے اپنی روح کی بدبختی اور شکستہ حالی کو کم کرنے اور اپنے ضمیر کو سکون پہنچانے کی خاطر سے اختیار کیا ہے۔ اسکا ہر قدم جو ناہموار اور غیر پا مال راستہ پر پڑ کر اس کے پاؤں میں جھالے پیدا کرتا ہے واقعتاً اس کے زخمی دل پر مرہم کا کام کرتا ہے اور کئی دن کے سفر کی شنگی اور داماندگی سے اُس کی بیفراور و مضطرب روح کو منزل کا سا آرام ملتا ہے۔ اور غرور و دلنڈہ سے جینے والے لوگو! کیا تم اس کو جوش و خروش سے تعبیر کرو گے؟ ارے جوش! خدایا تو میرے آنسوؤں کو دیکھتا ہے تو نے ہماری قیمت میں غم لکھ دیا ہے تو کیا ساتھ ساتھ اسکی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے بھائی بند بھی ہمارے درد رسیدہ دلوں پر چرکے لگائیں؟ ہم کو تسلی اور دلجمعی سے باز رکھیں اور تیرے اور اہتمام سے اور تیری محبت اور رحمت سے بالکل بیگانہ کر دیں۔ جڑی بوٹیوں میں شفا کی قوت کا اعتقاد یا تاک و پناہ میں مشورہ کا اعتبار اگر تیری ذات کا جس نے

ہمارے گرد و پیش کی تمام چیزوں میں شفا کی قوت بخشی ہے! اقرار نہیں تو اور کیا ہے؟ اے میرے باپ میں تجھے بھول گیا ہوں لیکن ایک زمانہ تھا جب تو میری روح میں بسا ہوا تھا اور اب مجھ سے کنارہ کشی کر رہا ہے۔ مجھے اپنے پاس پھر بلا لے اور اب زیادہ سکوت و خاموشی اچھی نہیں۔ دیکھ تیری خاموشی سے تیرے تشنگان دیدکھی باز نہیں آئیں گے اور ایک نہ ایک دن سرفراز ہونگے کون باپ ایسا قسّی القاب ہے جو اپنے بچہ کے معافی مانگنے پر بھی قناعت کا اظہار کرے ورنہ خالی کہ اُس کا بچہ اگر کہے کہ اے میرے باپ! میں پھر تیرے پاس آ گیا ہوں اور مجھے معاف کر اگر میں اپنے مقررہ وقت سے پہلے آ گیا ہوں۔ دنیا ہر جگہ ایک ہی سی ہے۔ وہی آسمان زمین۔ وہی تکلیف و آرام وہی محنت و ندامت، مگر آخر دنیا ان سے کہا فائدہ اٹھاتی ہے؟ میں اسی میں خوش ہوں جس میں تیری خوشی ہے اور تیرے ساتھ رہ کر میں ہر آرام و تکلیف میں راضی ہوں۔ اے میرے آسمانی باپ! تو کیا تو ایسے بچہ کو اپنی بارگاہ سے نکال دینگا؟

یکم دسمبر

دلہنم میں نے جس آدمی کے متعلق نہیں لکھا تھا وہ وہی آدمی ہے جو اپنی مصیبت میں قابلِ رشک ہے اور جو شارلٹ کے باپ کا سکریٹری تھا۔ اُس کے دل کو بھی شارلٹ کے عشق نے اندر ہی اندر جلا ڈالا اور جب اس کی بوجھیلی تو وہ بیچارہ اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ جب اس سیدھے سادے قصہ کو پڑھنا تو خیال کر لینا کہ اس واقعہ نے میرے دل پر کیسا اثر ڈالا ہے! اس واقعہ کو مجھ سے البرٹ نے نہایت ٹھنڈے دل سے بیان کیا کیلئے ٹھنڈے دل سے؟ جس ٹھنڈے دل سے کہ تم بھی اسکو بوٹے دھو گے۔

۴ دسمبر

ذرا میری طرف بھی توجہ کرو۔ میرا کام بالکل تمام ہو گیا۔ اب میں اس حالت کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ آج میں جب شارلٹ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ بڑے جوش کے ساتھ پیانو پر مختلف دلفریب سروں کو چھیڑ رہی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن میری گود میں اپنی گڑیا کو کپڑے پہنا رہی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے میں جبکہ کر بار بار اُسکی شادی کی انگوٹھی کو دیکھتا رہا مگر میرے آنسو

بدستور بہتے رہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے اپنا خاص لاہوتی نغمہ چھیڑا جس نے بارہا جھکے سکو کیا ہے عہد ماضی کی یاد سے جب میں اس نغمہ سے آشنا تھا البتہ کچھ تسکین سی ہوئی مگر ساتھ ہی مجھے اپنی بخت کی ساری نارسائیاں اور ناکامیاں بھی یاد آگئیں جن سے مجھے اُس زمانہ سے آج تک برابر سابقہ پڑ رہا ہے۔ میں اُٹھا اور اُٹھ کر کمرہ کے اندر جلدی جلدی ٹٹلنے لگا۔ میرا دل اس وقت درد آمیز جذبات سے معمور تھا۔ آخر کار میں بڑے شوق کی حالت میں اُس کے پاس گیا اور التجا کی کہ خدا کے واسطے وہ نغمہ اب مت چھیڑو یہ سن کر اُس نے بیالوجانا تو بند کر دیا مگر میری طرف غور سے دیکھنے لگی اور ایک ایسی مسکراہٹ سے جو میرے دل کے پار چلی گئی، کہنے لگی کہ ”در نظر تم ہمارا معلوم ہوتے ہو کیونکہ تمہاری عزیز ترین غذا آج تم کو ناپسند معلوم ہوتی ہے۔ اچھا جاؤ اور اپنی طبیعت کو بحال کرو“ اس پر تو میں نے اپنے کو نوچ لیا اور کہنے لگا ”خدا یا! تو میری مسیبتوں سے خوب واقف ہے ان کا خاتمہ بس تیرے ہی ہاتھ ہے“

۴ دسمبر
اُس کی شکل ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ سوتے جاگتے غرض ہر حال میں میری روح اُسی کے تصور میں گم رہتی ہے۔ جیسے ہی کہ میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں میرے دماغ میں جو بینائی کے تمام اعصاب کام کر رہے اُس کی سیاہ چٹنوں کا عکس نظر آتا ہے اس جگہ میں اس کیفیت کو خاطر خواہ بیان نہیں کر سکتا لیکن آنکھیں بند کرتے ہی اُس کی آنکھیں میرے سامنے آ جاتی ہیں۔ اُف، وہ آنکھیں جو گہرائی کی طرح سیاہ ہیں، جب مجھ پر پڑتی ہیں تو میرا سارا ہوش و حواس اور صبر و قرار لجاتی ہیں۔

انسان، وہ فخر کرنے والی مغرور ہستی آخر کیا چیز ہے؟ کیا اُس کی قوتیں ٹھیک اُس وقت ناکام نہیں ہو جاتی جب کہ اُن کی اس کوشاں ضرورت ہوتی ہے؟ کیا انسان کی زندگی کی رفتار خواہ وہ عیش و نشاط کے عالم میں ہو یا قعر غم کے پھیڑے کھاتا ہو، محدود نہیں ہے۔ اور جب وہ اپنے زعم میں حقیقت لا متناہیہ کی طرف بڑھتا ہے تو کیا اُس وقت وہ اپنی روزمرہ اور بے سوز زندگی کے احساس پر مجبور نہیں ہوتا؟۔

مؤلف کا خطاب ناظرین سے

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم کو اپنے دوست کی عجیب و غریب زندگی کے آخری ایام کے صحیح واقعات خاطر خواہ نہ مل سکے اس لئے مجبوراً ہم کو اس کے خطوں کا سلسلہ توڑ کر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سلسلہ وار تفصیل سے کام لینا پڑا۔ ہم نے اُس کو اپنا فرض سمجھا کہ جو لوگ دیکھتے خوب واقف رہے ہوں اُن سے ملکر صحیح صحیح واقعات معلوم کریں۔ قصہ سیدھا سادہ ہے اور تمام بیانات سوائے چند غیر ضروری تفصیلوں کے مل جاتے ہیں لیکن اس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ جن لوگوں سے یہ واقعات ملے ہیں اُن کی سیرت کے متعلق آراء کا اختلاف ہے۔ اب ہم کو صرف ان واقعات کو منج و عن بیان کر دینا ہے جن کو ہم نے محنت اور جانفشانی سے جمع کیا ہے اور ساتھ ساتھ مرحوم کے ان خطوں کو بھی شائع کرنا اور ان کی معمولی سے معمولی تحریروں پر بھی خاص توجہ کرنا ہے اس لئے کہ ایسے لوگوں کے صحیح اور اصلی منشور کو معلوم کرنا جو طبقہ عوام سے تعلق نہیں رکھتے بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔

درحقیقہ کی روح میں رنج اور اضطراب نے اپنا نشیمن بنا کر رفتہ رفتہ اُس کی خصلت کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اُس کے دماغ کا توازن بالکل بگڑ گیا تھا اور ایک دائمی مضطربانہ کیفیت اور دماغی ہیجان نے اس کی طبعی قوتوں کو کمزور کر کے اس پر اتنا اندوگیاں اثر ڈالا تھا اور اس کو اتنا ضعیف و ناتواں کر دیا تھا کہ وہ بیچارہ اپنے ضعف کا بہ نسبت پہلے کے نہایت تکلیف دہ ارادہ کے ساتھ مقابلہ کرتا جیسا کہ اُس نے شاید اپنی بد بختیوں کا مقابلہ بھی نہ کیا ہو۔ اسکے دماغی تفکرات نے اُس کی بہت سی نیک خصلتوں کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ بہت جلد ہی غلبہ اور اداس رہنے لگا۔ اس کی مصیبتوں میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے وہ بھی اپنے خیالات میں ملوث اور اپنی طرف سے بے انصاف ہوتا گیا۔ کم سے کم البرٹ کے دوستوں کی یہی رائے تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس عرصہ میں البرٹ کی سیرت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا اور اب بھی وہ ویسا ہی تھا جس کو درحقیقہ شروع شروع میں پیارا کرتا تھا اور جس کی ابتدا سے عزت کرتا تھا۔ شارلٹ پر اسکی خدا کردی

کا وہی حال تھا اور اس پر وہ نازاں تھا اور اس بات کا متمنی تھا کہ ہر شخص شارلٹ کو احسن المعالومات میں شمار کرے۔ اس صورت میں کیا البرٹ اپنی طرف سے ہر شبہ کو دور کرنے کی خواہش کے یا اپنے مال غنیمت میں دوسرے کو دم بھر کے لئے اور وہ بھی نہایت معصومانہ طور پر شریک نہ کرنے کے الام کا طمع قرار دیا جاسکتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ البرٹ ورنفر کی موجودگی کے وقت اپنی بیوی کے کمرہ سے اکثر اٹھ جاتا تھا لیکن یہ فعل کسی قسم کے بغض یا نفرت پر مبنی نہ تھا بلکہ اس خیال سے تھا کہ کہیں اس کی موجودگی ورنفر پر گراں نہ گذرے۔

شارلٹ کا باپ جو علالت کی وجہ سے مکان کے اندر ہی رہتا قرب وجوار میں تفریح کے لئے شارلٹ کے واسطے کاڑھی بھیجتا۔ اس روز موسم غیر معمولی طور پر سخت خراب تھا اور تمام طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ دوسرے روز صبح کو ورنفر شارلٹ کے یہاں گیا تاکہ اگر البرٹ موجود نہ ہو تو وہ شارلٹ کو گھر پہنچا دے۔ موسم کی عددگی نے اُس کے درد بھرے دل پر بہت کم اثر ڈالا۔ اُس کی روح گویا کسی بارگراں کے نیچے دبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ غم و اندوہ نے اُس کی ہستی کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ اُس کے دماغ میں سوائے الم آمیز خیال کے اور کوئی تغیر ہی نہیں ہوتا تھا چونکہ اندرونی سکون اُس سے غنقا ہو گیا تھا اس لئے تمام ذی روح اشیاء اس کے لئے ایک دائمی اضطراب اور تکلیف کا منبع بن گئیں تھیں۔ وہ اپنی بابت خیال کرنے لگا کہ میں نے البرٹ اور اس کی بیوی کی مسرور اور شاد کام زندگی میں رخنہ ڈالا ہے اور یہ سمجھ کر گو اُس نے خود بچی ملاحت کی مگر ساتھ ہی اُس کے دل میں البرٹ کی طرف سے نفرت بھی پیدا ہو گئی۔

ورنفر اکثر اسی قسم کے خیالات میں گم ہو جاتا اور وہ اپنی ناخوشی کو چھپائے بغیر اس بات کا زبانی اس طرح اعادہ بھی کرتا کہ یہاں یہ میری نازک والہانہ محبت اور میری پر متانت شیفنگی کا بدلہ ہے! میری آنکھیں آخر کیا دیکھتی ہیں؟ کچھ نہیں مگر سیری ولا پروائی۔ حقیقت یہ ہے کہ معمولی معمولی واقعہ بھی اُس کو اس کی حسین و دلربا بیوی سے زیادہ مسخو کرنا ہے۔ کیا وہ اپنی مسرتوں اور شادمانیوں کی قدر کرتا ہے؟ کیا وہ شارلٹ کی اتنی ہی قدر کرتا ہے جتنے کی وہ مستحق ہے ہاں یہ بیشک صحیح ہے کہ شارلٹ اس کی ہے میل کو جانتا ہوں اور میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں

اور میں تو اب اس خیال کا عادی ہو گیا ہوں کہ وہ یا تو مجھے پاگل بنا دے گا یا مجھے مار ڈالے گا۔ کیا اس کی دوستی میرے ساتھ اب بھی بے داغ ہے؟ کیا شارلٹ سے میری محبت کو وہ اپنے حقوق کی پامالی سے تعبیر نہیں کرتا اور شارلٹ سے میرے مراسم کو اپنے حق میں ایک خاموش سزائش تصور نہیں کرتا؟ میں جانتا ہوں اور واقعی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا اور میری عدم موجودگی کا خواہشمند رہتا ہے اس لئے کہ میری موجودگی اُس کے لئے بہت نفرت انگیز ہے۔ شارلٹ کے پاس جاتے ہوئے وہ اکثر راستہ میں کھڑا ہو جاتا، کھڑا ہو کر کچھ سوچتا اور واپسی پر کمر بستہ نظر آتا مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ چلا جاتا۔ اس قسم کے خیالات اور خود کلامیوں میں غرق ہو کر جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح بے اختیار اس شکار گاہ والے مکان تک پہنچ جاتا۔ ایک دفعہ جب مکان میں داخل ہو کر اُس نے شارلٹ کو دریافت کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سارے مکین نہایت بدحواسی اور پریشانی کی حالت میں ہیں سب سے بڑے لڑکے نے آکر اطلاع دی کہ والہاٹم میں ایک سخت حادثہ پیش آگیا ہے۔ یعنی ایک شخص کو کسی نے مار ڈالا ہے لیکن درخت پر اس خبر کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا کہ وہ داخل ہوا۔ اُس نے شارلٹ کو اپنے باپ کے ساتھ بحث کرتے ہوئے پایا جو باوجود اپنی ناتوانی اور ضعف کے موقع واردات پر تفتیش کے لئے جانے پر مصر تھا بلکہ لاپتہ تھا اور مقتول اپنے درخت سے اُسی روز صبح کو مردہ پایا گیا۔ شبہ بہر حال ہر طرف جاتا تھا۔ مقتول ایک بیوہ کا ملازم تھا اور اس سے قبل جو شخص اس جگہ پر کام کرتا تھا وہ برخاست کر دیا گیا تھا۔

درخت پر واقعہ کو سنتے ہی کہنے لگا کہ ”آیا یہ ممکن بھی ہے؟ میں خود موقع پر جاؤں گا اور ایک منٹ کی بھی دیر نہ کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ فوراً والہاٹم کی طرف روانہ ہو گیا واقعہ کی ذرا ذرا سی تفصیل معلوم کرنے کے بعد اُس کو ذرا بھی شبہ نہیں رہا کہ قاتل وہی شخص ہے جس سے اُس نے اکثر باتیں کی ہیں اور جس کا اُس کے دل میں بڑا احترام تھا وہ نیبو کے مشہور درخت کے پاس والے راستہ سے اُس مکان پر گیا جہاں مقتول کی لاش لیجائی گئی تھی اور اُس جگہ کی یاد سے اُس کے دل میں جذبات کا سخت طوفان برپا ہو گیا۔ وہ جو کھٹ جہاں ہمسایوں

کے بچے اکثر آکر کھیل کر رہتے تھے اب خون سے رنگین ہے۔ محبت اور وابستگی جو فطرت انسانی کے اعلیٰ اور شریفانہ جذبات ہیں، افسوس ان کو قتل و جفا کاری کا جامہ پہنا دیا گیا؛ سامنے کے بڑے بڑے عالیشان درخت ٹھنڈے ہو کر رہ گئے تھے۔ پتیاں جھڑ گئی تھیں اور پرانے گر جا گھر کے چاروں طرف جو جھاڑیاں تھیں افسوس وہ بھی مرجھا کر خشک ہو گئیں۔ قبروں کی سنگیں لوہیں کھڑکی سے صرف آدمی نظر آتی تھیں اور آدمی برف سے ڈھکی تھیں۔

جب درختہ سرا یا مہمان خانہ کے پاس گیا جس کے قریب سارا مقبرہ جمع تھا تو یک بیک بڑے زور کی چیخ بلند ہوئی اور مسلح کسانوں کا ایک جھگڑا مٹا ہوا نظر آیا۔ اس وقت ایک عام غوغا بلند ہوا کہ ملزم گرفتار ہو گیا۔ درختہ دیکھنے لگا اور اُس کو دیر تک شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ دیکھتا کیا ہے کہ ملزم وہی نوکر ہے جو پہلے اس بیوہ پر عاشق تھا اور جس کو اُس نے بار بار پھرتے ہوئے دیکھا تھا جس سے وہ مل بھی چکا تھا۔ اُس کے چہرہ پر دے ہوئے غصہ اور نامرادی اور مایوسی کی علامت جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں صاف نمایاں تھی۔ درختہ نے اس قیدی کی طرف بڑھ کر پوچھا کہ اے بد نصیب آدمی! تم نے آخر کون سا جرم کیا ہے جو اس قید و بند میں گرفتار ہو؟ قیدی نے اپنی نظر خاموشی سے اس کی طرف پھیر کر نہایت سکون خاطر سے جواب دیا کہ اب اس کے ساتھ کوئی بھی شادی نہیں کرے گا اور نہ وہ کسی سے شادی کرے گی۔ قیدی اُس سرا میں محفوظ طریقہ سے بند کر دیا گیا اور بعد ازاں درختہ بھی وہاں سے چلا آیا۔

اس دل ریش واقعہ کی وجہ سے درختہ کے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور اب تک اپنی تمام گرد و پیش کی چیزوں سے اُس کا جو غم انگیز، ترش رویانہ اور کچھ بے پروائی کا انداز تھا وہ جاتا رہا۔ اس قیدی کے لئے اُس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اُس کو بہر صورت بچانے کی ایک ناقابل اظہار فکر و انگیز ہوئی۔ آخر اس قیدی کی حالت زار پر اُس کو اتنا ترس آیا کہ وہ اُس کے جرم کو قابل عفو سمجھنے لگا اور اپنی حالت کو اُس کی حالت سے اتنا مشابہ پایا کہ اس کو اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ وہ ہر شخص کو اُس کی رہائی کے معاملہ میں اپنا ہم خیال بنا سکتا ہے اب اُس کے دل میں عدالت میں جواب دہی کا خیال آنے لگا اور اس موقع کے لئے اُس نے

ایک پرزور تقریر بھی تیار کرنا شروع کر دی اور جب وہ شکار گاہ والے مکان کی طرف جاتا تو زور زور سے اس تقریر کو دہراتا جو وہ جج کے سامنے کرنے والا تھا۔

اپنی آمد پر اُس نے البرٹ کو اپنے سامنے پایا اور اس پر وہ کچھ ہراسیمہ سا ہوا مگر اُس نے فوراً اپنی خاطر جمع کر کے جج کے سامنے اپنی راس کا اظہار بڑے جوش و سرگرمی کے ساتھ کیا۔ دوران تقریر میں جج شک و شبہ کے انداز میں سر ہلاتا جاتا تھا۔ گو کہ درحضر نے ملزم کی طرف سے جوابدہی کی بحث نہایت جوش اور استقلال سے کی لیکن جج پر زیادہ اثر نہیں ہوا اس کے برخلاف وہ برابر درحضر کو بیچ بیچ میں ٹوٹتا جاتا کہیں بحث کرتا اور ایک قاتل کا وکیل بننے پر کہیں کہیں اُس کو ڈانٹ بھی دیتا اور بعد کو تو اُس نے کہا کہ اگر اس واقعہ کی مثال لی جائے تو گویا ہر قانون توڑا جاسکتا اور حفظ عامہ کو بالکل نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں ایسے معاملہ میں خود میں بغیر اپنے اوپر بڑی بھاری ذمہ داری لئے ہوئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بہر حال ہر کارروائی اپنی اپنی جگہ ہوگی اور جو ضابطہ ہے پورا کیا جائیگا۔ درحضر نے اس کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور جج سے اپیل کرنے میں یہاں تک التجا کی کہ وہ مجرم کے فرار ہونے میں چشم پوشی کرے۔ لیکن یہ درخواست فوراً رد کر دی گئی۔ البرٹ نے اس بحث میں حصہ لے کر جج کی راس سے اتفاق کیا جس پر درحضر کو سخت غصہ آیا اور اس حالت میں جبکہ جج نے متعدد بار کہہ دیا تھا کہ ملزم کا پچنا محال ہے، باہر نکل آیا۔ جج کے اس حکم پر اُس کو جو انتہائی صدمہ ہوا اُس کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے جو اُس کے کاغذات میں ہم کو دستیاب ہوئی ہے اور جو واقعی اس موقع پر لکھی گئی۔

”او بدبخت ہستی! تیری جان نہیں بچ سکتی۔ مجھے صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ ہم لوگوں کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔“

مجرم کے بارے میں البرٹ نے جج سے جوابات کہی ٹوٹائی سے درحضر آگ بگولہ ہو گیا اور اس پر بار بار اُس کے دل میں خیال آتا کہ اس میں کہیں خود میری شخصیت پر چھپا ہوا حملہ نہ ہو حالانکہ غور و خوض کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی کہ البرٹ اور جج کی راس بالکل صحیح

تھی۔ مگر درحقیقہ اس کو تسلیم کرنے میں ابتدا درجہ پس پیش کرتا تھا۔ البرٹ کے رویہ پر درحقیقہ کے راسے ایک تجربہ کی صورت میں اُس کے کاغذوں میں ملی ہے۔

”میرے بار بار کہنے سے کہ وہ بہت اچھا اور نیک آدمی ہے آخر کیا فائدہ ہے؟ وہ میرے لئے اب بلائے جان ہو گیا ہے۔۔۔ اور اب میں اُس کے حق میں منصف مزاجی سے کام لے ہی نہیں سکتا۔“

موسم سرما میں ایک دن شام کو جب برف پگھل رہی تھی تو شارلٹ اور البرٹ مکان والیس آ رہے تھے۔ شارلٹ برابر اپنے ادھر ادھر دیکھتی جاتی تھی۔ گویا درحقیقہ کی عدم موجودگی اس پر گراں گذر رہی تھی۔ اتنے میں البرٹ نے درحقیقہ کا ذکر چھیڑ کر اُس کی طبیعت کی بیجا آفتاد کو برا بھلا کہنا شروع کیا اسی سلسلہ میں شارلٹ سے اُس کی نامبارک رعبت کا بھی ذکر کیا اور کہنے لگا کہ اگر درحقیقہ کی تم سے صاحب سلامت ترک ہو جائے تو ہم لوگوں کے لئے بہت بہتر ہے۔ اور شارلٹ! میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اُس کو مجبور کر دو کہ وہ اپنا رویہ تمہاری طرف سے بدل دے اور تمہارے پاس کم آیا جایا کرے۔ تم جانتی ہو کہ یہ دنیا ہے جس کے منہ میں جو آتا ہے بکتا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ ہم لوگوں کے متعلق مختلف قسم کی چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ شارلٹ یہ سن کر خاموش ہو رہی مگر یہ خاموشی البرٹ پر سخت گراں گذری۔ اس کے بعد کم سے کم اتنا تو ضرور ہوا کہ اُس نے پھر درحقیقہ کا کوئی ذکر نہیں کیا اور جب خود شارلٹ نے اُس کا ذکر چھیڑا تو البرٹ نے ٹال دیا یا دوسری دوسری باتیں کہہ کر موضوع گفتگو بدل دیا۔

درحقیقہ نے اس بد بخت مجرم کے بچانے کی جو ناکام کوشش کی تھی وہ گویا چراغ کی آخری جھلک تھی جو بجھنے سے پہلے ہوا کرتی ہے۔ بعد ازاں درحقیقہ پھر اسی طرح مایوسی اور بیکاری کا شکار ہو گیا تا آنکہ یہ معلوم کر کے اُس کو پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کو مجرم کے خلاف شہادت کے لئے طلب کیا جانے والا ہے کیونکہ مجرم نے اپنی مکمل بیگناہی کا دعویٰ کیا ہے۔ اب اپنی گذشتہ زندگی کی ہر تکلیف کے خیال سے اُس کا دماغ پریشان رہتا۔ سفیر کے ہاتھوں اُس نے جو مصائب برداشت کئے اور اس کے بعد پچھتے صدے اٹھائے وہ سب اُس کے دماغ میں تازہ ہو گئے اور اُن کے خیال سے اُس میں قوت عمل بالکل زائل ہو گئی۔ اس طرح عمل کی قوت کھو کر اور زندگی کے معمولی

کاروبار سے بھی یکسر علیحدہ ہو کر وہ اپنے احساس اور اپنی پیاری اور زندہ دل محبوبہ (جس کا سکون خاطر اُس نے خود خراب کیا تھا) کے غم عشق کا شکار ہو گیا۔ زندگی کے اس غیر متبدل دور میں اُس کا پیمانہ غم بھرنے لگا اور اُس کی ساری قوتیں بغیر کسی مصرف اور مقصد کے مضحل ہونے لگیں یہاں تک کہ موت نے اندوہ ناک طور پر اسکا خاتمہ کر دیا۔

چند خطوط سے جو اُس نے چھوڑے ہیں اور جو یہاں مندرج ہیں اُس کے دماغ کی پریشانی اور اُس کے عشق کی گہرائی کا کافی ثبوت ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے شکوک، اُس کی شکشاں اور زندگی سے اُس کی بیزاری کا پتہ بھی چلتا ہے۔

۱۲ دسمبر

پیارے ولیم۔ میری مہتی اب مثل اُن بدبخت لوگوں کے ہو گئی ہے جو سمجھتے ہیں کہ کوئی خبیث روح اُن پر سوار ہے۔ بعض وقت مجھے سخت اذیت ہوتی ہے لیکن کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی ناقابل اظہار اندرونی احساس کی بدولت جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل کو دباے ہوئے ہے اور میری سانس کو روکے ہوئے ہے۔ اس حالت میں میں راتوں کو اس طوفانی موسم کے باوجود باہر نکل کر ٹہکتا ہوں اور اپنے چاروں طرف ڈراؤنے اور خوفناک مناظر دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کل رات کو میں باہر گیا تھا۔ برف بھی اتنا گا پگھلنے لگی تھی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ دریا بھی بڑھ رہا ہے اور تمام ندی نالے یہاں تک چڑھے ہیں کہ والہاٹم کی ساری وادی تہ آب ہے۔ ٹھیک بارہ بجے میں گھر سے نکلا اور نکلتے ہی ایک ہیبتناک نظارہ دیکھا۔ دیکھنا کیا ہوں کہ چاندنی رات میں پہاڑ کی چوٹی سے پھین بھرا پانی بڑے زور شور کے ساتھ نیچے گہرا بہا ہے اور تمام میدان جھاڑیاں درخت اور جنگل اتنے جل تھل ہیں کہ تمیز مشکل ہے اور وادی کا تو یہ حال ہے کہ وہ ایک اچھی خاصی جھیل ہو گئی ہے اور ہوا کے تیز جھونکوں سے اس میں موجیں اٹھتی ہیں۔ جب چاند کاٹے بادلوں کو اپنی روشنی سے منور کرتا اور ساتھ ہی ساتھ جب پانی کا سیلاب میرے پاؤں کے پاس سے ٹکر کر پھین میں بدل جاتا اور شور پیدا کرتا تو میرے دل میں خوف اور خوشی سے ملا جلا احساس پیدا ہوتا۔ اُس وقت میں ہاتھ اٹھا کر بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرف دیکھتا تو دل میں یہی خیال

آتا کہ بس کو دپڑو۔ اس بحرِ ذخار میں اپنے کو ڈبو کر اپنے آلام سے نجات پانے کے خیال کی خوشی میں غھوڑی دیر کے لئے تو میرا سارا ہوش و حواس رخصت ہو جاتا مگر نہ جانے کیوں مسوقت ایسا معلوم ہونے لگتا کہ میں زمین میں گر گیا ہوں اور اپنے رنج و محن کی تلافی کرنے سے مجبور ہوں۔ شاید میرا وقت ابھی پورا نہیں ہوا اور مجھے بھی اس کا احساس ہے۔ ولہلم! اگر میں اپنی زندگی کو کھو کر ان طوفانی موجوں پر ایک ہی دفعہ سوار ہو تا یا ان پر بشور موجوں کو اگلے لگاتا تو کیا میری آزاد شدہ روح کے حصہ میں مسرت اور خوشی نہ آتی؟ بعد ازاں میں نے بعد حسرت ویاس اس دلاویز خط کو بھی دیکھا جہاں شارلٹ اور ہم کافی طور پر ٹھٹھنے کے بعد ایک بید کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ افسوس وہ بالکل پانی سے بھرا ہوا تھا اور میدان کا پتہ بھی میں بے مشکل لگا سکا۔ پھر مجھے شکار گاہ کے مکان کے چاروں طرف والے کھیتوں کا خیال آیا اور خیال آئے ہی اس کا خدشہ بھی ہوا کہ کہیں اس پیر جم طوفان نے اس کیج کو تو نہیں تباہ کر دیا ہے۔ جس طرح کسی قیدی کے دماغ میں گلہ اور گھر کی گذشتہ مسرتوں کی یاد سے ایک فرحت معلوم ہوتی ہے اسی طرح مجھے بھی ان خیالات سے اپنی پچھلی خوشیوں کی ایک ہلکی سی جھلک معلوم ہوئی لیکن میں برخلاف کسی قیدی کے الزام وغیرہ سے بری ہوں۔ ہاں مجھ میں مرنے کی ہمت ضرور ہے۔ شاید مجھ میں — لیکن میں اب تک یہاں ایک گدا سے بینوائی طرح بیٹھا ہوں جو جنگل کی لکڑیاں چین کر اپنا بیٹ پالتا ہے اور اپنی بدبخت زندگی کی رسی کو جس کو وہ ہر وقت کاٹنے کے لئے تیار ہے دراز کرتا جاتا ہے۔

۵ ارمبر

پیارے ولہلم! معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا جاتا ہے۔ میں اب خود بھی اپنی ذات سے متفکر ہوں کیا اس سے میرا عشق خالص پاک اور برادرانہ نہیں ہے؟ کیا میری روح کبھی کوئی جذبات سے ملوث ہوئی؟ لیکن میں ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔ ہاں اے لقنویات شب! ان خاک نژادیوں نے تم کو کتنا سچ سمجھا ہے جو تمہاری مختلف حرکات کو کسی ناقابل تسخیر قوت کا کرشمہ بتاتے ہیں! آج کی رات! آف! میں تو اس کے خیال سے کانپ اٹھتا

ہوں۔ میرا تھ اُس کی گردن میں معانقہ کی حالت میں خم تھا۔ میں نے اُسے خوب گلے لگایا۔ اُن گلابی لبوں کے بے شمار بوسے لئے جن سے بس بس کی آہستہ صدا ٹھکڑا ہٹھکتی تھی۔ اُس کی چشم مست نے تو میرے ہوش و حواس کا بیجانہ لبریز کر دیا۔ خدا یا! کیا شہم کی خوشیاں منانا یا انتہائے شوق میں ان مسرت آمیز لمحات کی یاد تازہ کرنا گناہ ہے؟ شارلٹ! شارلٹ! میں تو اب کہیں کا نہیں رہا۔ میرے تمام حواس جواب دے چکے، میری قوت حافظہ بیکار ہو گئی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں ہیں بیمار بھی ہوں اور اچھا بھی۔ میرے دل میں اب کوئی تمنائیں میرے لئے اب بھلائی اسی میں ہے کہ اس عالم آب و گل کو خیر باد کہوں۔

مندرجہ بالا حالات کے بموجب درتھ نے اس عالم فانی کو چھوڑنے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ شارلٹ کی واپسی کے بعد تو اُس کی تمام آرزوؤں اور تمنائوں کا مرکز بس بھی خیال تھا۔ لیکن وہ سوچتا تھا کہ اس قسم کا کوئی کام کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہئے بلکہ کافی طور پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے تب قدم اٹھانا چاہئے۔ اس کے شکوک اور اندرونی کشمکش کا اندازہ ان چند غیر تاریخ کے رقصات سے ہو سکتا ہے جو اُس کے کاغذات میں ملے ہیں اور اُن سے دلمعلم کے ایک خط کی بول ابتدا ہوتی ہے۔

”اُس کی موجودگی اور مجھ سے اُس کی ہمدردی میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ میرے خشک دماغ سے آنسوؤں کے چند قطرے نکال لیں۔ ایک شخص پردہ اٹھا کر دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بس۔ تو پھر اب کس بات کی دیر یا شبہ ہے؟ شبہ یا دیر شاید اس واسطے ہے کہ ہم کو خبر نہیں کہ بعد کو کیا ہوتا ہے اور وہ بھی اسلئے کہ جا کر واپسی نہیں ہوتی اور جہاں یقین کے بجائے شبہ ہوتا ہے وہاں دماغ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تمام طرف تاریکی اور برہمی ہے“
 غم آلود خیالات کے اثر سے درتھ کی صورت بھی بالکل بدل گئی تھی اور اب اُس کا ارادہ زیادہ مستحکم ہو گیا تھا۔ اس کا کچھ ثبوت اس مبہم خط سے ملتا ہے جس کو اُس نے اپنے دوست کے نام لکھا تھا۔

”وہ کہہ! تم نے جس محبت سے اپنی نصیحت ایسے ٹھیک وقت پر دہرائی ہے اُس کا میں

دل سے شکر گزار ہوں۔ بیشک تم معجز کہتے ہو۔ یقیناً مجھ کو میاں سے چلا جانا چاہئے لیکن میں تمہاری اس تجویز سے کامل طور پر اتفاق نہیں کرتا کہ میں فوراً تمہارے پاس چلا آؤں کم سے کم اتنا تو میں ضرور چاہتا ہوں کہ راستہ میں کچھ سیر و تفریح کرتا ہوا آؤں اس واسطے کہ برابر اگلے پڑنے سے سڑک کچھ اچھی ہو گئی ہوگی۔ میں تمہارے آکر مجھ کو لیجانے کے ارادہ سے بہت خوش ہوا لیکن تم اپنا سفر ذرا دو ہفتہ کے لئے ملتوی کر دو اور میرے دوسرے خط کا انتظار کرو۔ جب تک ایک چیز تیار نہ ہو جائے اُس کو پختہ سمجھنا اچھا نہیں اور دفعہ کے وقفہ سے تو بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ میری والدہ سے جا کر کہو کہ اپنے لڑکے کے لئے دعا کریں اور ان سے میری قسمت کی گردش کچھ ایسی رہی ہے کہ جن کو مجھے سب سے زیادہ آرام پہنچانا چاہئے تھا انہیں کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہے۔ اچھا میرے پیارے دوست الوداع۔ خدا تم کو ہمیشہ اپنے سایہ عاطفت میں رکھے۔ الوداع۔

اُس زمانہ میں شارلٹ کی روح جن بیقراریوں میں مبتلا تھی اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا بہت مشکل ہے اُس کی سیرت کے تمام پہلوؤں پر علم ہونے کے باوجود ان بیقراریوں کی قرار و اجماع حقیقت معلوم کرنا جو اس کے شوہر یا اُس کے دوست کے سلسلہ میں ہی ہوں مشکل ہے۔ اتنا تو بہر حال یقینی ہے کہ اُس نے اپنے حسب استطاعت مستحکم ارادہ کر لیا تھا کہ درخت کو دور ہی دور رکھے اور اگر اس ارادہ میں کچھ کوتاہی ہو بھی جائے تو اس کو اس کے دوستانہ رحم کا نتیجہ سمجھنا چاہئے جو درخت کی تکلیف کے احساس کے بعد کیا گیا ہو یعنی درخت کے لئے شارلٹ کی رائے کی پابندی کرنا سخت مشکل ہوگا لیکن ساتھ ہی ساتھ مختلف اسباب نے شارلٹ کو اپنے ارادہ میں ثابت قدم رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کا شوہر ان معاملات میں بالکل دست اندازی نہ کرتا اور نہ وہ اس کو معرض گفتگو میں لاتی تاکہ اُسکے شوہر پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ اپنے شوہر کی بالکل ہم خیال ہے۔

اُسی روز شام کو کمر سمس سے ایک روز قبل التوار کو درخت پر اپنے دوست کو مندرجہ بالا خط لکھ کر شارلٹ کے مکان پر آیا۔ شارلٹ اُس کو تنہا ملی۔ وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے لئے چند تحفے تیار

تیار کرنے میں مشغول تھی جو کرسمس کے دن اُن لوگوں کو تقسیم ہونے والے تھے درخت پر بچوں کی خوشیوں کا اویز کم سنی کے اُس دور کا ذکر کرنا شروع کیا جب کرسمس کے درخت کی تیاری پر جو پہلوں اور مٹھائیوں سے لدے ہوتے اور جن میں موم بتیاں روشن ہوتیں لوگ خوشیاں مناتے۔ اپنی پریشانی کو چھپانے کے لئے شارلٹ مسکرائی اور بولی کہ اگر تم بھی ٹھیک سے رہو گے تو تم کو بھی تحفے ملے گا۔ اس پر درخت پر بچھا کہ پیاری شارلٹ! ٹھیک سے رہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور میں کیسے ٹھیک سے رہوں اور کیا کروں؟ شارلٹ نے جواب دیا کہ ”جمعات کی شام کرسمس سے پہلے والی شام ہوگی تاہم بچے یہاں موجود ہوں گے اور ہر شخص کو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا جائے گا تم بھی اُس دن آجاؤ مگر پہلے مت آنا“ درخت کے اس پر کچھ کان کھڑے ہوئے شارلٹ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ”دیکھو! پہلے مت آنا اور ایسا ہی کرنا میں تم سے بس یہ عنایت اپنے آرام و سکون کی خاطر چاہتی ہوں۔ ہم لوگ اب اس رویہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے“ شارلٹ نے یہ دیکھ کر کہ ان الفاظ نے درخت کے احساس کو متحرک کر دیا ہے اس کے خیالات کو مختلف سوالات سے دوسری طرف پھیرنے کی کوشش کرنے لگی مگر یہ سب چیزیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پھر درخت بولا کہ اچھا شارلٹ اب میں تمہاری صورت دوبارہ نہ دیکھوں گا۔ ”کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ ہم لوگ ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔ البتہ ہم لوگوں کی ملاقات اب ذرا زیادہ احتیاط سے ہوگی۔ آخر تم دنیا میں ہر اس چیز کے لئے جو تمہیں عزیز ہے اتنی شیفنگی اور الہانہ انداز لائے ہی کیوں؟“ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی کہ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ذرا اپنی طبیعت میں سکون پیدا کرو۔ تمہاری اہلیت تمہاری فہم اور تمہاری خداداد قابلیت تمہارے لئے سیکڑوں ذرائع بہم پہنچائیگی۔ آدمی نجاؤ اور اس محمود محبت کو بھوڑ دو جو تم کو ایک ایسی ہستی سے ہے جو تمہارے اوپر سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔“

اس پر درخت پر اپنے ہونٹ چبا کر شارلٹ کی طرف نہایت اندوہگین انداز سے دیکھنے لگا مگر شارلٹ برابر اُس کا ہاتھ پکڑے رہی اور پھر کہنے لگی کہ ”درخت! مجھ کو بس ایک لمحہ کے لئے چہین لئے رہنے دو کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو اور آپ اپنی قبر کھود رہے ہو تم آخر مجھ سے

کیوں محبت کرتے ہو؟ مجھ ہی سے آخر کیوں؟ اور میں تو دوسرے کی بیوی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا مجھ پر غلبہ نہ پاسکے کی وجہ سے تمہاری رغبت میری طرف اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ورتھر نے اس پر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اُس کو نہایت خشونت اور غصہ کے انداز سے دیکھتا رہا اور بولا ”اچھا ہے! یہ بہت اچھا ہے!! معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب البرٹ نے تم کو پڑھایا ہے۔ یہ واقعی ایک بہت گہری بات ہے“ شارلٹ بولی کہ ”یہ خیال تو ایسا ہے کہ ہر شخص کے دل میں آسکتا ہے۔ اور کیا دنیا میں ایک بھی عورت ایسی نہیں جو آزادی کے ساتھ تم کو خوش رکھ سکے۔ اپنے نفس کو مغلوب کر اور ایک ایسی عورت کی تلاش کرو جو تمہیں خوش رکھ سکتی ہو اور یقیناً مالو کہ تم کو ضرور ایک نہ ایک عورت ایسی مل جائے گی۔ مدتوں مجھے تمہارا بلکہ سب کا خیال رہا ہے مگر تم نے اپنے کو بہت محدود دائرہ کے اندر برسوں سے قید کر رکھا ہے۔ اپنے نفس پر قابو حاصل کرو۔ اور ذرا کوشش تو کرو اچھا کوئی سفر کرو ممکن ہے سفر سے تمہاری مراد پوری ہو۔ سفر میں اپنی محبت کے قابل کوئی ہستی ڈھونڈھو اور تب واپس آؤ اور اس وقت ہم لوگ کامل دوستی اور اتحاد کے ساتھ آئیں میں ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرنے کے لائق ہوں گے۔“ ورتھر نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا کہ ”تمہاری تقریر تو اس قابل ہے کہ استادوں کے فائدہ کے لئے چھاپ دیجائے۔ پیاری شارلٹ! مجھے بس تھوڑا وقت اور دو اور پھر تمام چیزیں ٹھیک ہو جائیں گی۔“ شارلٹ بولی ”چاہے کچھ بھی ہو مگر دیکھو! کمرس کے پہلے مت آنا“

اس کے بعد ورتھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اتنے میں البرٹ آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سرد مہری سے سلام کیا اور دونوں اضطراب کی حالت میں کمرہ میں ادھر ادھر ٹپکنے لگے ورتھر نے معمولی طور پر کچھ بات بھی کی جس کا البرٹ نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ بعد ازاں البرٹ نے شارلٹ سے کچھ خانگی معاملات کے متعلق دریافت کیا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کی ہدایتوں پر عمل درآمد نہیں ہوا ہے تو اُس نے چند الفاظ استعمال کئے جو ورتھر پر بہت شاق گذرے ورتھر جلنے پر تیار ہو گیا مگر اس میں ہلنے کی طاقت نہیں رہی۔ ہر آن اس کی تکلیف اور بیزاری بڑھتی گئی اور اسی حالت میں وہ آٹھ بجے رات تک رہا۔ آخر جب کھانے کیلئے

دستر خوان بچھایا گیا تو اُس نے اپنی چھتری اور لوٹی اُٹھائی لیکن بالبرٹ نے اُس سے رک جانے کو کہا مگر وہ تھوڑے سمجھ کر بالبرٹ محض رسمی طور پر روک رہا ہے اُس کا معمولی شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔
 وہ تھوڑے لمحوں کے مکان آیا اور نوکر سے شمع لے کر تنہا اپنے کمرہ میں گیا۔ کچھ دیر تک بڑی رقت قلب کے ساتھ اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے زور سے رونے لگا اور بعد ازاں اُسی ہیجانی کیفیت میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے وہ بغیر کپڑے اتارے چارپائی پر لیٹ گیا اور پڑا رہا یہاں تک کہ جب نوکر اُس کے کمرہ میں البجے رات کو داخل ہوا تو اُس نے اُسکا جوتا اتارا۔ وہ تھوڑے جوتا تو اوڑھ لیا مگر نوکر سے تاکید کر دی کہ جب تک صبح کو میں نہ بلاؤں تم میرے پاس مت آنا۔

۲۱ دسمبر

دو شنبہ کی صبح کو اُس نے حسب ذیل خط شارلٹ کو لکھا جو اس کی میز کی دکان میں سبجہر اُسکی موت کے بعد پایا گیا اور شارلٹ کو دیا گیا۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کہیں کہیں سے نقل کرونگا کیونکہ چند وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط بھی اسی انداز میں لکھا گیا ہے۔

”شارلٹ۔ لو اب سارا قصہ ختم ہوا جاتا ہے۔ میں نے اب مرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں آج صبح سویرے جبکہ میں تم سے آخری بار ملنے والا ہوں یہ اعلان سمجھ لو جو کہ رادر ٹھنڈے دل سے کر رہا ہوں اور اس میں کوئی رومانی خیال پرستی کا جزو نہیں ہے۔ اے تمام عورتوں کی سردار! جب تم ان سطروں کو پڑھو گی تو اُس وقت قبر کا ٹھنڈا کونا اس بیقرار اور درد مند ہستی کو اپنی آغوش میں لئے ہوگا جو اپنے آخری لمحات میں صرف تم سے ہمکلام ہونے کو دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی سمجھتا تھا میں نے رات بڑی مشکل سے کاٹی بایلوں کہو کہ اچھی طرح گذاری اس لئے کہ اس رات نے مجھ میں غم پیدا کیا اور وہ غم پنپتہ ہوا۔ میں اب مرنے کیلئے بالکل تیار ہوں۔ کل جب میں اپنے کو تم سے چھڑا کر آیا تھا تو میرے ہوش و حواس میں ایک تلاطم برپا تھا۔ میرا دل سخت درد و کرب میں مبتلا تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُمید اور مسرت نے ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور اس وقت میرے جسم زار کو موت کی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بڑی دقت سے اپنے کمرہ تک آیا اور آتے ہی دوزالو ہو گیا اور ذرا نے آخری بار مجھے اپنے آنسوؤں کو بہا کر دل کی جلن کم کرنے کی طاقت بخشی۔ اس وقت میرے

دل میں ہزاروں خیالات اور لاکھوں منصوبوں کی دنیا آباد تھی لیکن آخر کار صرف ایک خیال نے دل پر قبضہ جمایا اور وہ بس مرجانے کا خیال تھا۔ میں سونے کے لئے لیٹا اور صبح کی خاموش فضا میں جب اٹھا تو وہی ارادہ دستور میرے دل میں تھا یعنی موت! موت! یہ ارادہ کسی مایوسی یا نا اُمیدی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے میرے اُس عقیدہ کا کہ اب میرے آلام کا ساغر لبریز ہو چکا اور میرا وقت آگیا اور اب میرا آخری کام یہ ہے کہ میں اپنے کو تم پر قربان کر دوں۔ ہاں شارلٹ! تو میں اسکا اعلان کیوں نہ کروں کہ ہم تینوں میں سے جب ایک نہ ایک کو مرنا ضروری ہے تو پھر درتھر ہی کیونکہ اپنی جان سے گزر جائے۔ پیاری شارلٹ! اس دل نے جس میں غیظ و غضب نے بیجاں رہا کر رکھا ہے اکثر تمہارے شومہر کو، تم کو اور خود اپنے کو قتل کرنے کے مہیب خیال کو راہ دی ہے مگر قرعہ آخر کار نکل ہی آیا گرمی کی خاموشی اور پر فضا شاموں کو جب تم سیر و تقریر کے لئے نکل کر پہاڑوں کی طرف جانا تو تھوڑی دیر کے لئے ذرا مجھ نامراد کی یاد بھی کر لینا اور ساتھ ہی یہ بھی یاد کرنا کہ میں بار بار تم سے ملنے کی خاطر اسی وادی کی طرف سے آتا تھا۔ اس یاد کے بعد پھر ذرا قبرستان کی طرف بھی ایک نظر اٹھا کر دیکھنا جہاں میری قبر ہوگی۔ پھر تمہیں غروب آفتاب کے وقت شفقت کی چمک میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ وہ سبزہ بھی نظر آئے گا جو میری قبر پر لہکتا ہو گا۔ جس وقت میں نے یہ خط شروع کیا تھا میری طبیعت میں بالکل سکون تھا لیکن ان تمام مناظر کے خیال سے میری روح کانپ اٹھتی ہے اور میں بچوں کی طرح بے اختیار روتا ہوں۔“

قریب دس بجے دن کو درتھر نے اپنے نوکر کو بلایا اور کپڑا پہنتے وقت اُس سے کہا کہ چند دنوں میں میں ایک سفر پر جانے والا ہوں اس لئے تم میرے تمام کپڑوں کو تہ کر کے درست کرو۔ سب حساب پیش کرو اور میں نے جتنی کتابیں لوگوں کو دی ہیں مانگ لاؤ اور ان غریب لواحقین کو دو دو مہینہ کی رقم دید و جنکو میں ہفتہ وار رقمیں دیا کرتا تھا۔

اُس نے اپنے کمرہ میں کھانا کھایا اور پھر گھوڑے پر چڑھ کر اپنے کارندہ سے ملنے گیا۔ گیارہ مکان پر موجود نہ تھا۔ پھر وہ باغ میں نہایت متفکر ہو کر ٹہلنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام خیالات پر از سر نو غور کر رہا ہے جو اس کو نہایت تلخ اور الم انگیز معلوم ہوتے تھے مگر بچوں

اسے دیر تک اس حالت میں نہیں رہنے دیا۔ وہ اوجھلے کودتے آگئے اور کہنے لگے کہ پرسوں کے ایک دن بعد ہم لوگوں کو شارلٹ کرسمس کا تحفہ دے گی اور پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ان تحفہ جات کا ذکر کرنے لگے۔ اس پر ورنٹر بلو لاکر کل — اور کل کے بعد اور پھر ایک دن اور، یہ کہہ کر اُس نے بچوں کو پیرا کیا۔ ورنٹر جانے کے لئے تیار تھا مگر چھوٹے بچے نے اُس کے کان میں کچھ کہنے کے لئے اُسے روک لیا اور کہا کہ میرے بڑے بھائیوں نے نئے سال کی آمد میں عمدہ عمدہ تنہیت نامے لکھے ہیں۔ اتنے بڑے!! ایک بابا کے لئے۔ ایک البرٹ اور شارلٹ کے لئے اور ایک آپ کے لئے اور یہ سب نئے سال کی صبح پوش کئے جائیں گے اس بات سے ورنٹر بالکل بیخود سا ہو گیا اور ہر لڑکے کو ایک تحفہ دیا۔ اور ماں اور باپ کے لئے ایک تنہیت نامہ چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور ابیدہ ہو کر وہاں سے چلا آیا۔

پانچ بجے کے قریب مکان واپس آیا اور نوکر کو آگ جلانے کا حکم دیا۔ پھر اُس سے کہا کہ کپڑے اور کتا میں درست کر کے بکس میں نیچے رکھ دو اور اوپر سے کوٹ رکھ دو۔ بعد ازاں اُس نے اپنے شارلٹ والے خط میں حسب ذیل اضافہ کیا۔

”تم اس وقت بھلا میرا انتظار کا ہے کو کرتی ہو گی۔ تم شاید اس خیال میں ہو کہ میں تمہاری رلے پر عمل کرونگا اور کرسمس سے پہلے والی شام تک تم سے نہ ملونگا۔ اے شارلٹ! تم سے یا تو آج ملونگا ورنہ پھر کبھی نہیں! اور اس دن شام کو یہ کاغذ تمہارے ہاتھ میں ہوگا اور اس وقت تم اسے پڑھ کر کانپ اٹھو گی اور اُسے اپنے آنسوؤں سے تر کر دو گی۔ میں بیشک — میں اپنا ارادہ مستحکم کر کے کتنا خوش ہوں!“

اس دوران میں شارلٹ کے دماغ کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ ورنٹر سے آخری گفتگو کے بعد اُسے حسوں ہوا کہ اسے دھڑکی تادریک کر کے نہ صرف اپنے دل کو تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ ورنٹر کو بھی اپنے بھرم میں سختہ بے قرار کیا ہے۔ البرٹ سے باتوں باتوں میں اُس نے کہہ دیا تھا کہ ورنٹر کرسمس سے پہلے والی شام سے قبل نہیں آئیگا۔ اس کے بعد فوراً البرٹ گھوڑے پر سوار ہو کر نواح میں ایک شخص سے ملے گیا جس سے اُس کو کچھ ایسا کام تھا جسکی وجہ سے رات کو وہ گھر واپس نہ آ سکا۔

شارلٹ تنہا بیٹھی تھی اور اُس کے گھر کے لوگوں میں سے کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ تنہائی کی وجہ سے اُس نے اپنے کو بالکل اپنے خیالات کی رومیں ڈال دیا۔ اُسکی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی

نئی جسکی محبت اور وفاداری کا وہ دم بھرتی تھی اور دل سے اس کی گرویدہ تھی اور اُس کے شوہر میں بھی اسکی شادمانی اور مسرت کو پورا کرنے کا خاص ملکہ قدرت نے عطا کیا تھا۔ علاوہ بریں ور تھر بھی اُسے عزیز تھا۔ پہلے ہی دن کی ملاقات سے ان دونوں میں جذبات کی یکسر نئی پیدا ہو گئی تھی جو ہمیشہ ملاقات اور اتحاد سے شارٹ کے دل پر نقش کا لچر بن گئی۔ اُس کی کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ وہ اپنے خیال اور جذبہ کا اظہار ضرور ور تھر سے کرتی اور ور تھر کی عدم موجودگی سے اسکی زندگی میں ایسا خلا نظر آتا جس کو بھرنے واقعی محال معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے شوق سے اس بات کی خواہش کرتی کہ وہ ور تھر کو اپنا بھائی بنا لے یا اُسکو اپنے کسی دوست سے شادی کرنے پر راضی کر لے یا پھر ور تھر اور البرٹ کے باہمی خلوص کو دوبارہ قائم کر دے۔ ور تھر کی شادی کے خیال سے وہ اپنے تمام دوتوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتی لیکن کچھ نہ کچھ قابل اعتراض بات سب میں پاتی جس سے وہ یہ طے نہ کر سکی کہ کس کی شادی ور تھر سے کر دی جائے۔

ان خیالات کے ہجوم میں وہ اس بات کا گہرا مگر مبہم اثر ضرور قبول کرتی کہ اس کی حقیقی مگر ناقابل اظہار مرضی یہی تھی کہ وہ ور تھر کی ہو کر رہتی اور اس خیال سے اُس کے نازک دل پر ایک قسم کی ایسی چوٹ لگتی جو مسرت کی تمام اُمیدوں کا خون کرتی۔ اسی حیسب میں اسکی حالت ناگفتہ بہ ہونی لگتی یہاں تک کہ اسکا احساس دماغی بھی معطل ہو گیا۔

شام کے وقت ساڑھے چھ بجے تھے کہ اُس نے سیڑھی پر ور تھر کے قدموں کی چاپ سنی اور فوراً ور تھر کی آواز پہچان گئی جو پوچھ رہا تھا کہ کیا شارٹ موجود ہے۔ اسکی آمد پر شارٹ کے دل میں خاصی دھڑکن شروع ہو گئی اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دھڑکن پہلی بار ہوئی تھی۔ شارٹ کے لئے اُس وقت اپنے جذبات کی پردہ پوشی کرنا سخت مشکل ہو گیا۔ جیسے ہی کہ ور تھر داخل ہوا شارٹ گھبراہٹ میں بول اُٹھی کہ آخر تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔“

ور تھر۔ ”میں نے زبان ہی کب دی تھی جو نہ آتا۔“

شارٹ۔ ”کم سے کم میری خاطر سے تو میری بات مان لیتے۔ میں تم سے اپنے لئے اور تمہارے لئے دونوں کے لئے کہتی ہوں۔“

جو الفاظ اُس کے منہ سے نکلے یا جو کچھ اُس نے کہا اس کے مطالب سے وہ یکسر بے خبر تھی اُس نے اپنے چند زنانہ دوستوں کو بلایا تاکہ درتھر اور وہ تنہا نہ رہیں۔ درتھر اپنے ساتھ کچھ کتابیں لایا جن کو اُس نے نیچے ڈال دیں اور چند دوسری کتابوں کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ اتنے میں شارلٹ نے کہا کہ میری چند خواتین دوست آتی ہوں گی۔ مگر درتھر کی یہی خواہش رہی کہ وہ لوگ نہ آئیں تو اچھا ہے کبھی شارلٹ کو یہ فکر ہوتی کہ درتھر کی موجودگی میں لو کہ کبھی کسی پاس والے کمرہ میں ضرور موجود ہیں مگر پھر اُس کی رائے بدل جاتی۔ درتھر اس دوران میں بڑی بے صبری کے ساتھ ٹٹلتا رہا۔ اتنے میں شارلٹ پیانو کے پاس گئی اور ارادہ کر لیا کہ وہ پیانو کے پاس سے نہیں اُٹھے گی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر وہ آہستہ سے درتھر کے پاس جا کر بیٹھ گئی جو سوفا پر اپنے معمولی انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔

آہستہ سے بیٹھ کر شارلٹ نے درتھر سے پوچھا کہ کیا تم پڑھنے کے لئے کچھ نہیں لائے ہو۔ درتھر کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر بولوی کہ میری میز کی دراز میں اوسیاں کے چند گیتوں کا خود ڈنڈا کیا ہوا ترجمہ موجود ہے۔ میں نے اب تک اس خیال سے اُسے نہیں دیکھا کہ خود تم پڑھ کر اُسے سناؤ گے لیکن میرا یہ خیال پورا نہ ہو سکا۔ درتھر یہ سن کر مسکرا دیا اور اپنا ترجمہ لینے کے لئے بڑھا۔ مگر اُسکو اُٹھاتے وقت اس کے بدن میں رعشہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور آبدیدہ ہو کر اسکو پڑھنے لگا۔

”او آنے والی رات کے چمکنے والے تارو! تمہاری روشنی مغرب کی طرف کتنی صاف ہے! تم اپنا سر بادلوں سے کتنی اچھی طرح نکالتے ہو اور پہاڑوں پر تمہارے قدم کتنے شاندار طریقہ سے پڑتے ہیں لیکن تم میدان میں آخر کیا چیز دیکھتے ہو؟ طوفانی ہوائیں ساکت ہیں مگر سیلاب کی دھیمی دھیمی آواز دور سے آرہی ہے۔ ممکن ہے پر شور موجیں پہاڑوں اور چٹانوں سے دور ٹکرا رہی ہوں۔ کیڑے مکوڑے شام کے وقت اپنے کمزور پروں سے پرواز میں مصروف ہیں اور ان کی بھنبھناہٹ میدان میں سنائی دیتی ہے۔ اے صاف شفاف تارو! تمہیں آخر کس چیز کی تلاش ہے؟ تم صرف مسکراتے ہو اور مسکرا کر کوچ کر جاتے ہو۔ تمہارے گرد و سمندر کی لمبیں خوش ہو کر آتی ہیں اور تمہارے بالوں کو دھوتی ہیں۔ اچھا او بے زبان کرلو! الوداع! اوسیاں کی روح کی روشنی کو بلند ہونے دو۔

”ہاں یہ روشنی بڑی تیزی کے ساتھ بلند ہو رہی ہے۔ میں اپنے کوچ کرنے والے دوستوں کو

دیکھ رہا ہوں۔ پچھلے سالوں کی طرح لورا پر اٹکا اچھا خاصا مجمع ہے۔ فنگل ایک کمر کی دیوار کی طرح آ رہا ہے اور اُس کے بہادر ساتھی اُس کے ہمراہ ہیں اور بڑھے شاعر ملون کو تو دیکھو۔ اور راتنوبھی کتنا شاندار معلوم ہوتا ہے اور آپن کی آواز بھی کتنی پیاری ہے۔ منونا کی آواز میں کتنا درد ہے سیلما کی دعوت کے زمانہ سے ہم لوگ موسم بہار کے ان جھونکوں کی طرح جو پہاڑ پر چلتے ہیں اور سبزہ کی اوٹھی ہوئی گردنوں کو جھکا دیتے ہیں آپس میں لڑتے چلتے آتے ہیں گرمیرے دوستو اب تم میں کتنا تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

”منونا اپنے حسن دل افروز کے ساتھ آئی تو ضرور مگر اس کا چہرہ غم سے ڈھال تھا اور انگلیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے جو پہاڑ کی طرف سے کثرت سے آتے تھے اُس کے بال پریشان ہو چکے۔ جب اُس نے در دہسے لمحہ میں اپنا نغمہ شروع کیا تو بہادروں کے دل بھی درد سے بھر آئے اس نے سالگرہ کی تاریک قبر بھی دیکھی تھی جو سفید چھاتی والی کو لٹکا مسکن تھی۔ پیاری کو لٹکا باوجود اپنی اچھی آواز کے پہاڑ پر تنہا رہ گئی۔ سالگرہ نے آنے کا وعدہ کیا تھا مگر رات ہو گئی۔ اچھا کو لٹکا جب تنہا پہاڑی پر بیٹھی تھی تو اُس وقت کی اُسکی گیت سنو۔

”رات ہو گئی ہے اور میں بے یار و مددگار اس طوفان زدہ پہاڑ پر تنہا ہوں۔ اُن پہاڑوں پر ہوا کے کتنے تیز جھونکے چل رہے ہیں۔ اور پانی چٹان سے ٹکرا کر کس زور شور سے گر رہا ہے۔ مگر فسون مجھے ان آفتوں سے پناہ دینے کے لئے کوئی جھونپڑا تک نہیں۔ ہاے یہ آندھی اور طوفان اور میری یہ ٹیکسی، اے چاند پھر تو ہی بادلوں میں سے نکل! اور اورات کے تار و ذرات تم بھی اپنی صورت دکھاؤ اور مجھے اس اندھیری جگہ سے نکال کر اُس جگہ پہنچا دو جہاں میرا محبوب شکار کے بعد آرام کر رہا ہے وہاں اُسکی بغیر چلنے کی ہوئی کمان پڑی ہوگی اور اُس کے کتے اُس کے پاس دوڑ دھوپ کے بعد باپ رہے ہوں گے۔ لیکن ہاے میری گردش تقدیر نے مجھے اس چشمہ کے کنارے والے سبزہ پوش

سے اویساں منونا کا ذکر سیلما کی سالانہ دعوت کے سلسلہ میں کرتا ہے۔ اس تقریب کے موقع پر مشہور شعر جمع ہوتے اور فنگل کے سامنے اپنے اشعار پڑھتے۔

یہ شمالی اسکاٹ لینڈ کی زبان میں سالگرہ شکاری کو کہتے ہیں۔

یہ اسی طرح کو لٹکا ایک خوبصورت اور نرم بالوں والی عورت کو کہتے ہیں۔

”اے ہوا ذرا تھوڑی دیر کے لئے ٹک جا! اور اے چستے اپنی روانی بند کر دے تاکہ میری آواز دور تک سنائی دے اور شاید میرا آوارہ و سرگرداں محبوب میری آواز سن لے۔ ارے سا لگ رہا تو نہیں سنتا۔ تیری پیاری کو لما تجملکو پکار رہی ہے۔ یہ درخت ہے اور یہ چٹان ہے اور میرے پیارے سا لگر میں بھی یہاں موجود ہوں۔ پھر آنے میں اتنی دیر کیوں کر رہے ہو۔ دیکھو چاند بھی آہستہ آہستہ نکلتا شروع ہوا ہے جس سے ودای کا سیلاب چمک اُٹھا۔ مگر پہاڑیاں تاریک معلوم ہوتی ہیں۔ اُف مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ افسوس آج اُس کے کتے بھی اُس کے آنے کی خبر نہیں دیتے۔ تو کیا اس بیس ایلی میٹھی رہوں یا۔۔۔۔۔“

156

خاموش ہیں اور اُن کے مٹی کے سینے بالکل سرد ہیں۔ اچھا اگر یہاں نہیں بولتے تو لے اُن کی روح پہاڑی ہی پر سے جہاں ہوا چل رہی ہے کچھ آواز دو، کچھ جواب تو دو۔ میں تمہارے جواب سے بالکل نہ ڈھیل گئی۔ آخر تم کس دنیا میں جا کر مصروف آرام ہو گئے۔ ہاے اس پہاڑ کے کس غار میں ان مردوں کو پاؤں گی۔ فضا میں اس وقت کوئی ہلکی سی آواز بھی تو نہیں سنائی دیتی اور نہ اس طوفان میں کوئی جواب سنائی دیتا ہے۔

”میں اپنے رنج میں بیٹھی ہوں اور رد و رد کر صبح کی منتظر ہوں۔ اے موت کے دوستو! اپنی قبر تو تیار کرو مگر دیکھو اسے اس وقت تک بند نہ کرنا جب تک کو لمانہ پہنچ جائے۔ میری زندگی خواب کی طرح گزر رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم لوگوں سے پیچھے کیوں رہوں۔ اس پر شور چشمہ کے پاس میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ آرام کروں گی۔ جب پہاڑیوں پر رات کا عمل ہو گا اور جب ہوا کے تیز جھونکے چلیں گے تو میری روح نکل کر اس طوفان میں کھڑی ہوگی اور اپنے دوستوں کی موت پر ماتم کرے گی۔ اس ماتم کو شکاری اپنی آرا مگاہ سے سنے گا اور پھر میری آواز پر عاشق ہو جائیگا۔ اس واسطے کہ میرے دوستوں کے لئے میری آواز ہمیشہ شیریں ہوگی۔ کو لمانہ کے دوست کو لمانہ کو کتنے محبوب تھے؟“

”اے تورمان کی شرمیلی لڑکی مینونا! کو لمانہ کی یہی گیت تھی۔ کو لمانہ کے غم میں ہماری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور ہماری روحیں بیچیں ہو گئیں۔ یولن بھی اپنا بربط لئے ہوئے آیا اور آلین کا گانا گانے لگا۔ آلین کی آواز پیاری تھی مگر رائنو تو بالکل آتش نفس تھا۔ دونوں کی آواز بہر حال دور رس نہیں تھیں۔ اس واسطے سیلما کی آواز کے مقابلہ میں ان کی آواز مدہم معلوم ہوتی تھی یولن ایک روز بہادروں کی موت سے قبل شکار سے واپس آیا۔ اُس نے پہاڑی پر ان لوگوں کی لڑائیوں کی خوفناک آواز سنیں ان کے نعرے درد بھرے تھے جن میں مورار کے قتل کا نوہ تھا جو پہلا فانی انسان تھا۔ مورار کی روح فٹکل کی روح کی مانند اور اسکی تلوار اسکی تلوار کی طرح تھی لیکن افسوس وہ لڑائی میں موت کے بچہ ظلم سے نہ بچ سکا۔ اسکے باپ نے اُس پر بہت ماتم کیا اور اسکی بہن کی آنکھیں بھی اُس کے غم میں اشکبار تھیں اور مینونا کا دل بھی غم سے دو نیم تھا۔

اور آنکھیں پر آب ہو کر ماتم کرتی تھیں۔ مگر مینونا یولن کا پرورد ماتم سنا اسی طرح خاموش ہو گئی جس طرح مغرب میں ڈوبنے والا چاند باراں کی آمد پر بادلوں میں اپنا حسین چہرہ چھپا لیتا ہے۔

رات کو کاکیت طوفان باد و باراں گزر چکا اور دوپہر کے وقت فضا میں خاموشی ہے۔ آسمان پر بادل بھی تتر بتر ہیں۔ سبز نگلی پہاڑیوں پر مورچ چمک رہا ہے۔ پہاڑ سے جو پانی گری رہا ہے وہ پہاڑ کی مٹی کی وجہ سے لال ہو گیا ہے۔ اسے اوپر سے گزرنے والے نالے تیری آواز میں کتنی شیرینی ہے لیکن میں جو آواز سن رہا ہوں وہ اس سے شیریں تر ہے۔ یہ آپن کی آواز ہے جو خود نغمہ کا پروردہ ہے اور جو مرے ہوؤں کے ماتم میں مصروف ہے۔ زیادتی عمر کی وجہ سے اسکی گردن جھک گئی ہے مگر اسکی ماتم کمال آنکھ سوز ہے اور ننہوں کے پالے ہوئے آپن! آخر تو اس خاموش پہاڑی پر کیا کیوں گھوم رہا ہے اور جنگل میں ہوا کے جھونکوں کی طرح یا تنہا ساحل پر موجوں کی طرح کیوں مصروف ماتم ہے؟

آپن کے جوابی کیت ”میرے آنسو صرف مردوں کے غم میں بہتے ہیں اور میری آواز صرف آن لوگوں کے لئے وقف الم ہے جو اس عالم فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ تم اس پہاڑی پر اچھے خاصے بھلے آدمی معام ہوتے ہو۔ اور اس وادی کے لوگوں میں خوبصورت بھی۔ لیکن افسوس! تم بھی مولا کی طرح فنا ہو جاؤ گے اور اس وقت لیدہ گہر تماری قبر کے سرھانے بیٹھ کر ماتم کریگا۔ پھر نہ تو یہ پہاڑیاں تمہیں جانیں گی اور نہ تمہاری کمان تمہارے کمرے میں کھلی ہوئی پڑی ہوگی۔

”او مورار! جس طرح جنگل میں ہرنی پھرتی ہے اسی طرح تو جست و جالاک تھا۔ تیری آتش فشاںی الامان! لڑائی کے وقت تیرا غصہ تو بس طوفان تھا اور تیری تلوار صاعقہ بے پناہ تھی۔ تیری آواز پہاڑوں پر پرشوز مالوں کی طرح گرجتی تھی۔ تیرے توانا دست و بازو کے کتنے شکار ہو گئے اور کتنے تیرے غم و غصہ سے جل کر نذر اجل ہو گئے۔ لیکن لڑائی کے بعد تیری ابروؤں پر کہیں بل نہیں ہوتا تھا اور تیرا چہرہ باراں کے بعد آفتاب کی طرح چمکتا تھا یا جس طرح رات کے ستارے میں چاند چمکتا ہے۔ اور تیرا سینہ اس وقت اتنا خاموش ہوتا تھا۔ جیسے کسی پھیل کی سطح ہوا کی غیر موجودگی میں خاموش رہتی ہے۔ مگر او مورار! آج

لہ شمالی اسکاٹ لینڈ کی زبان میں مورار ایک بڑے اور بہادر آدمی کو کہتے ہیں۔

تیرا ممکن بہت تنگ ہے اور تیری جائے سکونت بہت تاریک۔ اسے وہ شخص جس کا کبھی ڈنکا بجنا تھا آج تیری قبر میرے تین قدموں کے نیچے ہے۔ چار کاٹی لگے ہوئے پتھر آج تیری تنہا یادگار ہیں۔ شکاری جب ادھر سے گذرتے ہیں تو ایک سوکھے درخت اور لابی لابی گھاسوں کو دیکھ کر جو ہوا سے ہلتی ہیں مورا لیبی عظیم الشان ہستی کی قبر کا پتہ چلاتے ہیں۔ مورا آج تو زیر خاک ہے اور تیرا سر نگوں سے۔ آج نہ تو تیری ماں ہے اور نہ کوئی تیری معشوقہ جو تجھ پر اشک غم بہائے جس نے تجھ کو پیدا کیا افسوس آج وہ بھی زیر خاک ہے۔ آف یہ کیسا دن ہے کہ مور گلان کی لڑکی بھی آج زندہ نہیں۔“

”بھڑی ٹیکتا بھو! یہ کون آکر رہا ہے؟ یہ کون ہے جس کا سر عمر کی وجہ سے برف کی طرح سفید اور جس کی آنکھیں روتے روتے لال ہیں اور جو ہر قدم پر پتھر پتھر اٹاتا ہے۔ او مورا! یہ تیرا بڑھا باپ ہے جس کے سواے تیرے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اُس نے بار بار لڑائیوں میں تیری بہادری کے افسانے اور دشمنوں کو جگکانے کی اکثر داستانیں سنی ہیں۔ اس نے تیری شہرت اور اوج کا زمانہ بھی دیکھا ہے مگر اس کو تیرے اس آخری زخم کا حال کیوں معلوم نہیں؟ اسے مورا کے باپ بارہ اور ماتم کو گھر کہاں ہے مورا جو تیرا نوہ اور ماتم سن سکے۔ سچ ہے مردوں کی نیند بہت گہری ہوتی ہے اور اُن کا نگینہ خاک کا نگینہ ہوتا ہے۔ اب وہ نہ تو تیری آواز سن سکتا ہے اور نہ تیرے جگانے سے جگ سکتا ہے۔ بھلا قبر کی رات میں کہاں صبح ہوتی ہے جو کوئی سونے والوں کو جگانے! اسے سب سے جو اندھا اور بہادر آدمی اور اسے لڑائیوں کے سوراخاں اوداع۔ تو نے کتنے میدان مارے مگر اب میدان تجھ کو کہاں دیکھ سکے گا اور نہ اب جنگل کے تنگ و تاریک راستے تیری تلوار کی چمک سے منور ہونگے۔ افسوس تو نے کوئی لڑکا بھی نہیں چھوڑا۔ تیرا نام روشن کرنے والا بس یہی گیت ہے۔ آئندہ زمانہ کے لوگ تیرا نام سنیں گے اور اسے مورا یہ بھی نہیں گے کہ تو مر گیا۔“

”ماتم سب نے کیا مگر آرمین کا ماتم سب سے زیادہ پر درد تھا۔ وہ اب تک اپنے لڑکے کی موت یاد کر کے اشکبار ہو جاتا ہے جو اپنے معوالین شباب میں مارا گیا۔ کارمور اس وقت منادی گھل کے پاس تھا اس لئے اس نے ماتم کو رمان سے بہت جواڑھواں کال کر کے اور جبرہ ایوہ کا فرمان روا تھا۔ جبرہ اسکا لینڈ کے چھوٹے چھوٹے مغربی جزیروں میں ایک جزیرہ کے گورنار تھا۔“ کا حکم تھا۔
 اسے شمالی اسکا لینڈ کی زبان میں ایک لائے اور یہ خام آدمی کو کہتے ہیں۔

نے پوچھا کہ آخر آرمیں کو اتنا غم کیوں ہے اور اس ماتم کی کیا وجہ ہے؟ گیت کا تویہ اثر ہوتا ہے کہ اسکی موسیقی سے دل نرم ہو جاتا ہے اور روح کو تسکین ہوتی ہے۔ گیت مثل اس کہر کے ہے جو جمیل سے اُٹھ کر دادی پر چھا جاتا ہے اور تمام ہرے بھرے پھولوں پر شبنم چھڑک جاتا ہے لیکن جب سورج نکلتا ہے تو شبنم غائب ہو جاتی ہے۔ اسے جزیرہ گورما کے سردار آرمیں! آخر تم اتنے غم کیوں ہو؟

"میں بیشک رنجیدہ ہوں مگر میرے رنج کا سبب معمولی نہیں ہے۔ کارمور تم کیا جالو۔ ہاں اگر تمہارا بھی کوئی سخت جگر جان سے ہاتھ دھو تا تو تم کو معلوم ہوتا اور تمہاری کوئی حسین لڑکی نے بھی داغ افراشت نہیں دیا۔ تمہارا کو لگر زندہ اور سلامت موجود ہے اور تمہاری حسین دو فیروزہ انبرا بھی صحیح و سالم ہے تمہارے خاندان کی بیلین برابر چڑھتی جاتی ہیں مگر آرمیں اپنے خاندان کی آخری سانس ہے۔ اسے ڈورا اتیرا بستر تاریک ہے اور تیری قبر کی نیند بہت گہری ہے اور تو کب اپنے لیتوں کو خوش لہجہ میں گاتی ہوئی اُٹھے گی۔ اسے موسم خزاں کی ہوا تو چل اور تمام میدان اور جنگل میں چل۔ اسے پہاڑ کے چشمو تم اپنی روانی دکھاؤ اور اسے طوفان کے جھونکو میرے شاہ بلوط کے درختوں کو ہلا ڈالو۔ اسے چاند تو بھی بادلوں میں آہستہ خراج کر اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنا زرد چہرہ دکھایا کر اور مجھے اس رات کی یاد دلایا جب میرے تمام بچے لڑائی میں کام آئے تھے اور جب حسین ڈورا نا کام رہی اور طاقتور ارندل مارا گیا۔ میری پیاری لڑکی ڈورا! تو اسی چاند کی طرح جو فوراً پر چمکتا ہے حسین بھٹی اور برف کی طرح گوری اور نیم صبح کی طرح شیریں بھٹی۔ اور ارندل تیری کمان مضبوط تھی اور میدان جنگ میں تیرا بھال اتیر تھا اور دریا کی لہروں پر تیری نظر مثل کہر کے پڑتی تھی اور تیری ڈھال طوفانی بادلوں کی طرح سرخ تھی۔ ارمار جو لڑائی میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا آیا اور ڈورا کی محبت کا منتہی ہوا لیکن ڈورا کو انکار کئے ہوئے بھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا اسلئے دوستوں کو ابھی اُمید تھی۔

دور اوڈگل کا لڑکا ایراتھ بھی غم و غصہ سے ملول تھا۔ اُس کا بھائی ارمار کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا۔ وہ ایک علاج کے بھیس میں آیا۔ لہروں پر اس کی چھوٹی ناؤ کیسی خوبصورت تھی۔ امتداد زمانہ نے اُس کے بالوں میں سفیدی اور اس کی ابروؤں میں کون پیدا کر دیا تھا۔ ڈورا کو مخی طب کر کے اُس نے

لے سر و جزیرہ

کہا کہ "اے دنیا کی حسین ترین عورت! اور اے آرمین کی خوبصورت لڑکی! فلاں جزیرہ میں ایک چٹان پر جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے ایک درخت ہے جس کے سرخ پھل دور ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُسے ڈورا! وہاں امارتیرا منظر ہے اور میں اُس کی معشوقہ کو یعنی تجھ کو لیجانے کے لئے آیا ہوں۔ وہ امار کے پاس گئی لیکن وہاں پہنچ کر ڈوراکے آواز دینے پر کسی نے جواب تک نہیں دیا۔ ہاں اُس کی صدا بے بازگشت البتہ لوٹ کر آتی تھی۔ مکارا یریتھ ہنستا ہوا خشکی کی طرف بھاگا۔ اتنے میں ڈورالنے اپنی آواز بلند کر کے اپنے بھائی اور باپ کو پکارا۔ ارنڈل! آرمین! مگر ڈوراکا کی مدد کے لئے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"اُس کی آواز تمام سمندر میں گونجی۔ میرا لڑکا ارنڈل پہاڑی سے نیچے اترا اور شکار کے پیچھے بدحواس ہو گیا۔ اُس کے تیرا اُس کے بھل میں لٹکے ہوئے تھے اور کمان ہاتھ میں تھی اور پیچھے پیچھے پانچ بھروسے کتے تھے۔ اُس نے ایریتھ کو ساحل پر دیکھا اور اسکو پکڑ کر ایک شاہ بلوط کے درخت سے لگا کر ایک مضبوط چمڑے کے تسمہ سے باندھ دیا۔ وہ وہاں بندھا ہوا کرا رہا ہے۔ میرا لڑکا ارنڈل کشتی پر سوار ہو کر ڈورا کو لانے کے لئے جاتا ہے۔ امار بھی غصہ میں بھرا ہوا آتا ہے اور تیر چلا تا ہے۔ اور وہ بدبخت تیرا میرے بچے ارنڈل تیرے سینے میں گڑ جاتا ہے اور تو ایریتھ کے بدلے میں جان دیتا ہے۔ کشتی کا پتو فوراً رک جاتا ہے اور وہ بیچارہ ارنڈل چٹان پر ایک آخری آہ سرد کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ پیاری ڈورا! جب تیرے پانوں کے پاس تیرے بھائی کا خون پڑا ہے تو پھر تیرے غم کا کون حال بیان کرے؟ افسوس تیری کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور امار سمندر میں تجھ کو نکالنے کے لئے یا خود جاں دینے کے لئے کود پڑتا ہے۔ اتنے میں پہاڑی پر سے ایک ایسی ہوا چلتی ہے جس سے موجوں کا زور شور اور بڑھ جاتا ہے اور جس سے وہ بیچارہ ایسا ڈوبا کہ پھر نہ اُبھرا۔

"اس طوفان زدہ چٹان پر تنہا میری لڑکی کی درد بھری آواز سنی گئی اور اس کی چیخ اور پکار کی صدا اکثر بلند ہوتی مگر اس کا بیچارہ باپ کیا کر سکتا تھا؟ تمام رات میں ساحل پر کھڑا رہا اور اُس کو چاند کی ہلکی روشنی میں دیکھتا رہا اور اس کی درد بھری آواز سنتا رہا۔ ہوا بہت تیزی سے چل رہی تھی اور پہاڑی پر بارش بھی بڑے زوروں سے ہو رہی تھی۔ صبح کے قبل اُس کی آواز میں کچھ کمزوری محسوس ہونے لگی اور جس طرح شام کی ہوا ہلکی ہو کر گھاس میں غائب ہو جاتی ہے اسی طرح اسکی آواز بھی غائب ہو گئی۔

رج و غم کے ہاتھوں تباہ ہو کر اُس نے جان دیدی اور مجھ بد بخت کو تنہا چھوڑ گئی۔ اب میری تمام جنگی قوت ختم ہو گئی اور عورتوں میں میرا وقار چلا گیا۔ جب طوفان اٹھتا ہے اور باد شمال موجوں کو سطح سے بلند کرتی ہے تو میں پر شور ساحل پر اس ہلک چٹان کو دیکھ کر اُس گھڑی کو یاد کرتا ہوں۔ اکثر پچھلے پہر کی یاد میں میں اپنے بچوں کی روجوں کو دیکھتا ہوں۔ کبھی صرف انکا آدھا دھڑ نظر آتا ہے اور وہ ماتیانہ انداز میں چلتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے نہیں بولو گی؟ مگر وہ روجیں اپنے باپ کا کچھ خیال نہیں کرتیں۔

یہ سب داستان شکر اپنے قلب حزیں کو تسکین دینے کے لئے جب شارلٹ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے تو درتھر نے بھی اپنا پڑھنا بند کر دیا اور کتاب پھینک دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خود بھی خوب رویا۔ شارلٹ کے ہاتھ میں رومال تھا اور وہ اپنا چہرہ اسی رومال پر رکھے ہوئے تھی۔ دونوں کے دلوں میں اُسوقت درد و کرب کی ٹیس بچھ تھی۔ دونوں نے ایسا محسوس کیا کہ اوسیاں کے بہادر لوں کا حال تو یا اُن دونوں کی کتاب زندگی کا ایک ورق ہے۔ اس چیز سے دونوں بہت متاثر ہوئے اور انکا سیلاب اشک کسی طرح ختم تھا ہی نہ تھا۔ روتے روتے درتھر نے اپنا ماتھا شارلٹ کے بازو پر رکھ دیا۔ اس پر وہ کچھ کانپ سی گئی اور جانے کے لئے تیار ہو گئی مگر رنج اور ہمدردی دونوں کی سل اُسکی چھاتی پر اتنی گراں تھی کہ وہ بل نہ سکی۔ بہر حال تھوڑی دیر میں اُس کی طبیعت سنبھلی اور سسکیاں لیتے ہوئے درتھر سے نہایت درد بھرے لہجہ میں التجا کی کہ خدا! یہاں سے چلے جاؤ۔ درتھر یہ سن کر کانپ اٹھا اور قریب تھا کہ اُس پر اس کی کیفیت طاری ہو اُس نے پھر کتاب اٹھالی اور سسکیوں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا:-

”اے موسم بہار کے جھونکو! تم مجھ کو کیوں جگلاتے ہو۔ تمہاری سنسناہٹ کتنی دلفریب ہے جو مجھ سے زبان حال سے کہتی ہے کہ دیکھ میں تجھ کو آسمانی شبنم سے تروتازہ کرتی ہوں مگر میری نیستی کا وقت جلدی قریب آ رہا ہے اس لئے کہ وہ طوفان جو میری پتیوں کو خشک کر دے گا نزدیک ہے۔ کل مسافر آئیگا اور ضرور آئیگا جس نے میرا حسن دیکھا ہے اور اُس کی آنکھیں میدان میں میری تلاش کر رہی گی مگر مجھ کو نہ پائیں گی۔“

ان تمام الفاظ کا اثر درتھر پر کافی طور سے ہوا۔ نا اُمیدی کے عالم میں اُس نے اپنے آپ کو شارلٹ کے قدموں پر ڈال دیا اور اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں اور پیشانی پر ملتا رہا۔ درتھر کے اس فعل سے شارلٹ کو

درتھر کے ہلکے منصوبہ کا کچھ کچھ گمان گذرا درگمان گذرتے ہی اُسکے ہوش و حواس بجا نہیں رہے۔ اتنے بھی اُسکا ہاتھ تھا اور اپنے سینہ سے خوب دبا کر لگایا اور نہایت جیسا نہ انداز میں اسکی طرف اس طرح جھکی کہ اسکا کال ورتھر کے گال سے چھو گیا۔ اس وقت کچھ اور ہی کیفیت تھی۔ دونوں کی نظر دنیا سے ہست و بود سے بالکل غافل ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گرد و پیش کی ساری چیزیں یک بیک غائب ہو گئیں۔ ورتھر نے اسکو اپنے بازوؤں سے خوب پھینچا اور جی بھر کر گلے لگایا اور اُس کے لہلہ نازک پر صد بابو سے شوق دیئے۔ آخر کار اپنے کو پھیر کر اُس نے دھیمی آواز سے ”ورتھر۔ ورتھر“ پکار کر اپنے کمزور ہاتھوں سے اُسکو علیحدہ کر دیا۔ پھر اُس نے پاکدامنی اور عفت کی مضبوط آواز میں ”ورتھر“ کو پکارا۔ ورتھر نے اسکے چھڑانے میں کوئی عذر بھی نہیں کیا بلکہ اپنے کو اسکے بازوؤں سے علیحدہ کر کے اس کے قدموں پر گر پڑا۔ شارلٹ رنج کی حالت میں اٹھی اور غصہ اور محبت کے مشترکہ لہجہ میں بولی ”ورتھر! یہ بس آخری بار ہے۔ اب ہماری تمہاری ملاقات پھر نہ ہوگی“ پھر اپنے بدبخت عاشق پر ایک آخری درباریانہ نظر ڈال کر وہ پاس والے کمرہ میں چلی گئی اور اندر سے تالا بند کر لیا۔ ورتھر نے اپنے ہاتھوں کو پکایا مگر اسکو روکنے کی جرات نہیں ہوئی۔ وہ قریب آدھ گھنٹہ تک سوفا پر اپنا سر رکھے ہوئے فرش پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ جب اُس نے کسی کی آہٹ سنی تو اپنے ہوش و حواس میں آیا۔ اتنے میں نوکر کمرہ میں داخل ہوا اور ورتھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نوکر کے جانے کے بعد پھر وہ شارلٹ کے دروازہ پر گیا اور آہستہ سے کہا۔ ”شارلٹ۔ شارلٹ! بس ایک لفظ۔ اچھا ہمارا آخری سلام لے لو“ شارلٹ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ رکارہا اور جواب سننے کی کوشش کرتا اور التجائیں اور منتیں کرتا رہا مگر وہاں سب کے جواب میں خاموشی تھی۔

آخر کار اپنے کو نوچتا ہوا وہ باہر نکلا اور پکار کر کہا ”شارلٹ سلام لو، یہ میرا آخری سلام ہے“ وہاں سے نکل کر ورتھر شہر پناہ کے دروازہ پر گیا اور محافظوں نے اُسے پہچان کر خاموشی سے جانے دیا۔ رات بہت تاریک اور طوفانی تھی۔ بارش سخت ہو رہی تھی اور برف بھی گر رہی تھی۔ ورتھر گیارہ بجے اپنے مکان پر پہنچا اور جیسے ہی وہ مکان کے اندر داخل ہوا نوکر نے یہ دیکھ کر کہ ورتھر

سے ان لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۛ وال ایک خامشی مرے سب کے جواب میں ۔

ننگے سر پہ اور ٹوپی غائب ہے کچھ کہا نہیں۔ پھر اُس نے اپنے آقا کے کپڑے اتارے جو بھیگے ہوئے تھے۔ بعد کو اس کی ٹوپی ایک چٹان کے سرے پر پائی گئی جو وادی کے اوپر ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ حقیر اتنی اندھیری اور طوفانی رات میں بغیر اپنی جان کھوئے ہوئے کس طرح اتنی اونچی چوٹی پر پہنچ گیا۔ ورکھ سوئے چلا گیا اور صبح کو دیر تک سوتا رہا جب دوسرے روز صبح کو اس نے نوکر سے قہوہ طلب کیا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ شارلٹ کے خط میں کچھ اضافہ کر رہا تھا جس کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

”آج آخری بار میں نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ شاید آخری بار! افسوس یہ آنکھیں اب قناب کی روشنی کبھی نہیں دیکھیں گی مگر اس وقت تو خود آفتاب ایک کالی گھٹائیں چھپا ہوا ہے۔ ہاں اسے بزم قدرت کے بیٹھنے والو! ماتمی لباس پہن لو اس لئے کہ تمہارا پروردہ، تمہارا دوست، تمہارا عاشق اب اس دنیا سے کوچ کر رہا ہے، اسکا خاتمہ قریب ہے۔ جب میں اس فقرہ کو دہراتا ہوں کہ آج میرا آخری دن ہے تو شارلٹ! میرے اس خیال کی نظیر نہ ہونے کے باوجود مجھے اس وقت گویا ہر چیز خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ آخری دن! شارلٹ کوئی لفظ اس خیال کو خاطر خواہ ادا نہیں کر سکتا۔ آخری دن! — آج میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا ہوں اور کل سرد اور بے جان ہو کر قبر کا کونا آباد کروں گا۔ موت! آخر موت کیا چیز ہے؟ ہم لوگ بات چیت میں اس حالت کا دھندلا سا عکس دیکھتے ہیں۔ میں نے بہتوں کو مرتے دیکھا ہے لیکن ہماری سستی کا طرف اتنا تنگ ہے کہ جگو اپنی ابتدا اور انتہا کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ اس وقت میں آپ اپنا ہوں۔ میری پیاری بالوں کہو کہ میں تمہارا ہوں تمہارا اور اس کے بعد ہم لوگ جدا ہو جائیں گے اور شاید ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ نہیں، شارلٹ نہیں، ہم اور تم بھلا کس طرح فنا ہو سکتے ہیں؟ ہم لوگ تو زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ پھر فنا آخر کیا چیز ہے؟ میرے خیال میں یہ محض ایک بے معنی لفظ اور میکا

صدا ہے جسکا دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوتا مرنا اور قبر کے تنگ و تاریک گوشہ میں لٹایا جانا، شارلٹ! تم سے ایک واقعہ بیان کروں۔ زمانہ عفو ان شباب کی میری ایک دوست تھی جو میرے لئے سب کچھ فنی۔ اُس نے انتقال کیا میں اُس کے جنازہ کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا اور جنازہ قبر میں اتارتے

وقت میں قبر کے کنارے کھڑا تھا۔ جب جنازہ کی رسی اوپر کھینچ لی گئی اور مٹی دیکھنے لگی یہاں تک کہ ساری قبر کھود لی گئی تو میں بے اختیار ہوکرد زمین پر گر پڑا۔ میرا دل اس وقت رنج و غم سے بہت بیقرار تھا اور صد پارہ ہو کر ٹکڑوں کی راہ بہہ رہا تھا لیکن مجھے اسکا مطلق پتہ نہ تھا کہ کیا ہو گیا اور مجھ پر کیا گزرنے والی ہے۔ موت! — قبر! — مجھے معاف کرو میں ان الفاظ کا مطلب سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔ اُن کل کا دل تو میری زندگی کا آخری دن ہونا چاہئے تھا کیونکہ اسے فرشتہ حسن! کل ہی میں نے زندگی میں پہلی بار اپنی روح میں ایک طرح کی خوشی محسوس کی۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے، اسے وہ مجھے پیار کرتی ہے! اور اب تک وہ آگ جو تم نے اپنے لبوں کے ذریعہ سے میرے دل میں جلائی ہے بھڑک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادمانی اور مسرت کا کوئی نیا چشمہ اُبل پڑا ہے اور میری روح کو بہا لے گیا ہے۔ اچھا معافی کا خواستگار۔

مجھے معلوم تھا کہ میں تمہیں عزیز ہوں اور میں نے تمہاری پہلی ہی سحرانہ نظر میں اسکو محسوس کر لیا اور جب تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دیا تو اُس پر گویا مہر بھی ہو گئی لیکن جب میں موجود نہ ہوتا تھا یا جب میں البرٹ کو تمہارے پاس دیکھتا تھا تو میرے دل میں شکوک و شبہات کا کافی گزر ہوتا۔

کیا تم کو وہ بھول یاد ہیں جو تم نے مجھے بھیجے تھے؟ اور کیا وہ وقت بھی یاد ہے جب بھرے مجمع میں نہ تو تم بول سکتی تھیں اور نہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا سکتی تھیں؟ لو تم سے ایک بات کہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں ان پھولوں کے سامنے آدھی رات تک دوڑا تو بیٹھا رہا اور اُن کو تمہاری محبت کا ثبوت سمجھتا رہا لیکن وہ اثرات کم ہوتے گئے اور آخر کار بالکل مٹ گئے۔ دنیا کی ہر چیز فنا ہو جائے تو ہو جائے لیکن قیامت بھی میری محبت کے اس زندہ شعلہ کو نہیں بجھا سکتی جس کو تم نے اپنے لبوں سے کل بھڑکایا ہے اور جس سے اب میری ساری ہستی جل رہی ہے۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے! اور یہ وہ ہاتھ ہے جو اس کی کمر کا حلقہ کرچکے ہیں اور یہ وہ ہونٹ ہیں جو اس کے لبوں سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ اسے وہ میری ہے ہاں شارٹ۔ لوگ البرٹ کو تمہارا شوہر کہتے ہیں۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں؟ ممکن ہے وہ اس دنیا کے لئے تمہارا شوہر ہو اور اس لئے اس دنیا میں تم کو پیار کرنا اور تم کو اس کے بوس و کنار سے ملنے دینا گناہ ہے۔ ہاں بیشک یہ جرم ہے اور میں اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں مگر میں نے اپنے جرم کی پوری لذت اٹھالی ہے۔ میں نے ایک ایسی خوشبو سونگھی ہے جس نے میری مشام جان کو معطر کر کے میری

روح کو از سر نو زندہ کر دیا۔ اُس گھڑی سے شارلٹ تم میری ہو ہاں شارلٹ تم میری ہو۔ میں تمہارے پاس آؤں گا۔ جب میں اپنے اور تمہارے دونوں کے خالق کے سامنے جاؤں گا تو اپنے تمام آلام و مصائب کی داستان و مایہ بیان کروں گا اور جب تک تم وہاں نہ پہنچو گی اس وقت تک اس کی راگہ سے مجھے تسکین عطا ہوتی رہے گی اور جب تم آؤ گی تو تم سے دور کر لیٹ جاؤں گا اور تم پر اپنا دعویٰ کروں گا اور پھر تمہارے آغوش میں ابدی طور پر زندگی گزاروں گا میں کوئی خواہشیں نہ رکھتا ہوں اور نہ ہڑاتا ہوں بلکہ جیسے جیسے قبر کی خاک مجھ سے نزدیک ہوتی جاتی ہے میرے احساسات صاف اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ہم لوگ یقیناً زندہ رہیں گے اور فرورڈ رائے دوسرے سے ملیں گے۔ ہم لوگ تمہاری والدہ مرحومہ سے بھی ملیں گے اور میں تو اُن کو اپنا سارا قصہ سناؤں گا تم اپنی ماں کی بالکل ہمشکل ہو۔“

ابجے کے قریب درخت پر اپنے زبے بچھا کہ کیا البرٹ واپس آ گیا ہے؟ تو کرنے جواب دیا کہ ہاں آ گیا ہے میں نے ابھی اُس کو گیسوٹے پر جاتے دیکھا ہے۔ یہ سنکر درخت پر البرٹ کو ایک کھلی تحریر بھیجی :-
”براہ مہربانی ایک سفر کے لئے اپنا پینٹول عنایت فرمائیے۔ والسلام“

گذشتہ رات کو شارلٹ بہت کم سوئی تھی۔ اس کے تمام احتمالات اس طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آئے کہ وہ نہ تو پیش بینی کر کے ان کو روک سکتی تھی اور نہ اُن سے بچ سکتی تھی۔ اس کا خون اُس کی رگوں میں بڑی سوزش کے ساتھ گردش کر رہا تھا اور سیکڑوں ہزاروں درد بھرے احساسات نے اُس کے عفت مآب دل کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ معلوم نہیں لکڑیہ حالت نتیجہ تھی درخت کے جوش و خروش کے ساتھ ہم آغوش ہونے کا جس کو وہ برابر اپنے دل میں محسوس کرتی رہی یا درخت کی میباکی اور خیر چربی پر اس کو غصہ تھا یا ممکن ہے وہ اپنی موجودہ انسوس ناک حالت کا موازنہ اپنی گذشتہ حالت سے کر رہی ہو جب وہ بالکل معصوم، متین اور خود اعتماد تھی۔ اس حالت میں بھلا کس طرح اپنے شوہر سے وہ اس روز کے واقعہ کی کیفیت بیان کرتی جس کو چھپانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی مگر اس کے باوجود وہ اپنی مرضی سے ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ان دونوں میں مدتوں سے اس قسم کے معاملہ پر کوئی بات چیت ہی نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ سوچتی تھی کہ اس خاموش فضا کو اس قسم کی گفتگو سے کیوں توڑا جائے کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ درخت کی آمد کے صرف ذکر سے کہیں البرٹ کو تکلیف نہ ہو اور میری صاف گوئی

سے اس تکلیف میں زیادتی نہ ہو جائے۔ بلکہ بارئ اس کو خیال ہوتا کہ کاش البرٹ میری اصلی سیرت سے آگاہ ہو جاتا اور میرا فیصلہ بغیر کسی تعصب و کراہ کے کرتا مگر ان سب باتوں کے باوجود کیا اس کو واقعی اس بات کی فکر تھی کہ البرٹ اس کے راز پر اسے نہانی سے باخبر ہو جائے؟ پھر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ کیا وہ ایسے شخص کو دھوکا دے سکتی ہے جو اس کے خیالات کا آئینہ رہا ہو اور جس سے اب تک کوئی بات چھپائی نہیں گئی۔ ان خیالات نے اس کے دماغ کو ہر نشان اور متفکر بنا دیا تھا مگر ساتھ ساتھ درخت پر کھڑا بھی اس کو خیال تھا جواب پیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گیا اور جس کو وہ کسی طرح اپنے عشق سے دست بردار نہ کر سکی حالانکہ اس کو پورا علم تھا کہ درخت پر گرے گا۔ جدا ہو گیا تو نامراد می اور ملیوسی کے عالم میں اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ حال میں البرٹ اور شارلٹ کے درمیان ایک باطنی مغائرت پیدا ہو گئی تھی مگر شارلٹ کی سمجھ میں اس مغائرت کی وجہ اچھی طرح نہیں آتی تھی۔ اس سے اس کو اور بھی سخت سوہان روح ہو گیا۔ پاس پڑوس کے اچھے اور نیک لوگوں نے بھی اس باہمی اختلاف کو بتانے میں پس دہیش کیا ہے اور ان لوگوں کی شکایات پر پردہ ڈالا ہے ہر حال یہ معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ ہوتے ہوئے نزاکت کی اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ سمجھوتہ ہونا ناممکن ہو گیا۔ حالانکہ ابتدا میں محض معمولی گفتگو فریقین میں صفائی کر دینے کیلئے کافی تھی۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے یعنی اگر دونوں کی خانگی زندگی میں اول روز سے اعتماد پیدا ہو جاتا اور محبت و دلجوئی نے یکساں طور پر دونوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہوتا تو آج اس گئی گزری حالت میں بھی معاملہ ہاتھ سے نہ بچل جاتا۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت عجیب و غریب واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی درخت کے خطوط سے اس بات کا اندازہ ضرور لگتا ہے کہ اس نے اس عالم آب و گل کو خیر باد کہنے کے خیال کو کبھی چھپایا نہیں اور اس کو اس نے اکثر البرٹ کے سامنے پیش کر کے اس پر بحث بھی کی۔ البرٹ اور شارلٹ کے درمیان بھی اس مسئلہ پر بارہا گفتگو ہوئی۔ البرٹ اس قسم کے خیال کا اتنا مخالف تھا کہ وہ اکثر نہایت تیزی سے جو اس کی طبیعت میں بہت کم تھی وہ درخت سے کہتا کہ مجھ کو تمہاری خودکشی کی دھمکی میں شک ہے۔ البرٹ نہ صرف ان باتوں پر تہقہہ لگاتا بلکہ شارلٹ کو بھی اس بے سرو پلائی کے یقین کرنے سے روکتا۔ شارلٹ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ جب اس پر الم مسئلہ کا کبھی اس کو خیال ہوتا تو اس کے دل میں اضطراب کے بجائے سکون ہوتا مگر اس نے اپنے شوہر سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کے دماغ میں درخت کی طرف سے البتہ شہادت اکثر پیدا ہوتی ہیں۔

البرٹ جب واپس آیا تو شارلٹ اُسے اسی پریشانی کی حالت میں ملی اور خود البرٹ کا مزاج بھی برقت درست نہیں تھا کیونکہ جس کام کے لئے وہ گیا تھا وہ پورا نہیں ہوا اور ابھی ابھی اس کو معلوم ہوا تھا کہ جس افسر سے اُس کا معاملہ ہے وہ نہایت تنگ مزاج اور تنگ خیال ہے۔ غرض اس قسم کی بہت سی چیزیں ایسی ہوتی تھیں جس سے اُس کا مزاج برہم ہوتا گیا اس حالت میں اُس نے پوچھا کہ کیا میری عدم موجودگی میں کوئی بات ہوئی ہے۔ شارلٹ کے منہ سے جلدی میں نکل گیا کہ ہاں، کل شام کو درخت پر آیا تھا۔ پھر البرٹ نے اپنے خطوط طلب کئے۔ اس پر شارلٹ بولی کہ کچھ پارسل بھی آئے ہیں جو تمہارے کمرہ میں رکھے ہوئے ہیں۔ البرٹ اپنے کمرہ میں چلا گیا اور شارلٹ تنہا رہ گئی۔

اس شخص کی موجودگی نے جس سے وہ محبت کرتی اور جس کی وہ عزت کرتی چلی آئی ہے آج اُس کے دل میں کچھ عجیب اثر پیدا کیا مگر اسکی فیاضی اُسکی مہربانی اور اُسکی محبت کی یاد سے اسکے براہِ نیغمتہ جذبات میں کچھ سکون پیدا ہوا اور ایک مخفی قوت نے اُسکو البرٹ کے پاس جانے کا راستہ بتایا۔ وہ جو کام کر رہی تھی اُس کو اٹھا البرٹ کے کمرہ میں اپنے پرانے طریقہ کے مطابق گئی۔ البرٹ وہاں اپنے خطوں کے کھولنے اور دیکھنے میں مشغول تھا معلوم ہوتا تھا کہ بعض خطوط کے مضامین تکلیف دہ ہیں چنانچہ شارلٹ نے اسکی سمیت دیکھ کر کچھ سوالات بھی کئے جس کا البرٹ نے مختصر سا جواب دیا اور لکھنے بیٹھ گیا اس طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔ شارلٹ کی طبیعت میں افسردگی برابر بڑھتی گئی کیونکہ وہ اپنے شوہر سے کسی حال میں بھی اپنے دل کے اندر وہ وعظ و کٹاہر نہیں کر سکتی تھی۔ جتنا ہی وہ اپنے درد کی داستان کو چھپانے اور اپنے آنسوؤں کی روانی کو روکنے کی کوشش کرتی اتنا ہی اسکی طبیعت کا اضمحلال بڑھتا جاتا۔ اتنے میں درخت کے نوکر کی آمد سے تو اسکا ادھر بھی برا حال ہو گیا۔ نوکر نے البرٹ کو ایک تحریر دی جس کو اُس نے نہایت سرد مہری کے ساتھ اپنے بیوی کو دیدی اور کہا کہ نوکر کو پستول دیدو۔ پھر نوکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ خدا کرے انکا سفر خوب کئے۔ یہ الفاظ شارلٹ کے دل پہ بجلی کی طرح گرے۔ وہ اپنی جگہ سے بڑھ کر اسکی حالت میں اس طرح اٹھی کہ اسکو اسکا مطلق علم نہیں ہوا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ وہ بے اختیار دیوار کی طرف گئی اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے پستول اٹھایا اور آہستہ سے گردلوں بھیجی۔ اس کام میں شاید وہ کچھ دیر لگاتی لیکن البرٹ کی ایک تیز نظر نے جلدی کی درخواست کی۔ اُس نے وہ مہلک ہتھیار بغیر کچھ کہے ہوئے اس

کے حوالہ کر دیا۔ جیسے ہی کہ نوکر روانہ ہوا اُس نے اپنا کام نہ کیا اور فوراً اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ اس کے دل میں اس وقت نہایت مہیب خطرات کے پیش آنے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی سانحہ عظیم کی خطرہ تھی ایک دفعہ تو وہ اپنے شوہر کے پاس جانے اور اپنے کو اس کے قدموں پر گر کر دینے کے بعد گزشتہ شام کے واقعات کو الف سے لیکری تک دہرانے پر تیار ہو گئی تاکہ اپنے قصور کا اعتراف اور اپنے خطرات کا اظہار کرے پھر اُس کے دل میں خیال آیا کہ نہیں، نہیں، ایسا فعل بالکل بیکار ہو گا کیونکہ میں البرٹ کو درخت سے جا کر ملنے پر راضی نہیں کر سکتی۔ کھانے کے بعد ایک دوست سے جو محض گفتگو کی خاطر روک لٹکے تھے رہتا گفتگو ہوتی رہی۔ تمام گفتگو مجبوراً صرف اس لئے جاری رکھی گئی کہ صبح کے واقعات، باغ سے محو ہو جائیں۔ جب نوکر درخت کے پاس پستول لایا تو درخت اس کو دیکھ کر اور یہ سن کر کہ خود شارلٹ نے اس کو اپنے ہاتھ سے دیا ہے، باغ باغ ہو گیا۔ اُس نے روٹی کھائی اور مقوڑی سی شراب پی اور اپنے نوکر کو کھانا کھانے کے لئے بھیجنے کے بعد حسب ذیل تحریر لکھنے بیٹھ گیا۔

”پستول تمہارے ہاتھ میں رہ چکا ہے۔ تم نے اسکی گرد جھاڑی ہے میں اس پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار بوسہ شوق دیتا ہوں کیونکہ تم نے اُس کو اپنے ہاتھوں سے چھو یا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قسمت میری رہبری کر رہی ہے اس لئے کہ تم نے مجھے یہ ہلک ہتھیار دیا ہے۔ میری تمنا تھی کہ تمہارے ہاتھ سے قتل ہوتا اور لو آج میری یہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ میں نے نوکر سے پوچھا وہ کہتا ہے کہ تم جس وقت پستول دے رہی تھیں اُس وقت تم کانپ رہی تھیں مگر تم نے مجھے کوئی آخری سلام نہیں کہلوا یا۔ آف میں کتنا بد قسمت اور بد بخت ہوں کہ تم نے سلام تک نہیں کہلوا یا۔ معلوم نہیں تم نے ایسے وقت ایسے شخص کے لئے جس نے تم کو ہمیشہ کے لئے اپنا کر لیا ہے، کیوں ایک لفظ نہیں گوارا کیا؟ ارے شارلٹ! صدیاں گزر جائیں گی مگر یہ نقش مٹا سے نہ ملے گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم ہرگز اُس شخص سے نفرت نہیں کر سکتیں جو تمہیں اپنی جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتا ہے“

کھانے کے بعد اُس نے نوکر کو بلا یا اور اُس سے سامان باندھنے کو کہا۔ چند کاغذات جلا ڈالے اور پھر کچھ قرض وغیرہ ادا کرنے باہر گیا اور پھر جلد ہی واپس آکر دوبارہ باوجود بارش کے چلا گیا اور کالے باغ میں کچھ دیر تک ٹھنکتا رہا اور پھر کچھ دیر تک بیات کی سیر کو بھی گیا شام کو گھر لوٹ کر آیا تو پھر یہ تحریر لکھنی شروع کر دی۔

”ولہلم میں نے آج آخری بار ان پہاڑوں جنگلوں اور آسمانوں پر نظر ڈالی ہے۔ الوداع اور اے میری پیاری ماں! مجھے معاف کر۔ ولہلم ذرا اسکو تسلی دیا کہ خدا تمہیں برکت دے میں نے اپنے تمام معاملات طے کر لئے ہیں۔ اچھا الوداع۔ ہم لوگ پھر کبھی ملیں گے اور تب مسرور و شادماں ہوں گے۔“

”البرٹ صاحب میں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے آپ کے خاندان کے سکون و راحت میں خلل ڈالا ہے اور آپ دونوں میں نا اتفاقی کا بیج بویا ہے۔ الوداع۔ گھبراہٹ نہیں میں خود اس بد بختی کو ختم کر رہا ہوں۔ خدا کرے میری موت سے آپ کو راحت ملے۔ اگر آپ اس فرشتہ خصلت عورت کو خوش رکھیں گے تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو اپنے سایہ عاطفت میں رکھے۔“

شام کے بقیہ اوقات میں وہ اپنے کاغذات درست کرتا رہا۔ بہتوں کو تو اُس نے پھاڑا اور جلایا اور بہتوں پر اُس نے مہر کی اور ولہلم کا پتہ لکھا۔ ان میں اُس کے چند پریشان خیالات کا مجموعہ درج تھے۔ بعضوں کو میں نے پڑھا بھی ہے۔ دس بجے اُس نے آگ جلانے اور ایک بوتل شراب لانے کا حکم دیا۔ پھر اُس نے نوکر کو رخصت کر دیا۔ نوکر کا کمرہ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کا کمرہ مکان کے دوسری طرف والے حصہ میں تھا۔ نوکر بغیر کپڑا اتارے جا کر لیٹ گیا تاکہ صبح کو سفر کے لئے چلنے میں جلدی ہو کیونکہ اُس کے مالک نے کہہ دیا تھا کہ ڈاک کے گھوڑے صبح کو چوبیس بجے سے پہلے آجائیں گے۔

”اے بچے چلے ہیں۔ ہر طرف سناٹا اور میری روح میں سکون ہے۔ خدا یا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج تو نے میرے آخری لمحات زندگی میں مجھے ہمت و استقلال عطا کیا۔ میرے عزیز دوستوں میں کھڑکی کے پاس جا کر اُن بادلوں کے درمیان جنکو ہوا کے تیز جھونکے اڑا رہے ہیں اُن تناظر کو دیکھ رہا ہوں جو اُس نیلی چھت پر چمک رہے ہیں۔ نہیں اے آسمانی ستارو! تم اس چھت سے نہیں گرو گے کیونکہ خدا سے کار ساز کا ہاتھ تم کو اور محکو دونوں کو اپنی جگہ پر سنبھالے ہوئے ہے میں نے آخری بار ساتوں ستاروں کے جھرمٹ کو بھی دیکھا جو میرے بہت محبوب ستارے ہیں کیونکہ اے شاعر طہا جب میں رات کے وقت تم سے رخصت ہو کر تمہارے دروازہ کے باہر قدم نکالتا تھا تو یہ سن کر

برابر میرے سر پر چکتے تھے۔ میں نے اس وقت کتنی بار عالم شوق میں ان بتوں کو دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر ان سے اپنی مسرتوں کو دیکھنے کی التجا کی ہے اور اب بھی۔ لیکن شارلٹ بتاؤ آخر وہ کونسی چیز ہے اسجو تمہاری صورت میری نگہوں کے سامنے آنے سے باز رکھتی ہے؟ کیا تم میرے دل میں نہیں سائی ہو؟ در کیا میں نے بچوں کی طرح ہر اس معمولی چیز کو عزیز ترین سمجھ کر جمع نہیں کیا جس کو تم نے اپنے دست نازنین سے چھو یا ہے۔ تمہارے رخ کی یکطرفہ تقویٰ جو مجھے بہت عزیز تھی آج تمہیں واپس کرتا ہوں اور تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس کو محفوظ رکھنا۔ میں نے عالم شوق میں اس پر ہزاروں بوسے دیئے ہیں اور گھر سے جاتے اور گھر میں آتے وقت اُس نے ہزاروں بار میری روح کو خوش و خرم کیا ہے ”میں نے تمہارے والد صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ میری لاش کو محفوظ طریقہ پر میدان کی طرف قبرستان کے کونے میں دونیبو کے درختوں کے نیچے دفن کروادیں مجھے اُمید ہے کہ تمہارے والد میرے لئے اتنا کام ضرور کر دیں گے۔ تم بھی میری طرف سے درخواست کرنا۔ لیکن عابد و زاہد عیسائی شاید اس کو پسند نہ کریں کہ انکا جسم مجھ جیسے بد نصیب کے قریب دفن ہو۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر مجھے دوسری وادی میں یا کسی شاہراہ کے نزدیک دفن کر دینا تاکہ جو پا درمی اور ان کے ہمنوا میری قبر کے پاس سے گزریں وہ اپنی جان کو دعا دیں اور جو اچھے اور نیک لوگ گزریں وہ میرے اوپر دُعا سنبھالتے جائیں۔ ”شارلٹ ذرا دیکھو کہ میں اس زہر کا پیالہ پینے سے جو مجھے موت کے گھاٹ کے پار اتار دیگا بالکل نہیں گلبراتا۔ یہ تمہارا ہی ہاتھ ہے جو مجھے وہ بیالہ دے رہا ہے مگر دیکھو میں مطلق نہیں جھجھکتا۔ نواب سدا قصہ ختم ہوا جاتا ہے اور میری زندگی کی ساری منتیں اور آرزوئیں آج پوری ہوئی جاتی ہیں یعنی میں اپنے استقلال کے ہاتھ سے موت کے بے پناہ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے جاتا ہوں۔

”کیا اچھا ہوتا کہ میں صرف تم پر جان دینے کی مسرت کا لطف اٹھاتا اور اگر یہ چیز مجھے ملتی تو میں خوشی سے اپنے کو تم پر تصدق کر دیتا۔ پھر اگر میں تمہارے بے قرار سینہ میں سکون اور مسرت پیدا کر سکتا تو میں بڑے استقلال اور خوشی کے ساتھ اپنی موت سے دو چار ہوتا لیکن یہ قسمت صرف چند مخصوص لوگوں کی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں اور اپنی موت سے اپنے دوستوں کی زندگی میں شادمانی و مسرت کا ہزر گونہ اضافہ کرتے ہیں۔ شارلٹ! میری تمنا ہے کہ میں جو کپڑا پہنے ہوئے ہوں اسی میں دفن کیا جاؤں۔

کیونکہ تم نے اس کو چھو کر میرے لئے کتنا متبرک بنا دیا ہے میں نے یہی خواہش تمہارے والد صاحب سے بھی کی ہے۔ میری روح میرے مزار پر گشت لگا رہی ہے۔ ہاں دیکھنا میرے جیہوں کی تلاشی نہ لیجائے۔ وہ لال فیتہ جو تم اس روز اپنے سینہ پر لگائے ہوئے تھیں جب میں تم سے پہلے پہل ملا تھا اور تم بچوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں! بچوں کو میری طرف سے بہت پیار کرنا اور ان سے میرا حال زار بیان کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں ان بچوں کو اپنے چاروں طرف کھیلنے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ کتنے پیارے بچے ہیں! شارلٹ میں تمہارا کتنا گرویدہ تھا۔ اول ہی ملاقات کے بعد سے میرا تم سے علاحدہ ہونا میری روح کیلئے گویا ایک عذاب ہو گیا تھا وہ فیتہ جسکو تم نے میری سالگرہ کی تقریب پر مجھے تحفہ بھیجا تھا، میرے ساتھ دفن ہونا چاہئے۔ آج اس وقت یہ تمام چیزیں کتنی آشفتہ و پریشان معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت مجھے اسکا ذرا سا بھی خیال نہ تھا کہ مجھے اس میدان میں بھی قدم رکھنا ہوگا لیکن میں اپنے اور تمہارے دونوں کے لئے سکون کی دعا کرتا ہوں۔

”پستول بھرا ہوا ہے۔ گھڑی میں ٹھیک ۱۲ بجے ہیں۔ آمین۔ شارلٹ! شارلٹ!! الوداع! الوداع!!“ ایک ڈوسمی نے کچھ چپک دیکھی اور پستول چھوٹنے کی آواز بھی سنی لیکن چونکہ ہر طرف سناٹا تھا اس لئے اسکو کچھ خیال نہیں ہوا۔

صبح کو چھ بجے جب لوکر درتھر کے کمرہ میں شمع لیکر گیا تو اُس نے اپنے آقا کو فرش زمین پر خون میں آلودہ پایا۔ پستول اس کے پاس پڑا تھا۔ لوکر نے درتھر کو پکارا اور اس کو اپنے بازو کے سہارے اٹھایا بھی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گرمی جیات ابھی باقی تھی اور وہ دم توڑ رہا تھا۔ لوکر فوراً ڈاکٹر کیلئے دڑا ہوا گیا اور پھر البرٹ کو بھی بلائے گیا۔ شارلٹ نے گر جا میں گھسنے کی آواز سنی اور سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے سانپ ڈس گیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو جگایا اور پھر دونوں اٹھ بیٹھے۔ اتنے میں لوکر روتا ہوا آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں اُس نے اس دلریش واقعہ کی اطلاع دی۔ شارلٹ یہ ہوش ہو کر البرٹ کے قدموں پر گر پڑی۔

جب ڈاکٹر درتھر کے پاس آیا تو وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی نبض جل رہی تھی لیکن اس کے اعضا سر ہڑکے تھے۔ گولی داہنی آنکھ کے اوپر سے پیشانی کو توڑ کر کھو پڑی میں گھس گئی تھی۔ داہنے بازو میں فوراً ایک فصد کھولی گئی اور کچھ خون بھی نکلا۔ درتھر اب تک سانس لے رہا تھا۔ کرسی پر سے جو خون بہا تھا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ لہ موت کی خبر ہو کر جا میں گھسنے لگ جائے جاتے ہیں۔

اُس نے یہ نازیبا حرکت کرسی پر بیٹھ کر کی ہے اور بعد کو فرش پر لڑکھڑا کر گر پڑا ہے۔ اسکو لوگوں نے کھڑکی کے پاس چت لیٹا ہوا پایا۔ وہ پوری پوشاک پہنے تھا۔

یہ خبر فوراً مکان میں پڑوس میں اور سارے قصبہ میں تیزی سے پھیل گئی اور پھیلنے ہی تمام کہرام مچ گیا۔ البرٹ بھی آگیا۔ درخت کو فرش سے اٹھا کر چارپائی پر لٹا چکے تھے۔ اسکا سر بندھا تھا اور موت کی زروی اُسکے چہرہ پر آگئی تھی۔ اس کے اعصاب بے حس و حرکت ہو گئے تھے لیکن سانس کبھی تیز اور کبھی سست آتی جاتی تھی ہر لمحہ موت کا انتظار تھا۔ رات کو اس نے صرف شراب کا ایک گلاس پیا تھا۔ ایمیل اگیلوٹی اُس کی میز پر کھلی پڑی تھی۔

میں اب البرٹ کی پریشانی اور شارلٹ کے غم کا کچھ بھی ذکر نہ کرونگا۔

یہ خبر سننے ہی بڑھا کارندہ فوراً مکان پر آیا اور نہایت رنج و الم کی حالت میں رو کر اپنے مرنے والے عزیز دوست سے ہم آغوش ہوا۔ اسکا بڑا لڑکا اس کے بعد فوراً آگیا۔ دونوں نہایت غم و الم کی حالت میں اُسکی چارپائی کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے ہاتھوں کو اور چہرہ کو دوسے دینے لگے سب سے بڑا لڑکا جو درخت کا بڑا دوست تھا برابر اس وقت تک اُس کے منہ کے پاس اپنا منہ کئے ہوئے بیٹھا رہا جب تک کہ اسکی روح نے جسم کو نہیں چھوڑا۔ درخت کے مرنے کے بعد بھی اسکی بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹایا گیا۔ ۱۲ بجے درخت کی روح نے اس نفس عنصری کو چھوڑ دیا۔ بڑھے کارندہ کی موجودگی اور دیگر احتیاط کی وجہ سے کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں ہوا۔

۱۱ بجے رات کو اُس نے درخت کی لاش اُسی جگہ دفن کرا دی جہاں اُس نے خواہش ظاہر کی تھی۔

وہ بڑھا کارندہ اولس کے لڑکے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ البرٹ ساتھ نہ جاسکا شارلٹ کی زندگی بھی اب تب ہو رہی تھی۔ جنازہ مزدوروں نے قبرستان تک پہنچا دیا۔ کوئی پادری ساتھ نہیں تھا۔

باہتمام (حافظ) محمد سلیم سیپریس نمبر ۳۹ سیمپلی پور الہ آباد میں چھپی

